جلد ہفتم

مع ترجمہ وتشریح

مرتّبہ

محمد فاروق خاں

ترتیب

دیباچہ ۷

رذائلِ اخلاق ۱۱

عدمِ بصیرت ۱۲

✪ بے حسی	۱۲	✪ مغالطہ دینا	۲۶
✪ وہمی مزاج	۱۳	✪ مبالغہ آرائی	۲۷
✪ ریا	۱۴	✪ جھوٹ	۲۸
✪ نفاق	۲۰	✪ گم راہی	۳۵
✪ قول وعمل میں تضاد	۲۵	✪ گناہ	۳۶

بدذوقی ۳۸

✪ کبر	۳۸	✪ نفس پرستی	۴۹
✪ عجب وخود پسندی	۴۲	✪ حرص وطمع	۵۱
✪ شہرت کی طلب	۴۴	✪ حبِ دنیا	۵۸
✪ تصنّع	۴۷	✪ عیش کوشی	۶۴
✪ خودغرضی	۴۸	✪ بے حیائی	۶۶

ذلّت و پستی ۶۷

- خستِ نفس ۶۷
- تنگ ظرفی و تنگ دلی ۶۷
- بے غیرتی ۷۰
- احسان فراموشی ۷۰
- بخل ۷۲
- غصّہ ۷۶
- شدّت پسندی و درشت مزاجی ۸۱
- سخت دلی ۸۲
- عداوت ۸۴
- بزدلی ۸۶
- پست ہمّتی ۸۷
- مداہنت ۸۷
- مرعوبیت ۸۸
- عصبیت ۸۹
- لعنت و ملامت ۸۹
- کردار کی خرابی ۹۰

اجتماعی مفاسد ۹۳

عدم بصیرت

- نفاق ۹۳
- خود غرضی ۹۶
- غیر ذمّہ دارانہ طرزِ عمل ۹۷
- دورُخا پن ۹۷

بد ذوقی ۹۹

- بدگمانی ۹۹
- تجسّس ۱۰۲
- عیب جوئی اور عار دلانا ۱۰۴
- غیبت ۱۰۶
- چغلی ۱۱۱
- کینہ ۱۱۳
- شماتت ۱۱۵
- حسد ۱۱۵
- الزام تراشی ۱۱۷
- خیانت ۱۱۸
- غصب ۱۲۱
- زبان کی بے احتیاطی ۱۲۳
- فساد ڈالنا ۱۲۵
- قطع رحمی ۱۲۶
- علم کی ناقدری ۱۲۷
- لسّانی و بیان آرائی ۱۲۸
- بے جا تعریف ۱۳۰
- عہد شکنی اور وعدہ خلافی ۱۳۲
- جھوٹی قسم ۱۳۳

○ جھوٹی شہادت	۱۳۵	○ تحقیق کے بغیر بات پھیلانی	۱۴۶
○ مجرم کی سفارش	۱۳۶	○ بدنگاہی	۱۴۶
○ قتل	۱۳۸	○ رشوت	۱۴۷
○ چوری	۱۴۲	○ حق تلفی	۱۴۸
○ کسی کی نقل اُتارنا	۱۴۵	○ چیرہ دستی	۱۴۹

گراوٹ اور پستی ۱۵۱

○ عصبیت	۱۵۱	○ اذیّت وضرر رسانی	۱۶۳
○ بے حیائی	۱۵۳	○ لعنت وملامت	۱۶۵
○ جاہلیت کی دعوت	۱۵۴	○ بدکلامی	۱۶۹
○ بدعہدی وفریب کاری	۱۵۵	○ ترکِ ملاقات	۱۷۲
○ تضحیک وتمسخر	۱۵۸	○ جھگڑالو ذہنیت	۱۷۳
○ تحقیر	۱۵۹	○ فساد	۱۷۷
○ آبروریزی	۱۶۱		

خلقِ عظیم ۱۷۹

آپ ﷺ ۱۸۱

○ جاذبیت	۱۸۱	○ آرزو	۱۸۸
○ آواز اور اندازِ تکلّم	۱۸۲	○ فضول باتوں سے پرہیز	۱۸۸
○ تبسم	۱۸۶	○ آپؐ کا اخلاق	۱۸۹
○ خاموشی	۱۸۷	○ ادراک ونظر	۱۹۰
○ ورع	۱۸۷	○ ذوق	۱۹۷

اوصافِ حمیدہ ۱۹۹

- بشریت کا احساس ۱۹۹
- عجز و نیاز ۲۰۰
- خوفِ خدا ۲۰۴
- جذبۂ شکر ۲۰۸
- صبر ۲۰۸
- سادگی ۲۱۰
- گناہوں سے بچنا ۲۱۱
- فضول باتوں سے اجتناب ۲۱۲
- صدق وصفا ۲۱۳
- حیا ۲۱۴
- فیاضی ۲۱۴
- شفقت ۲۱۷
- نبیِ رحمت ۲۱۹
- ترحم ۲۱۹
- خوش مزاجی ۲۲۱
- دل داری ۲۲۴

عظمت و وقار ۲۲۶

- استقامت ۲۲۶
- شانِ عفو ۲۲۶
- تحمل ۲۲۸
- توکل ۲۳۰
- مروّت ۲۳۱
- شجاعت ۲۳۱
- غیرت ۲۳۴
- فراخ دلی ۲۳۵
- تواضع وانکسار ۲۳۷

آپؐ کیسے تھے؟ ۲۴۰

- گھر والوں کے ساتھ ۲۴۰
- اپنے لوگوں اور رفقاء کے ساتھ ۲۴۳
- کسی غریب کے ساتھ ۲۴۷
- بچوں کے ساتھ ۲۴۸
- معاملات میں ۲۵۲
- جانوروں کے ساتھ ۲۵۴
- آپؐ کی ایک آرزو ۲۵۶

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

قارئین کی خدمت میں کلام نبوت کی ترتیبِ نو کے مطابق جلد ہفتم پیش کرتے ہوئے بے حد مسرت کا احساس ہو رہا ہے۔ یہ جلد دراصل جلد ششم کا تکملہ ہے۔ (ان دونوں جلدوں کے مشتملات اب تک جلد دوم کی صورت میں شائع ہوتے رہے ہیں) جلد ششم میں اخلاق اور اس کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے مکارمِ اخلاق سے متعلق احادیث کا انتخاب پیش کیا گیا ہے۔ اس جلد میں اخلاق ذمیمہ کے سلسلہ کی احادیث پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس لیے کہ اخلاق حسنہ کے ساتھ رذائل اخلاق سے واقف ہونا بھی ضروری ہے۔

کلام نبوت کی ان دونوں جلدوں (ششم اور ہفتم) کے مطالعہ سے اسلامی اخلاقیات کی قدر و قیمت کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

نبی کریم ﷺ کی زندگی ہمارے لیے اسوۂ حسنہ ہے۔ کتاب کے آخر میں آپؐ کے خُلق عظیم سے متعلق احادیث پیش کی گئی ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس نے جس طرح اس خدمت کی توفیق بخشی اسی طرح وہ اسے شرفِ قبولیت عطا فرمائے اور قارئین کرام اس سے زیادہ سے زیادہ مستفید ہو سکیں۔

خاکسار

محمد فاروق خاں

۱۱ر جنوری ۲۰۱۲ء

رذائلِ اخلاق

رذائلِ اخلاق

انسان کا اصل وجود اخلاقی ہے۔ اسی وجہ سے اسے دیگر حیوانات کے مقابلہ میں خاص شرف وامتیاز حاصل ہے۔ لیکن جب کوئی شخص اپنی اخلاقی ذمہ داریوں کو فراموش کر دیتا ہے تو نہیں کہا جا سکتا کہ وہ پستی کی کس انتہا کو پہنچ کر رہے گا۔ ہمارے لیے اخلاقی محاسن سے واقف ہونا ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ واضح طور پر ہمیں جاننا چاہیے کہ وہ اخلاقی برائیاں کیا ہیں جن سے اجتناب ہمارے لیے ضروری ہے۔ اخلاقی خرابیاں حقیقت میں انسان کے دامن پر وہ بدنما داغ ہیں جو اس کی ساری ہی خوبیوں کو خاک میں ملا کر رہتی ہیں۔ چناں چہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: **اِیَّاکُمْ وَالْحَسَدُ فَاِنَّ الْحَسَدَ یَاکُلُ الْحَسَنَاتِ کَمَا تَاکُلُ النَّارُ الْحَطَبَ اَوْ قَالَ الْعَشَبَ۔** (ابوداؤد)

"حسد سے بچو کیوں کہ حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے۔"

یا فرمایا: "گھاس کو کھا لیتی ہے۔"

ہم ان احادیث کو پیش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جن سے ہمیں بالتفصیل ان برائیوں اور ناپسندیدہ امور سے واقفیت حاصل ہوتی ہے جن کی موجودگی میں حُسنِ اخلاق کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

اخلاق حسنہ کی طرح اخلاق ذمیمہ کا تعلق بھی صرف کسی فرد سے ہی نہیں بلکہ اجتماعی مفاسد سے بھی ان کا گہرا تعلق ہوتا ہے۔ رذائل اخلاق سے آدمی کی شخصیت مجروح ہو کر رہ جاتی ہے جب کہ آدمی کا کردار اس کی شخصیت ہی اس کا اصل سرمایۂ وجود ہوتا ہے۔

عدمِ بصیرت

بے حسی

﴿۱﴾ عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ مِمَّا اَدْرَکَ النَّاسُ مِنْ کَلَامِ النُّبُوَّةِ الْاُوْلٰی: اِذَا لَمْ تَسْتَحِیْ فَاصْنَعْ مَا شِئْتَ۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''سابقہ نبوّت کے کلام میں سے جو بات لوگوں نے پائی ہے وہ یہ ہے کہ جب تو نے شرم وحیا کو اٹھا کر رکھ دیا تو اب جو چاہے کر۔''

تشریح: یعنی انبیائے سابقین کے ارشادات میں سے جو بات لوگوں تک پہنچی ہے اور جس میں کوئی تغیر وتبدّل نہیں ہوسکا ہے اور جو آج کے دور میں بھی اتنی ہی سچی اور کھری ہے جتنی کبھی پہلے تھی۔ اور وہ ہے یہ کہ تجھ پر جب اس قدر بے حسی چھا گئی ہے کہ تو نے شرم وحیا کو بالائے طاق رکھ دیا اور بے شرمی اختیار کرلی تو پھر شرم ناک سے شرم ناک حرکتیں کرنے سے تجھے کیا باک ہوسکتا ہے۔ برے کاموں سے آدمی حیا اور شرم کی وجہ سے بھی باز رہتا ہے۔ جب حیا ہی نہ رہی تو پھر تو جو بھی شرم ناک حرکتیں کرے، اہلِ نظر کے لیے اس میں حیرت وتعجب کی کوئی بات نہ ہوگی۔ لیکن تیری آزادی بالآخر تجھے لے ڈوبے گی اور تو خدا کی گرفت سے ہرگز نہ بچ سکے گا۔

یہ حدیث بتاتی ہے کہ انبیائے سابقین نے بھی جذبۂ حیا کو اہمیت دی ہے۔ کیوں کہ حیا برائی کی راہ میں مانع ہوتی ہے۔ حیا وشرم کے اٹھ جانے کے بعد آدمی سے شریفانہ رویہ کی توقع باقی نہیں رہتی۔ اگر حیا دامن گیر نہ ہو تو یہ نہیں کہا جاسکتا کہ کوئی شخص رذائل اور کمینگی کی کس انتہا پر پہنچ کر رہے گا۔

﴿۲﴾ وَ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَّمْ يُوَقِّرِ الْكَبِيْرَ وَ يَرْحَمِ الصَّغِيْرَ وَ يَأْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔ (احمد، ترمذی)

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''وہ شخص ہم میں سے نہیں ہے جو بڑے کی توقیر و تعظیم اور چھوٹے پر رحم نہ کرے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض ادا نہ کرے۔''

تشریح: اپنے بڑوں کا احترام اور اپنے چھوٹوں پر رحمت و شفقت ایک فطری چیز ہے اسی طرح عام لوگوں کو نیکی اور بھلائی کی تلقین کرنا اور انھیں برائیوں کی طرف نہ جانے دینے کی کوشش بھی بالکل ایک فطری بات ہے۔ اب جو اس قدر مردہ ہو چکا ہو اور اس کی فطرت اس قدر مسخ ہو چکی ہو کہ نہ تو اس کے دل میں اپنے بڑوں کے لیے احترام کا کوئی جذبہ باقی ہو اور نہ اس کا رویہ اپنے چھوٹوں کے ساتھ مشفقانہ ہو اور نہ ہی اسے لوگوں کی بھلائی اور برائی کی کوئی فکر ہو، ظاہر ہے ایسے شخص کو دین اور اہلِ دین سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ اہلِ حق تو اصل میں وہ لوگ ہوتے ہیں جن کی روح زندہ ہوتی ہے۔ جو اپنی ذمہ دارانہ حیثیت کو بہ خوبی سمجھتے ہیں۔ دین بھی اس کے سوا اور کیا ہے کہ وہ ہماری بے حسی کو ختم کر کے ہمیں، خدا، مخلوق خدا اور خود ہماری اپنی ذات کے حقوق سے آگاہ کرتا ہے اور ہم سے مطالبہ کرتا ہے کہ ہم ان حقوق کو ادا کرنے کی کوشش کریں۔

وہمی مزاج

﴿۱﴾ عَنْ اَبِیْ قِلَابَةَ قَالَ: قَالَ اَبُوْ مَسْعُوْدٍ لِاَبِیْ عَبْدِ اللّٰهِ اَوْ قَالَ اَبُوْ عَبْدِ اللّٰهِ لِاَبِیْ مَسْعُوْدٍ: مَا سَمِعْتَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ فِیْ زَعَمُوْا؟ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: بِئْسَ مَطِيَّةُ الرَّجُلِ زَعَمُوْا۔ (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت ابو قلابہؒ سے روایت ہے کہ ابو مسعودؓ نے ابو عبداللہؓ سے یا ابو عبداللہؓ نے ابو مسعودؓ سے کہا کہ تم نے رسول اللہ ﷺ سے زعمو کے بارے میں کیا سنا ہے؟ انھوں نے کہا کہ میں نے رسولِ خدا ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: ''زعمو، آدمی کا بہت برا تکیۂ کلام ہے جسے وہ اپنی بات کو چلتی کرنے کا ذریعہ بناتا ہے۔''

تشریح: زَعَمُوْا کا مطلب ہوتا ہے: لوگوں نے کہا ہے۔ لوگوں کا کہنا ہے۔ لوگوں کا گمان

ہے۔لغت میں ''زعم'' کہنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔لیکن زعم اورقول میں فرق ہے۔لفظ زعم ایسے مواقع پر استعمال کرتے ہیں جہاں بات کی صحت پر پورا اعتماد حاصل نہ ہو۔بل کہ اس میں غلطی کا امکان پایا جاتا ہو۔حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) لفظ زَعَمُوْا (لوگ کہتے ہیں) کو برا تکیہ کلام قرار دیتے ہیں۔آدمی کو بات وہ کہنی چاہیے جو یقینی ہو۔بلا وجہ غیر یقینی اور غیر معتبر چیز کو شہرت دینا معاشرہ میں کسی فتنہ کا سبب بن سکتا ہے۔اس سے وہمی مزاج کو تقویت ملتی ہے۔ذہن کو ہمیشہ صاف رکھنا چاہیے۔غلط قسم کے رجحانات اور وہم وگمان کو ہرگز پیدا نہیں ہونے دینا چاہیے۔جس بات کے صحیح اور معتبر ہونے میں شبہ ہو، اس کے کہنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ پھر زعم کی نسبت کسی کی طرف کرنے سے اس شخص کی اس طرح سے تکذیب بھی ہوتی ہے۔

ابن قتیبہ نے ''مختلف الحدیث'' میں اور امام طحاوی نے ''مشکل الآثار'' میں اس حدیث پر مفصل بحث کی ہے۔اس بحث کا حاصل یہ ہے کہ جب تک کسی بات کا پورا یقین حاصل نہ ہوجائے، اس کی اشاعت صحیح نہیں۔ دروغ گوئی سے بچنے کے لیے اسے لوگوں کی طرف منسوب کرکے بیان کرنا کافی نہیں۔

اس حدیث میں ابوعبداللہؓ سے مراد حضرت حذیفہ ہیں۔

ریا

〈۱〉 عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَؓ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم یَقُوْلُ: قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی: اَنَا اَغْنَی الشُّرَکَآءِ عَنِ الشِّرْکِ۔ مَنْ عَمِلَ عَمَلاً اَشْرَکَ فِیْهِ مَعِیَ غَیْرِیْ تَرَکْتُهٗ وَ شِرْکَهٗ وَ فِیْ رِوَایَةٍ فَأَنَا بَرِیْءٌ، هُوَ لِلَّذِیْ عَمِلَهٗ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''میں تمام شرکاء میں سب سے بڑھ کر شرکت سے بے نیاز ہوں۔ جو شخص کوئی عمل کرتا ہے اور اس میں میرے ساتھ میرے کسی غیر کو شریک کرتا ہے تو میں اس کو اس کے شریک کے ساتھ چھوڑ دیتا ہوں۔'' ایک روایت میں ہے: ''میں اس سے بے زار ہوں۔ وہ اسی کے لیے ہے جس کے لیے اس نے کیا۔''

تشریح: مطلب یہ ہے کہ دوسرے تو چار و ناچار شرکت کو منظور کر لیتے ہیں لیکن مجھے کسی غیر کی

ادنیٰ شرکت بھی گوارا نہیں ہوسکتی۔ ایک شخص اگر کوئی نیک عمل کرتا ہے اور اس سے اس کی غرض میری رضا کے علاوہ کچھ اور بھی ہے، وہ اس کے ذریعہ سے دوسروں کی رضا اور خوش نودی بھی چاہتا ہے تو میرا اس سے اور اس کے اس شرک آمیز عمل سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

یعنی وہ عمل میرے لیے نہیں ہے۔ میرے یہاں وہی اور صرف وہی عمل شرفِ قبولیت حاصل کرتا ہے جو میری رضا اور خوش نودی کے حصول کے لیے کیا گیا ہو۔ میں شرکت کے عمل سے بالکل بے زار ہوں۔ وہ شخص اپنے ایسے عمل سے غیر اللہ کی خوش نودی حاصل کرنے میں بھلے ہی کام یاب ہوجائے، اسے میری خوش نودی حاصل نہ ہوگی۔ میری غیرت اور بے نیازی شرک آمیز چیز کو کبھی قبول نہیں کرسکتی۔

﴿۲﴾ وَ عَنْ شَدَّادِ بْنِ اَوْسٍؓ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: مَنْ صَلّٰى يُرَآئِىْ فَقَدْ اَشْرَكَ وَ مَنْ صَامَ يُرَآئِىْ فَقَدْ اَشْرَكَ وَ مَنْ تَصَدَّقَ يُرَآئِىْ فَقَدْ اَشْرَكَ۔ (احمد)

ترجمہ: حضرت شداد بن اوسؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: ”جس کسی نے دکھاوے کی نماز پڑھی اس نے شرک کیا، جس نے دکھاوے کے لیے روزہ رکھا اس نے شرک کیا۔ اور جس کسی نے دکھاوے کی غرض سے صدقہ کیا اس نے شرک کیا۔“

تشریح: نماز، روزہ اور صدقہ کا ذکر بہ طور مثال کیا گیا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ جو نیک عمل بھی ریا کے ساتھ کیا جائے گا حقیقت میں وہ ایک طرح کا شرک قرار پائے گا۔ اس لیے کہ جو عمل اسے محض خدا پرستی اور اطاعت رب کے جذبہ سے کرنا چاہیے تھا اس کے کرنے میں دوسرے غلط قسم کے جذبات بھی شامل ہوگئے۔ اگرچہ یہ شرک وہ شرک جلی نہیں ہے جس کے ارتکاب سے آدمی دائمی طور پر عذاب جہنم کا مستحق ہوجاتا ہے۔ لیکن شرک و نفاق کے مشابہ جو چیز بھی ہوگی اسے اختیار کرنے سے آدمی مقام بلند سے نیچے گر جاتا ہے۔ خدا کی شانِ عظمت و محبوبیت اس پر آشکارا نہیں ہوتی، اس سے پردہ کرنے لگ جاتی ہے۔ اور انسان کی زندگی اعلیٰ قسم کی کیفیات سے محروم ہوکر رہ جاتی ہے۔ انسان کا عجز حسن سے عاری ہے اگر وہ خدا کی عظمت کو آشکارا نہ دیکھے۔ اس کے دل کے بہترین جذبات بے معنی ہوکر رہ جاتے ہیں اگر نگاہِ دل میں خدا کی محبوبیت بسی ہوئی نہ ہو۔ ہر وہ چیز جو ہمیں خدا سے غافل کرے ہمارے لیے بت کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی لیے کہا بھی گیا ہے:

کُلُّ مَا صَدَّکَ عَنِ اللّٰہِ فَھُوَ صَنَمُکَ ''ہر وہ چیز جو تجھے خدا سے روکے وہ تیرا صنم ہے۔''

﴿۳﴾ وَ عَنْ مَحْمُوْدِ بْنِ لُبَیْدٍ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ قَالَ: اِنَّ اَخْوَفَ مَآ اَخَافُ عَلَیْکُمُ الشِّرْکُ الْاَصْغَرُ۔ قَالُوْا: یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! وَمَا الشِّرْکُ الْاَصْغَرُ؟ قَالَ الرِّیَآءُ۔

(احمد)

ترجمہ: حضرت محمود بن لبیدؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تمھارے بارے میں سب سے زیادہ خوف مجھے شرکِ اصغر کا ہے۔'' لوگوں نے دریافت کیا کہ شرکِ اصغر کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''ریاونمائش۔''

تشریح: معلوم ہوا کہ ریا کوئی معمولی اخلاقی مرض نہیں ہے جس کی طرف سے آدمی بے پرواہ رہے۔ پتھر کے بتوں کی پرستش سے بچنا اور ان بتوں کو بے جان اور بے وقعت سمجھنا بہت آسان بات ہے لیکن آدمی ریاونمائش سے دور رہے، یہ آسان نہیں ہے۔ آدمی بالعموم اپنی نفسیاتی تسکین کے لیے محسوس سہارے تلاش کرتا ہے۔ ریاونمائش اس کے لیے ایک محسوس سہارا ہوتا ہے کہ لوگ اسے اچھا سمجھیں گے۔ اس کی تعریفیں کریں گے اور لوگوں کی نگاہوں میں اس کی عزت بڑھ جائے گی۔ اعمالِ نیک کا محرک محض خدا کی رضا اور اس کی خوش نودی کی طلب ہو تو زندگی دوسرے محرکات اور دیگر نفسیاتی سہاروں سے بے نیاز ہوسکتی ہے لیکن خوش نودیِ رب کی تمنا ہمیں دوسری چیزوں سے بے پروا بنادے یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب کہ صحیح معنی میں ہمیں اپنے رب کی پہچان ہو۔ اور خدا ہمیں اپنی زندگیوں میں شامل و داخل نظر آنے لگے۔ خدا کے حاضر و ناظر ہونے کا یقین ایسا دل پر چھا جائے اور دل میں حضوری کی ایسی کیفیت پیدا ہوجائے جو کبھی زائل نہ ہو۔

﴿۴﴾ وَ عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ ٍالْخُدْرِیِّ قَالَ: خَرَجَ عَلَیْنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ وَ نَحْنُ نَتَذَاکَرُ الْمَسِیْحَ الدَّجَّالَ فَقَالَ: اَلَآ اُخْبِرُکُمْ بِمَا ھُوَ اَخْوَفُ عَلَیْکُمْ عِنْدِیْ مِنَ الْمَسِیْحِ الدَّجَّالِ؟ فَقُلْنَا بَلٰی: یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! قَالَ الشِّرْکُ الْخَفِیُّ اَنْ یَّقُوْمَ الرَّجُلُ یُصَلِّیْ فَیَزِیْدُ صَلٰوتَہٗ لِمَا یَرٰی مِنْ نَّظَرِ رَجُلٍ۔

(ابن ماجہ)

ترجمہ: حضرت ابوسعید خدری روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہمارے پاس باہر تشریف لے آئے۔ اس وقت ہم لوگ آپس میں مسیح دجال کا ذکر کر رہے تھے۔ آپؐ نے فرمایا: ''کیا میں تمھیں اس چیز کی خبر نہ دوں جس کا مجھے تمھارے بارے میں مسیح دجال سے بڑھ کر خوف ہے؟'' ہم

نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ، آپؐ ضرور خبر دیں۔ فرمایا: ''وہ شرک خفی ہے کہ مثلاً ایک شخص نماز کے لیے کھڑا ہو، پھر وہ اپنی نماز اس لیے لمبی کر دے کہ کوئی دوسرا شخص اس کو (نماز پڑھتے) دیکھ رہا ہے۔''

تشریح: یعنی اس کا مجھے زیادہ خوف نہیں ہے کہ دجال کھلے اور واضح شرک کی دعوت لوگوں کو دے گا اور فتنہ بن کر کھڑا ہوگا اس لیے کہ سچے مومنین کبھی بھی شرک جلی میں مبتلا نہیں ہو سکتے۔ البتہ مجھے اس کا اندیشہ زیادہ ہے کہ شیطان کہیں لوگوں کو خفی قسم کے شرک میں مبتلا نہ کر دے۔ جس کی ایک مثال یہ ہے کہ آدمی کسی کو دکھانے کے لیے اپنی نماز لمبی کر دے اور اسے بہتر طریقہ سے ادا کرنے لگے۔ یہ فتنہ ایسا ہے جس کا اندیشہ ہر زمانے میں کیا جا سکتا ہے۔

﴿۵﴾ وَ عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ بْنِ اَبِیْ فُضَالَۃَ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ قَالَ اِذَا جَمَعَ اللّٰہُ النَّاسَ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ لِیَوْمٍ لَّا رَیْبَ فِیْہِ نَادٰی مُنَادٍ مَّنْ کَانَ اَشْرَکَ فِیْ عَمَلٍ عَمِلَہٗ لِلّٰہِ اَحَدًا فَلْیَطْلُبْ ثَوَابَہٗ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰہِ فَاِنَّ اللّٰہَ اَغْنَی الشُّرَکَآءِ عَنِ الشِّرْکِ۔ (احمد)

ترجمہ: حضرت ابوسعید بن ابی فضالہؓ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا: ''اللہ قیامت کے روز، جس کے آنے میں کوئی شبہ نہیں ہے، سب لوگوں کو جمع فرمائے گا تو ایک منادی اعلان کرے گا کہ جس نے اپنے کسی عمل میں جس کو اس نے اللہ کے لیے کیا، کسی اور کو بھی شریک کر لیا تو اسے چاہیے کہ وہ اس کا اجر و ثواب اسی غیر اللہ سے طلب کرے کیوں کہ اللہ تمام شرکاء سے بڑھ کر شرک سے بے نیاز ہے۔''

تشریح: یعنی خدا کے یہاں شرک آمیز عمل کا ہرگز کوئی اجر و ثواب نہ ملے گا۔ خدا تو بس اسی عمل کو قبول کرتا ہے جو صرف اسی کی خوشنودی اور رضا کے لیے کیا گیا ہو۔ قیامت کے روز اعلان کر دیا جائے گا کہ جس کسی کے عمل میں خدا کے علاوہ کچھ دوسروں کی خوشنودی اور رضا طلبی پیش نظر رہی ہو تو وہ ان دوسروں سے ہی اجر کا طالب ہو۔ خدا کے یہاں ایسے عمل کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ یہ اس کی شان سے گری ہوئی بات ہے کہ دوسرے شرکاء کے ساتھ وہ کسی مصالحت (Compromise) پر راضی ہو سکے۔

﴿۶﴾ وَ عَنْ اَبِیْ ہُرَیْرَۃَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: یَخْرُجُ فِیْ اٰخِرِ الزَّمَانِ

رِجَالٌ یَّخْتَلُّوْنَ الدُّنْیَا بِالدِّیْنِ، یَلْبَسُوْنَ لِلنَّاسِ جُلُوْدَ الضَّانِ مِنَ اللِّیْنِ اَلْسِنَتُهُمْ اَحْلٰی مِنَ السُّکْرِ وَ قُلُوْبُهُمْ قُلُوْبُ الذِّیَابِ۔ یَقُوْلُ اللّٰهُ اَبِیْ یَغْتَرُّوْنَ اَمْ عَلَیَّ یَجْتَرِءُ وْنَ؟ فَبِیْ حَلَفْتُ لَاَبْعَثَنَّ عَلٰی اُولٰٓئِکَ مِنْهُمْ فِتْنَةً تَدَعُ الْحَلِیْمَ فِیْهِمْ حَیْرَانَ۔ (ترمذی)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''آخری زمانہ میں کچھ ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو دین کو دنیا طلبی کا ذریعہ بنائیں گے۔ وہ لوگوں (کو دکھانے) کے لیے بھیڑ کی کھالیں پہنیں گے۔ ان کی زبانیں شکر سے زیادہ شیریں ہوں گی مگر دل ان کے بھیڑیوں کے دل ہوں گے۔ اللہ فرماتا ہے کہ کیا یہ لوگ میرے ڈھیل دینے سے دھوکا کھا رہے ہیں یا (مجھ سے بے خوف ہو کر) میرے مقابلہ میں جرأت دکھا رہے ہیں؟ پس مجھے اپنی قسم، میں لازماً ان پر خود ان ہی میں ایسا فتنہ مسلط کردوں گا کہ جو ان میں عقل مند اور دانا کو بھی حیران و سرگشتہ چھوڑے گا۔''

تشریح: اس حدیث میں آخری دور میں رونما ہونے والے ایک عظیم فتنے کی خبر دی گئی ہے جس کا ظہور آج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ریا کی ایک قسم اور بدترین قسم یہ ہے کہ آدمی زہد اور پرہیزگاری کا ڈھونگ رچائے اور اس سے غرض یہ ہو کہ خدا کے سادہ لوح بندوں کو اپنے جال میں پھنسا کر ان سے نذرانہ اور ہدیہ وغیرہ وصول کر کے دنیا کمائے۔ اس طرح کے مکار اور عیار لوگوں سے خدا سخت انتقام لینے کی دھمکی دیتا ہے کہ وہ ان کو سخت قسم کے فتنے میں مبتلا کر دے گا کہ ان کے دانا اور عقل مندوں کی عقلیں بھی حیران ہو کر رہ جائیں گی اور ان کی سمجھ میں نہ آئے گا کہ وہ اس فتنہ سے کیوں کر نجات حاصل کر سکیں۔

﴿۷﴾ وَ عَنْ جُنْدُبٍؓ قَالَ: قَالَ النَّبِیُّ ﷺ مَنْ سَمَّعَ سَمَّعَ اللّٰهُ بِهٖ وَ مَنْ یُّرَآئِیْ یُرَآئِ اللّٰهُ بِهٖ۔ (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت جندبؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''جس کسی نے شہرت کی خواہش کی تو اللہ اس کو ظاہر کر دے گا اور جو کوئی دکھاوے کی غرض سے کوئی کام کرے گا تو اللہ اسے خوب دکھائے گا۔''

تشریح: یعنی نیک عمل سے اپنی شہرت اور نام ونمود چاہنے والوں کو خدا ان کے عمل کی مناسبت سے یہ سزا دے گا کہ ان کی منافقت طشت از بام ہو کر رہے گی۔ ہر خاص و عام پر یہ عیاں ہو جائے گا کہ انھوں نے اپنے باطن میں کیا خباثتیں چھپا رکھی تھیں۔ شہرت کے بھوکوں کو اس رسوائی سے سابقہ دنیا میں بھی پیش آسکتا ہے۔ سرِ محشر تو ان کی ریا کاری کا پردہ چاک ہونا ہی ہے۔

ریا حقیقت میں ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کے منافی اور شیطانی خصائل میں سے ہے۔ چناں چہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: وَالَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَآءَ النَّاسِ وَلاَ یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلاَ بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ط وَ مَنْ یَّكُنِ الشَّیْطَانُ لَهٗ قَرِیْنًا فَسَآءَ قَرِیْنًاo (سورہ النساء:۳۸) ’’اور وہ جو اپنے مال لوگوں کو دکھانے کے لیے خرچ کرتے ہیں، نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ روزِ آخر پر، جس کسی کا ساتھی شیطان ہوا، تو وہ تو بہت ہی برا ساتھی ہے۔‘‘

〈۸〉 وَ عَنْ اَبِیْ ذَرٍّؓ قَالَ: قِیْلَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ اَرَأَیْتَ الرَّجُلَ یَعْمَلُ الْعَمَلَ مِنَ الْخَیْرِ وَ یَحْمَدُهُ النَّاسُ عَلَیْهِ وَ فِیْ رِوَایَةٍ وَ یُحِبُّهُ النَّاسُ عَلَیْهِ۔ قَالَ: تِلْكَ عَاجِلُ بُشْرَی الْمُؤْمِنِ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ رسول خدا ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ اس شخص کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے جو کوئی نیک عمل کرتا ہے اور اس کی وجہ سے لوگ اس کی تعریف کرتے ہیں۔ ایک روایت میں ہے کہ اس کی وجہ سے لوگ اس سے محبت کرتے ہیں؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا: ’’یہ تو مومن کی فوری بشارت ہے۔‘‘

تشریح: اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص نیک اعمال اخلاص کے ساتھ محض خدا کی خوش نودی کے لیے انجام دیتا ہے لیکن لوگ اس کی نیکی کی وجہ سے اس سے محبت کرنے لگتے یا اس کی تعریفیں کرنے لگتے ہیں تو اس سے اس کے نیک اعمال کے ضائع ہونے کا اندیشہ نہیں کرنا چاہیے۔ بل کہ اس تعریف و محبت کی حیثیت آخرت میں ملنے والے اجر و ثواب سے پہلے دنیا میں ایک فوری اور نقد انعام اور اس کی مقبولیت و محبوبیت کی ایک علامت و بشارت کی ہوگی۔

〈۹〉 وَ عَنْ عُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ كَانَتْ لَهٗ سَرِیْرَةٌ صَالِحَةٌ اَوْ سَیِّئَةٌ اَظْهَرَ اللّٰهُ مِنْهَا رِدَآءً یُّعْرَفُ بِهٖ۔ (بیہقی فی شعب الایمان)

ترجمہ: حضرت عثمان بن عفانؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا: ’’جس کسی

شخص کی چھپی ہوئی اچھی یا بری کوئی خصلت ہو، اللہ اس (خصلت) سے ایک علامت ظاہر کرتا ہے جس کے ذریعہ سے اس کی پہچان اور شناخت ہوجاتی ہے۔"

تشریح: اصل لفظ رداء استعمال ہوا ہے جس کا ترجمہ یہاں علامت کیا گیا ہے۔ رداء چادر کو کہتے ہیں۔ یہاں اس سے مراد علامت اور ہیئت وصورت ہے۔ جس طرح آدمی اپنی چادر سے پہچان لیا جاتا ہے۔ اسی طرح ہیئت وصورت اور علامت سے آدمی کی پہچان ہوجاتی ہے کہ وہ کس اخلاق و کردار کا حامل ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ آدمی کے اعمال واخلاق کے اثرات آدمی کی شخصیت سے ظاہر ہوتے ہیں بل کہ آدمی کی شخصیت کی تعمیر وتشکیل ہی اصلاً اس کے اخلاق وکردار سے ہوتی ہے۔ اخلاق وکردار کے اثرات ایک ہیئت وصورت اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ صورت جاذبِ قلب ونظر بھی ہوسکتی ہے اور قبیح اور بے رونق بھی، اس کا دارو مدار اس بات پر ہے کہ اس کے اخلاق و کردار اچھے ہیں یا برے۔ بہ ہر حال آدمی اسی ہیئت وعلامت کے ذریعہ سے پہچان لیا جاتا ہے کہ وہ کیسا ہے؟ بالخصوص آدمی کا چہرہ اس کے کردار کی بلندی وپستی اور اس کی عظمت ونکبت کا آئینہ دار ہوتا ہے اس لیے آدمی کے اعمال وکردار اہلِ نظر سے چھپے نہیں رہ سکتے۔ اسی لیے ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ رسولِ اکرم (ﷺ) نے فرمایا: لَوْ اَنَّ رَجُلاً عَمِلَ عَمَلاً فِیْ صَخْرَۃٍ لاَ بَابَ لَھَا وَلاَ کُوَّۃَ خَرَجَ عَمَلُہٗ اِلَی النَّاسِ کَائِنًا مَّا کَانَ۔ (بیہقی فی شعب الایمان) "کوئی شخص کسی چٹان کے درمیان کوئی عمل کرے جس میں نہ دروازہ ہو اور نہ کوئی روشن دان ہو، اس کا عمل لوگوں پر ظاہر ہو کر رہتا ہے۔" یعنی کسی غار میں نہایت چھپ کر بھی کوئی عمل کیا جائے وہ عمل اپنے عملِ انعکاس (Reflection) کے ذریعہ سے لوگوں پر ظاہر ہوجاتا ہے۔

ریا کے ذریعہ سے ریا کار شخص جو چیز حاصل کرنا چاہتا ہے اسے وہ چیز (حقیقی عزت) حاصل بھی نہیں ہوتی اور اس کے اعمال الگ اکارت جاتے ہیں۔ اس کے برعکس خدا کے مخلص بندوں کے اعمال بھی ان کے اخلاص کی وجہ سے ضائع نہیں ہوتے اور خدا بالعموم ان کو نیک نامی اور عزت سے بھی محروم نہیں رکھتا۔

نفاق

(۱) عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عَمْرٍوؓ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ: اَرْبَعٌ مَّنْ کُنَّ فِیْہِ کَانَ مُنَافِقًا اَوْ کَانَتْ فِیْہِ خَصْلَۃٌ مِّنْ اَرْبَعَۃٍ کَانَتْ فِیْہِ خَصْلَۃٌ مِّنَ النِّفَاقِ حَتّٰی یَدَعَھَا: اِذَا

حَدَّثَ کَذِبَ وَ اِذَا وَعَدَ اَخْلَفَ وَ اِذَا عَاهَدَ غَدَرَ وَ اِذَا خَاصَمَ فَجَرَ۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ”جس شخص میں چار باتیں پائی جائیں وہ منافق ہے، یا جس کسی میں ان چاروں میں سے کوئی خصلت پائی جائے تو اس میں نفاق کی ایک خصلت موجود ہوگی، یہاں تک کہ وہ اس سے باز آجائے: جب بات کرے تو جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو اس کی خلاف ورزی کرے، جب عہد و پیمان کرے تو توڑ ڈالے اور جب جھگڑا کرے تو بے قابو ہو کر فحش کلامی پر اتر آئے۔“

تشریح: مسلم کی ایک روایت میں منافقاً خالصًا (خالص منافق) آیا ہے۔ اور مسلم کی ایک روایت میں خصلة کے بہ جائے خَلَّةٌ آیا ہے۔ مفہوم دونوں کا ایک ہی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اس طرح کے اخلاق و خصائل مومنوں کے نہیں، منافقوں کے ہیں۔ نفاق کا مطلب ہی یہ ہوتا ہے کہ آدمی کے ظاہر اور باطن میں موافقت اور یگانگت نہ پائی جائے۔ آدمی گفتگو تو ایسی کرے کہ محسوس ہو کہ وہ سچ کہہ رہا ہے لیکن وہ کذب بیانی سے کام لے۔ وہ وعدہ کر کے یقین تو یہ دلائے کہ وہ اپنے کیے ہوئے وعدہ کو پورا کرے گا لیکن وہ اپنے وعدہ کا کچھ بھی پاس و لحاظ نہ رکھے۔ اسی طرح اسے اپنے عہد و پیمان کے توڑنے میں بھی کوئی باک نہ ہو اور اس کا کسی سے جھگڑا ہو تو وہ حدود کا احترام نہ کرے۔ نازیبا حرکتیں کرنے لگے اور غصّہ میں ایسا بے قابو ہو جائے کہ فحش کلامی اور بدزبانی سے بھی اسے کوئی عار نہ ہو۔ یہ خصائل اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ ایسا شخص قابل اعتماد اور بھروسے کے لائق نہیں ہے۔

جن معاصی کا ذکر اس حدیث میں کیا گیا ہے وہ منافقین کی سرشت میں داخل ہوتے ہیں۔ ایک مسلمان کا فرض ہے کہ وہ نفاق کی ہر ایک خصلت سے متنفر اور بے زار ہو۔ اپنی زندگی کو تضاد سے پاک رکھ کر اس میں پوری یک رنگی پیدا کرے اور کسی منافقانہ خصلت کو اپنی زندگی میں ہرگز اختیار نہ کرے اور اگر اتفاقاً کوئی معصیت سرزد ہو جائے تو فوراً توبہ کر کے اپنی اصلاح کی طرف متوجہ ہو۔

اگر ان خصائل میں سے جن کا ذکر اس حدیث میں کیا گیا ہے، کوئی خصلت کسی مسلمان کے اندر پائی جاتی ہے تو اسے جان لینا چاہیے کہ اس کے اندر نفاق کی ایک خصلت موجود ہے۔ اور اگر یہ تمام عیوب اس کے اندر پائے جائیں تو گویا اس نے پورے طور پر منافقین سے مشابہت اختیار رکھی ہے اور اس کی یہ روش اس کے ایمان و یقین کے لیے حد درجہ خطرناک ہے۔

〈۲〉 وَ عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ قَالَ: اٰیَۃُ الْمُنَافِقِ ثَلاَثٌ: اِذَا حَدَّثَ کَذِبَ وَ اِذَا وَعَدَ اَخْلَفَ وَ اِذَا ؤْتُمِنَ خَانَ۔ (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ”منافق کی علامتیں تین ہیں: جب بات کرے تو جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو اس کی خلاف ورزی کرے اور جب اسے امین بنایا جائے تو خیانت کرے۔“

تشریح: مسلم میں یہ الفاظ بھی ملتے ہیں: وَ اِنْ صَامَ وَ صَلّٰی وَ زَعَمَ اَنَّہٗ مُسْلِمٌ (اگرچہ وہ روزہ رکھتا، نماز پڑھتا ہو اور اپنے مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتا ہو)

نفاق درحقیقت انسان کے ظاہر و باطن کے باہمی اختلاف کو کہتے ہیں جس کی متعدد شکلیں ممکن ہیں، مگر اصولی طور پر ان کی چار یا تین شکلیں ہوں گی۔ اوپر کی حدیث میں نفاق کی چار بنیادی علامات کا ذکر کیا گیا ہے اور اس حدیث میں تین بنیادی علامتیں بیان کی گئی ہیں۔ اس کا بھی امکان پایا جاتا ہے کہ کسی خاص دور میں چار یا اس سے زیادہ علامات کو بنیادی حیثیت حاصل ہو اور کسی دوسرے زمانے میں کوئی تین علامتیں بنیادی حیثیت کی حامل ہوں۔ ایک حدیث میں منافقین کی آٹھ علامات کا تذکرہ کیا گیا ہے کہ حضور (ﷺ) کا ارشاد ہے: اِنَّ لِلْمُنَافِقِیْنَ عَلاَمَاتٌ یُعْرَفُوْنَ بِھَا: تَحِیَّتُھُمْ لَعْنَۃٌ وَ طَعَامُھُمْ نُھْبَۃٌ وَ غَنِیْمَتُھُمْ غُلُوْلٌ وَلاَ یَقْرَبُوْنَ الْمَسَاجِدَ اِلاَّ ھُجْرًا وَلاَ یَاْتُوْنَ الصَّلٰوۃَ اِلاَّ دُبُرًا مُّسْتَکْبِرِیْنَ لاَ یَاْلِفُوْنَ وَلاَ یُؤْلَفُوْنَ خُشُبٌ بِاللَّیْلِ صُخُبٌ بِالنَّھَارِ (احمد عن ابی ہریرہؓ) ”منافقین کی کچھ علامات ہیں جن کے ذریعہ سے وہ پہچانے جاتے ہیں: سلام کے بہ جائے ان کی زبانوں پر لعنت کے الفاظ ہوتے ہیں۔ ان کی خوراک لوٹ کا مال اور ان کا مالِ غنیمت خیانت کا مال ہوتا ہے۔ وہ مسجدوں میں مصروف نہیں ہوتے سوائے اس کے کہ وہاں بیہودہ بکواس کرتے ہیں۔ نماز میں محض آخر میں شریک ہوتے ہیں۔ نہ خود وہ کسی سے محبت رکھتے ہیں اور نہ دوسروں کو ان سے کوئی محبت ہوتی ہے۔ شب میں شہتیر کی طرح بستروں پر پڑے رہتے ہیں اور دن میں شور مچاتے پھرتے ہیں۔“

اس حدیث میں منافقین کی جو تصویر کھینچی گئی ہے وہ نہایت مکمل ہے۔ اس سے ان کی اخلاقی حالت اور معاشی زندگی کا پورا نقشہ سامنے آجاتا ہے۔ یہ حدیث بتاتی ہے کہ اخلاق کے

لحاظ سے منافقین نہایت گرے ہوئے اور پست ہوتے ہیں۔ خودغرضی ان کا اصل شعار ہوتا ہے۔ خیانت ان کا وتیرہ اور شیوہ ہوتا ہے۔ دین سے ان کا کوئی لگاؤ نہیں ہوتا۔ جب دین کی ان کی نگاہ میں کوئی اہمیت نہیں تو نماز سے ان کو کیا دل چسپی ہوسکتی ہے خودغرضی اور محبت میں چوں کہ تضاد پایا جاتا ہے اس لیے یہ خودغرض کسی سے محبت و الفت نہیں رکھتے۔ دوسرے لوگوں کے دلوں میں بھی ان کے لیے کوئی محبت نہیں ہوسکتی۔ ان کا ہر عمل ایمانی تقاضوں کے خلاف ہوتا ہے۔ اس لیے ان کو منافق کے نام سے موسوم کیا گیا۔

﴿۳﴾ وَ عَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ: اَلْحَیَآءُ وَالْعِیُّ شُعْبَتَانِ مِنَ الْاِیْمَانِ وَالْبَذَآءُ وَالْبَیَانُ شُعْبَتَانِ مِنَ النِّفَاقِ۔ (ترمذی)

ترجمہ: حضرت ابوامامہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ”حیا اور کم سخنی اور جھجک ایمان کے دوشعبے ہیں اور بدزبانی اور زبان آوری نفاق کے دوشعبے ہیں۔“

تشریح: مومن چوں کہ ذمہ دارانہ زندگی گزارتا ہے اس لیے وہ جو کچھ بھی کہتا ہے سوچ سمجھ کر کہتا ہے۔ اسے یہ احساس دامن گیر ہوتا ہے کہ اسے اپنے ایک ایک لفظ کا خدا کے حضور حساب دینا ہے۔ اس لیے فطری طور پر وہ بے خوفی اور بے باکی کے ساتھ گفتگو نہیں کرتا۔ پھر وہ جو کچھ کرتا ہے اس سے اس کا مقصود محض خوش نودیِ رب کا حصول ہوتا ہے۔ اس لیے وہ کسی مجمع پر چھا جانے اور لوگوں کو اپنے زورِ بیان سے مرعوب کرنے کے چکر میں نہیں رہتا۔ وہ ضرورت سے زیادہ بولنے کی کوشش سے گریز کرتا ہے۔ پھر چوں کہ وہ حیادار ہوتا ہے اور یہ حیا اسے مجبور کرتی ہے کہ وہ کوئی ایسا انداز اختیار نہ کرے جو خدا کی نگاہ میں ناپسندیدہ اور معیوب ہو۔ وہ لوگوں کے ساتھ بے شرمی کا معاملہ نہیں کرسکتا۔ نہ وہ لوگوں کے سامنے ڈینگیں مارتا ہے اور نہ ان کو رسوا اور ذلیل کرنے میں اسے کوئی دل چسپی ہوتی ہے۔ لیکن وہ حق بات کو کبھی چھپاتا نہیں۔ البتہ حق بات کہنے میں اس کا خیال رکھتا ہے کہ کسی کی خواہ مخواہ کے لیے دل آزاری نہ ہو۔ اس کی جھجک کی ایک بڑی وجہ اس کی حیا بھی ہے۔ اسے اگر فکر ہوتی ہے تو اس بات کی کہ کسی طرح لوگ حق سے آشنا ہوسکیں اور وہ اپنے رب کو پہچان لیں۔

منافق کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہوتا ہے۔ وہ گفتگو اور تقریر میں زورِ بیانی دکھانا اور مجمع کو مرعوب کرنا چاہتا ہے اور اپنی جادو بیانی سے لوگوں کو اپنے گرد جمع کرنا چاہتا ہے۔ حق سے

درحقیقت اسے کوئی دل چسپی نہیں ہوتی۔ اس لیے اس کا سارا بیان بے نور اور بے کیف ہوتا ہے۔ ذرا بھی غور وفکر سے کام لیا جائے تو صاف ظاہر ہوگا کہ اس کی باتیں محض باتیں ہیں جن کے پیچھے کوئی گہرا احساس اور حق شناسی کام نہیں کر رہی ہے۔

﴿۴﴾ وَ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ مَّاتَ وَلَمْ یَغْزُوْا وَلَمْ یُحَدِّثْ بِهٖ نَفْسَهٗ مَاتَ عَلٰی شُعْبَةٍ مِّنَ النِّفَاقِ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”جو شخص اس حالت میں مر گیا کہ نہ تو اس نے راہِ خدا میں جنگ کی اور نہ کبھی اس کے دل میں اس کا خیال ہی آیا تو اس کی موت نفاق کے ایک شعبہ کو لے کر ہوئی ہے۔“

تشریح: یعنی مومن کی شان یہ ہونی چاہیے کہ ضرورت پیش آئے تو خدا کی راہ میں اپنی جان تک قربان کرنے سے دریغ نہ کرے اور اگر اس کا موقع میسر نہ آسکے تو کم از کم اس تمنا میں اس کا دل تڑپتا رہے کہ کاش مجھے راہِ خدا میں لڑنے کی سعادت حاصل ہوسکتی۔

اسلام میں جنگ بہ ذات خود مقصود نہیں ہے۔ اسلام نے فساد فی الارض کو ختم کرنے کے لیے جنگ کی اجازت دی ہے۔ اسلام میں اصل مقصود نظامِ عدل وحق کا قیام ہے۔ نظامِ حق کے قیام کے لیے اصل کام یہ ہے کہ لوگوں کو خدا کے دین کی طرف دعوت دی جائے اور اہلِ حق کو اور ان لوگوں کو جو دعوتِ حق پر لبیک کہیں، متحد و منظّم کیا جائے اور انھیں ایک فعال قوت کی شکل دی جائے۔ اس لیے کہ اجتماعی کوشش کے بغیر نظامِ حق کے برپا ہونے کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا۔

اب اگر کوئی راہِ خدا میں لڑنے کی تمنا تو کرتا ہے لیکن دعوتی سرگرمیوں اور اہلِ حق کے اتحاد سے اسے کوئی دل چسپی نہیں ہے تو پھر یا تو دینِ حق اور اس کے تقاضوں کا اسے کوئی شعور نہیں ہے یا پھر وہ اس طرح سے اپنے نفس اور خدا کو دھوکا دینا چاہتا ہے۔

﴿۵﴾ وَ عَنِ ابْنِ عُمَرَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَثَلُ الْمُنَافِقِ کَالشَّاةِ الْعَآئِرَةِ بَیْنَ الْغَنَمَیْنِ تَعِیْرُ اِلٰی هٰذِهٖ مَرَّةً وَ اِلٰی هٰذِهٖ مَرَّةً۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”منافق کی مثال اس

آوارہ بکری کی سی ہے جو نر کی تلاش میں دو ریوڑوں کے درمیان کبھی اس طرف اور کبھی اس طرف ماری ماری پھرتی ہو۔"

تشریح: اس حدیث میں نفاق کی نفسیاتی حقیقت کو ایک موثر مثال کے ذریعہ سے واضح کیا گیا ہے۔ منافقوں کو محض دنیوی منفعت عزیز ہوتی ہے۔ ان کی نگاہ صرف اس پر مرکوز ہوتی ہے کہ اپنی جان اور مال کی حفاظت کیوں کر ہو۔ ان کے اندر حالات سے مقابلہ کرنے کی سکت نہیں ہوتی۔ وہ عافیت کے متلاشی ہوتے ہیں۔ خواہ یہ عافیت کسی کے یہاں بھی مل سکے۔ انھیں اس کی فکر مطلق نہیں ہوتی کہ یہ عافیت پسندی دنیا یا آخرت کہیں کا بھی انھیں نہ رہنے دے گی۔

قول وعمل میں تضاد

(۱) عَنْ اُسَامَةَؓ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: يُجَآءُ بِالرَّجُلِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَيُلْقٰى فِي النَّارِ فَتَنْدَلِقُ اَقْتَابُهٗ فِي النَّارِ فَيَدُوْرُ كَمَا يَدُوْرُ الْحِمَارُ بِرَحَاهُ فَيَجْتَمِعُ اَهْلُ النَّارِ عَلَيْهِ فَيَقُوْلُوْنَ: يَا فُلَانُ، مَا شَانُكَ! اَلَيْسَ كُنْتَ تَأْمُرُنَا بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَانَا عَنِ الْمُنْكَرِ قَالَ: كُنْتُ اٰمُرُكُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَلَآ اٰتِيْهِ، وَ اَنْهَاكُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ اٰتِيْهِ. (بخاری)

ترجمہ: حضرت اسامہؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسولِ خدا ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: "قیامت کے روز ایک شخص کو لایا جائے گا، پھر اسے دوزخ میں ڈال دیا جائے گا تو اس کی آنتیں آگ میں نکل پڑیں گی۔ وہ اس طرح گھومے گا جس طرح گدھا اپنی چکی کو لے کر گھومتا ہے۔ اہلِ دوزخ اس کے پاس جمع ہو جائیں گے اور کہیں گے: اے فلاں، یہ تیرا کیا حال ہے؟ کیا تو ہمیں اچھی باتوں کا حکم نہیں دیتا تھا اور بری باتوں سے ہمیں روکتا نہیں تھا! وہ کہے گا کہ میں تمھیں اچھی باتوں کا حکم تو دیتا تھا مگر ان پر خود عمل نہ کرتا تھا اور تمھیں بری باتوں سے تو روکتا تھا مگر خود ان میں مبتلا ہوتا تھا۔"

تشریح: 'خود را فضیحت دیگراں را نصیحت' کا انجام کتنا عبرت ناک ہوگا۔ قول وعمل کا تضاد آدمی کو قیامت میں برسرِ عام رسوا کرے گا۔ جہنم کا الم ناک عذاب الگ اس کے حصے میں آئے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ جو شخص دوسروں کو بیدار کرنے کی فکر میں گھلا جاتا ہے اور خود خوابِ غفلت میں پڑا رہنا چاہتا

ہے۔اس کا یہ طرزِ عمل ایک مسخرہ پن کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔اس کا وہی انجام ہونا چاہیے جس کی خبر اس حدیث میں دی گئی ہے۔ دانش مند شخص وہ ہے جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا مخاطب سب سے پہلے خود کو قرار دے اور اپنی اصلاح کی طرف سے ایک دم کے لیے بھی غافل نہ ہو۔

﴿۲﴾ وَ عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رضی اللہ عنہ عَنِ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: اِنَّمَا اَخَافُ عَلٰى هٰذِهِ الْاُمَّةِ كُلَّ مُنَافِقٍ يَّتَكَلَّمُ بِالْحِكْمَةِ وَ يَعْمَلُ بِالْجَوْرِ۔ (بیہقی فی شعب الایمان)

ترجمہ: حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مجھے اس امت پر ہر ایسے منافق سے اندیشہ ہے جو باتیں تو حکیمانہ کرتا ہے لیکن کام اس کے ظالمانہ ہوتے ہیں۔''

تشریح: یعنی ایسے لوگ امتِ مسلمہ کے لیے شرِ محض ہیں جن کی باتیں بہ ظاہر نہایت حکیمانہ اور فکر آموز ہوں لیکن جو کارنامے وہ انجام دیں وہ ظلم و جور کے کارنامے ہوں۔ یہ اشارہ ان رہ نماؤں کی طرف بھی ہوسکتا ہے جو حدود اللہ کو سب سے زیادہ خود پامال کرتے ہیں۔ان کے دام فریب سے بچنا آسان نہیں ہوتا۔اس لیے کہ وہ اس فن میں یک تائے روزگار ہوتے ہیں کہ اپنی تاویلات سے حق کو باطل اور باطل کو حق ثابت کر دکھائیں اس قماش کا ہر شخص امت کے لیے ایک بڑا فتنہ ہے۔اسی لیے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) اس قماش کے آدمی کو امت کے لیے اصل خطرہ قرار دے کر اس سے ہوشیار رہنے کی تاکید فرما رہے ہیں۔

مغالطہ دینا

﴿۱﴾ عَنْ سُفْيَانَ بْنِ اُسَيْدٍ الْحَضْرَمِيِّ رضی اللہ عنہ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم يَقُوْلُ: كَبُرَتْ خِيَانَةً اَنْ تُحَدِّثَ اَخَاكَ حَدِيْثًا هُوَ لَكَ بِهٖ مُصَدِّقٌ وَ اَنْتَ لَهٗ بِهٖ كَاذِبٌ۔ (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت سفیان بن اسید حضرمی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ''بڑی خیانت یہ ہے کہ تم اپنے بھائی سے ایسی بات کہو جس کو وہ سچ جانے اور تم اس سے جھوٹ کہو۔''

تشریح: معلوم ہوا کہ خیانت کا تعلق صرف مال و دولت اور امانتوں ہی سے نہیں ہے اپنے غلط طرزِ عمل سے آدمی کسی بھی معاملہ میں اپنے خائن ہونے کا ثبوت بہم پہنچا سکتا ہے۔اس حدیث میں ایک مثال گفتگو کی دی گئی ہے۔اپنی بات چیت میں کوئی شخص خیانت کا مرتکب ہوسکتا ہے۔

خیانت درحقیقت ایک طرح کی دھوکہ بازی ہے۔ آدمی بات چیت ایسے انداز سے کرے کہ سننے والا اسے سچ سمجھے حالاں کہ وہ غلط بیانی سے کام لے رہا ہو تو یہ بھی خیانت ہے اور بڑی خیانت ہے۔ اپنے بھائی کو کسی فریب میں مبتلا کرنا کسی صورت میں روا نہیں ہے۔

اس حدیث سے معلوم یہ ہوا کہ دین میں مطلوب یہ ہے کہ مومن شخص ہر قسم کی نازیبا حرکتوں سے باز رہے اور کبھی بھی کوئی ایسا طرز اختیار نہ کرے جس میں کوئی فریب شامل ہو۔

مبالغہ آرائی

﴿۱﴾ عَنْ مُطَرِّفِ بْنِ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ الشِّخِّیْرِ قَالَ: (قَالَ اَبِیْ) اِنْطَلَقْتُ فِیْ وَفْدِ بَنِیْ عَامِرٍ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ فَقُلْنَا اَنْتَ سَیِّدُنَا فَقَالَ السَّیِّدُ اَللّٰہُ فَقُلْنَا وَ اَفْضَلُنَا فَضْلاً وَ اَعْظَمُنَا طَوْلاً فَقَالَ: قُوْلُوْا قَوْلَکُمْ اَوْ بَعْضَ قَوْلِکُمْ وَلاَ یَسْتَجْرِیَنَّکُمُ الشَّیْطٰنُ۔ (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت مطرف بن عبداللہ الشخیر کہتے ہیں کہ میرے والد بیان کرتے ہیں کہ میں بنو عامر کے وفد میں شامل ہو کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں گیا اور ہم نے عرض کیا کہ آپؐ ہمارے سردار اور آقا ہیں۔ فرمایا: ''آقا تو اللہ ہے۔'' ہم نے عرض کیا کہ فضل کے لحاظ سے آپؐ ہم میں افضل ہیں اور بخشش کے لحاظ سے آپؐ ہمارے بزرگ ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: ''یہ بات کہو یا اس سے بھی کچھ کم ہی کہو اور شیطان تمھیں اپنا وکیل نہ بنائے۔''

تشریح: یعنی عبداللہؓ جو صحابیِ رسولؐ ہیں۔ قَالَ اَبِیْ (میرے والد بیان کرتے ہیں) یہ الفاظ مخطوطۃ الحاکم میں ملتے ہیں۔

آقا اور مالک تو خدا ہی ہے۔ تمام امور اصلاً اسی کے دستِ قدرت میں ہیں۔ آقا کہلانے کا حقیقت میں وہی مستحق ہے۔ شارحینِ حدیث کے خیال میں آپؐ نے اس اندازِ خطاب کو اس لیے پسند نہیں فرمایا کہ قوم اور قبائل کے رؤسا اور امرا کو اس طرح کے خطاب سے لوگ نوازتے تھے۔ وفد کے لوگوں کے لیے بہتر یہ تھا کہ وہ آپؐ کو نبی اور رسول کے لقب سے یاد کرتے۔ نبوت اور رسالت سے بڑھ کر کسی اونچے مرتبہ کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ جذبۂ عقیدت کی تسکین کا سامان بھی اس میں سب سے بڑھ کر تھا۔ ورنہ آپؐ کی سیادت و قیادت تو اظہر من الشمس ہے۔

آپؐ کی ہدایت کا ماحصل یہ ہے کہ عام لوگوں کی طرح بے جا مبالغہ آرائی سے کام نہ لو۔ ایسا نہ ہو کہ تم ایسی باتیں کہنے لگ جاؤ جن سے گم راہی کے راستے کھلتے ہیں۔ شیطان یہی چاہتا ہے کہ لوگ یا تو رسول پر ایمان ہی نہ لائیں اور اگر لائیں بھی تو وہ اپنے رسول کے بارے میں ایسا غلو اختیار کریں کہ اسے خدائی کے درجہ پر پہنچا دینے میں بھی انھیں کوئی جھجک اور تامل نہ ہو۔ عیسائیوں نے یہی تو کیا کہ خدا کے پیغمبر حضرت مسیح علیہ السلام کو خدا کا بیٹا بل کہ خدا بنا کر چھوڑا۔ اور کفر وضلالت میں بہت دور نکل گئے۔

جری کے معنی وکیل کے ہوتے ہیں۔ اِستَجرَأَ بتکلف جرأت دکھانے کو کہتے ہیں۔ یَستَجرِیَنَّکُم کو بہ جائے ی کے ہمزہ سے بھی پڑھا گیا ہے۔ اس صورت میں مفہوم یہ ہوگا کہ شیطان تمھیں بے باک اور دلیر نہ کردے (کہ جو چاہو کہنے لگ جاؤ)

جھوٹ

﴿۱﴾ عَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍؓ قَالَ: قَالَ النَّبِیُّ صلی اللہ علیہ وسلم رَاَیْتُ رَجُلَیْنِ اَتَیَانِی قَالاَ الَّذِیْ رَاَیْتَهٗ یُشَقُّ شِدْقُهٗ فَکَذَّابٌ یَّکْذِبُ بِالْکَذْبَةِ تُحْمَلُ عَنْهُ حَتّٰی تَبْلُغَ الْاٰفَاقَ فَیُصْنَعُ بِهٖ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت سمرہ بن جندبؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”خواب میں میں نے دیکھا کہ دو شخص میرے پاس آئے، انھوں نے کہا کہ وہ شخص جس کو آپؐ نے (معراج کی شب) دیکھا تھا، اس کے جبڑے چیرے جارہے ہیں وہ بہت بڑا جھوٹا تھا۔ وہ اس طرح جھوٹی باتیں اڑاتا تھا کہ وہ دنیا میں ہر طرف پھیل جاتی تھیں۔ اس کے ساتھ روزِ قیامت تک ایسا ہی ہوتا رہے گا۔“

تشریح: وہ چوں کہ جھوٹ بولتا تھا اور زبان اور منہ کا غلط استعمال کر کے جھوٹی باتوں کو پھیلاتا تھا۔ اس لیے اس کے لیے جو سزا تجویز کی گئی وہ یہ کہ قیامت کے روز تک اس کے جبڑے اور کلے چیرے جاتے رہیں گے۔ آخرت میں جو سزا اس کو ملے گی، وہ الگ ہے۔

اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ مرنے کے بعد سے لے کر قیامت کے دن تک کے لیے جب کہ لوگ زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے۔ آدمی بالکل فنا نہیں ہوجاتا بل کہ اس کے اپنے اچھے یا برے اعمال کے لحاظ سے اس کی روح کو اچھی یا بری حالت سے سابقہ پیش آتا ہے۔ مرنے کے بعد سے لے کر قیامت تک کی اس کی یہ زندگی برزخ کی زندگی کہلاتی ہے۔ پھر اس

حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ زندگی مادّی جسم کے بغیر بھی ممکن ہے بل کہ حقیقت یہ ہے کہ شعور و نطق اور سمع و بصر وغیرہ جسم کے نہیں بل کہ روح کے اوصاف ہیں۔ جسمانی اعضاء کی حیثیت تو محض آلات کی ہے جن سے ایک خاص انداز سے اوصاف کا ظہور ہوتا ہے۔ ان آلات کے بغیر دوسرے طور پر اس کے لیے دیکھنا اور بولنا اور سمجھنا ممکن رہتا ہے۔ اس کے لیے وہ جسمانی اعضاء، کان، آنکھ اور دماغ اور زبان کی محتاج نہیں ہے۔ یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ جسمانی آلات کے بغیر یہ اوصاف متحقق نہیں ہو سکتے۔ خدا کے بارے میں ہم سب کا عقیدہ ہے کہ وہ جسمانی آلات کے بغیر ان اوصاف سے متصف ہے۔

﴿۲﴾ وَ عَنِ ابْنِ عُمَرَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم اِذَا کَذِبَ الْعَبْدُ تَبَاعَدَ عَنْہُ الْمَلَکُ مِیْلاً مِّنْ نَّتْنِ مَا جَآءَ بِہٖ۔ (ترمذی)

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب کوئی بندہ جھوٹ بولتا ہے تو فرشتہ اس کے کلمہ کی بدبو کی وجہ سے ایک میل دور چلا جاتا ہے۔''

تشریح: مادی چیزوں کی خوش بو اور بدبو کی طرح انسان کے اعمال و کلمات کی بھی اپنی خوش بو یا بدبو ہوتی ہے۔ مادیت کے غلبہ کی وجہ سے ہم سڑی گلی چیزوں کی بدبو تو محسوس کرتے ہیں لیکن ان چیزوں کی بدبو محسوس نہیں کرتے جن کی بدبو اس بدبو کے مقابلہ میں ہزار گنا زیادہ ہوتی ہے۔

اسی طرح پھولوں کی خوش بو کا تو ہمیں پتا چل جاتا ہے لیکن اس خوش بو اور لذت کو ہم محسوس کرنے سے قاصر رہتے ہیں جس کے مقابلہ میں عام خوش بوئیں اور لذتیں ہیچ ہیں۔ عام رنگ و بو کی رعنائیاں تو ہمارا دامنِ دل کھینچتی ہیں لیکن حقیقت اور روح کی رعنائیوں سے ہم بے خبر رہ کر ہی دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔

فرشتوں کی حس بہت لطیف اور تیز ہوتی ہے اس لیے وہ ہمارے اچھے برے اعمال تک کی خوش بو یا بدبو کو محسوس کرتے ہیں۔ اور جھوٹ کی بدبو کی وجہ سے دور ہٹ جاتے ہیں۔ خدا کی باعزت مخلوق ہماری کذب بیانی کی بدبو کی وجہ سے ہم سے دور بھاگے۔ یہ ہمارے لیے کتنی شرم کی بات ہے لیکن ہمیں اس کی خبر بھی نہیں ہوتی کہ خدا کے فرشتے جو خدا کے مقرب اور نورانی مخلوق ہیں انھیں ہماری برائیوں سے اذیت ہوتی ہے اور ہمارے قریب ہونے کے بہ جائے ہم سے دور بھاگتے ہیں۔ یہاں یہ بات پیش نظر رکھنے کی ہے کہ صرف جھوٹ ہی سے نہیں بل کہ غیبت اور بدزبانی وغیرہ کی بدبو سے بھی یہ پاکیزہ مخلوق ہم سے دور بھاگتی ہے۔

فرشتوں کے علاوہ انسانوں میں بھی جس شخص کی روحانیت اس کی مادیت پر غالب ہوتی ہے اسے اعمال کی خوش بو یا بد بو کا ادراک ہوسکتا ہے۔

انسان جسم ہی نہیں روح بھی رکھتا ہے بل کہ اصلاً وہ روح ہی ہے جو مادیت سے یکسر پاک ہے۔ خدا کی ذات خود مادیت سے وراء اور زمان و مکان کی حدبندیوں سے پاک ہے۔ اس لیے مادیت ہی کو سب کچھ سمجھ لینا کم نگاہی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ جس طرح سے نفع و نقصان، راحت و تکلیف، لذت و ناخوش گواری۔ نور و ظلمت، پستی و بلندی، محمود و نامحمود اور حسن و قبح کا احساس ہمیں مادی عالم میں ہوتا ہے، ٹھیک اسی طرح بل کہ اس سے بڑھ کر ان چیزوں کا احساس غیر مادی دنیا میں بھی ہوتا ہے۔ جو حسن و خوبی ہم کو مادّی چیزوں میں نظر آتی ہے اس کا اس حسن اور خوب صورتی سے کوئی نسبت نہیں جو ان چیزوں میں پائی جاتی ہے جو مادیت سے پاک ہیں۔ سڑی ہوئی چیزوں کی بد بو سے ہم پریشان ہوجاتے ہیں۔ لیکن یہ بد بو اس بد بو کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں جو اس چیز سے روح کو پہنچتی ہے جو روح کے لیے متعفن ہے۔ ہم کھانے پینے کی لذتوں اور پھولوں کی خوش بو کو تو محسوس کرتے ہیں لیکن اس لذت اور خوش بو کو محسوس کرنے سے بالعموم قاصر رہتے ہیں جو اس سے کہیں زیادہ بڑھی ہوئی ہوتی ہے۔ ضرورت ہے کہ ہم مادی لذات سے زیادہ ایمانی و روحانی اور حقیقی نعمتوں اور لذتوں سے آشنا ہوں اور دنیا و آخرت میں اپنے آپ کو محرومی سے بچاسکیں۔

﴿۳﴾ وَ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ ؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ كَفٰى بِالْمَرْءِ كَذِبًا اَنْ يُّحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ”آدمی کو جھوٹ کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ جو کچھ سنے اسے بیان کرتا پھرے۔“

تشریح: ہر سنی سنائی بات بغیر تحقیق کے بیان کرتے پھرنا بھی ایک طرح سے جھوٹ میں ملوث ہونا ہے۔ اس طرح کی باتوں میں اس کا قوی امکان ہوتا ہے کہ بات بے بنیاد اور غلط ہو۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ جو کچھ کہے پہلے اس کی تحقیق کرلے۔ افواہوں کو ہوا دینا کسی طرح بھی صحیح نہیں ہوسکتا۔ اس سے طرح طرح کے فتنوں کو سر اٹھانے کا موقع ملتا ہے۔ جس کا تجربہ آئے دن لوگوں کو ہوتا رہتا ہے۔

〈۴〉 وَ عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِکٍؓ اَنَّهٗ قَالَ: اِنَّهٗ لَيَمْنَعُنِىْ اَنْ اُحَدِّثُكُمْ كَثِيْرًا اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: مَنْ تَعَمَّدَ عَلَیَّ كَذِبًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ مجھے تم سے زیادہ حدیثیں بیان کرنے سے یہ چیز روکتی ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے: ''جو شخص قصداً مجھ سے جھوٹ بات منسوب کرے وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے۔''

تشریح: غلط طور پر کوئی بات کسی کی طرف منسوب کرنی یوں بھی حرام ہے لیکن حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف منسوب کر کے کوئی ایسی بات کہنی جو آپؐ نے نہ فرمائی ہو، نہایت سنگین قسم کا جرم ہے جو ناقابلِ معافی ہے۔ اسی لیے آپؐ نے ایسے شخص کو جہنم کی وعید سنائی ہے۔ موضوع و غلط احادیث سے دینی نظام اور اس کے مزاج کے برہم ہونے کا قوی اندیشہ ہوتا ہے اس لیے اس جرم کے شدید ہونے میں کسی قسم کا شبہ نہیں کیا جا سکتا۔

یہ حدیث نہایت قوی ہے۔ آپؐ کے اس ارشاد کی وجہ سے اہلِ تقویٰ آپؐ کی طرف منسوب کر کے کوئی روایت بیان کرنے میں ہمیشہ احتیاط سے کام لیتے رہے ہیں۔ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ اس تنبیہ اور وعید کے باوجود کتنی ہی ضعیف ترین اور موضوع احادیث تک امت میں رائج ہو گئیں۔ اور آج بھی واعظین اور مصنفین اس سلسلہ میں جس بے احتیاطی کا ثبوت فراہم کرتے رہتے ہیں وہ اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں ہے۔

〈۵〉 وَ عَنْ خُرَيْمِ بْنِ فَاتِکٍ قَالَ: صَلّٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم صَلٰوةَ الصُّبْحِ فَلَمَّا انْصَرَفَ قَامَ قَآئِمًا فَقَالَ: عُدِلَتْ شَهَادَةُ الزُّوْرِ بِالْاِشْرَاکِ بِاللّٰهِ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ، ثُمَّ قَرَأَ: فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ ط حُنَفَآءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ۔ (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت خریم بن فاتکؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صبح کی نماز پڑھائی۔ پھر جب لوگوں کی طرف رخ پھیرا تو آپؐ سیدھے کھڑے ہو گئے اور ارشاد فرمایا: ''جھوٹی گواہی دینا خدا کے ساتھ شرک کرنے کے برابر ہے۔'' یہ بات آپؐ نے تین بار فرمائی۔ پھر آپؐ نے پڑھا: فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ ط حُنَفَآءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ

بِہٖ۔(پس تم بتوں کی گندگی سے بچو اور بچو جھوٹی بات سے، اس طور پر کہ اللہ ہی کی طرف ہو کر رہو، اس کے ساتھ شریک نہ ٹھہراؤ۔"

تشریح: اس حدیث میں نبی (ﷺ) نے جن آیتوں کا حوالہ دیا ہے وہ سورۃ الحج کی آیتیں (۳۱-۳۲) ہیں۔ ان آیتوں میں قولِ زور (جھوٹ) کو شرک اور بت پرستی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور ایک ہی لفظ کے ذریعہ سے دونوں سے اجتناب کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اسی لیے حضور (ﷺ) نے یہ استنباط فرمایا کہ جھوٹی گواہی اور شرک اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایک ہی قبیل کی چیزیں ہیں۔ جھوٹی شہادت کو توحید سے نہیں، شرک ہی سے مناسبت ہو سکتی ہے۔ توحید حق ہے اور شرک سراپا جھوٹ اور افتراء ہے۔ مسلمان جس طرح سے شرک اور بت پرستی سے نفرت کرتے ہیں اسی طرح سے انھیں جھوٹی شہادت دینے سے نفرت کرنی چاہیے۔ تائید کے لیے آپؐ نے اپنی بات کو تین بار دہرایا۔

﴿۲﴾ وَ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَامِرٍؓ قَالَ: دَعَتْنِیْ اُمِّیْ یَوْمًا وَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ قَاعِدٌ فِیْ بَیْتِنَا فَقَالَتْ تَعَالَ اُعْطِیْکَ فَقَالَ لَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَآ اَرَدْتِّ اَنْ تُعْطِیَهٗ؟ قَالَتْ اَرَدْتُّ اَنْ اُعْطِیَهٗ تَمْرًا فَقَالَ لَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اَمَا اِنَّکِ لَوْلَمْ تُعْطِیْهِ شَیْئًا کُتِبَتْ عَلَیْکِ کَذِبَةٌ۔ (ابوداؤد، البیہقی فی شعب الایمان)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عامرؓ سے روایت ہے کہ ایک روز میری ماں نے مجھے بلایا، اس وقت رسول اللہ ﷺ ہمارے گھر میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میری ماں نے کہا کہ بڑھ کے آ، میں تجھے کچھ دوں گی۔ رسولِ خدا ﷺ نے میری ماں سے کہا: "تم نے اسے کیا دینے کا ارادہ کیا ہے؟" انھوں نے کہا کہ میرا اسے ایک کھجور دینے کا ارادہ تھا۔ اس پر رسولِ خدا ﷺ نے ان سے کہا: "یاد رکھو، اگر تم اسے کچھ نہ دیتیں تو ایک جھوٹ تمھارے نامۂ اعمال میں لکھا جاتا۔"

تشریح: عام طور سے لوگ بچوں کو بہلانے، انھیں ڈرانے یا ان سے کوئی کام لینے کے لیے کوئی جھوٹ بات کہنے میں قباحت محسوس نہیں کرتے۔ حضورؐ کو اندیشہ ہوا کہ کہیں عام رواج کے مطابق عبداللہ بن عامرؓ (جو اس وقت بچے تھے) کی ماں نے بھی جھوٹ موٹ کا وعدہ کر کے انھیں اپنے پاس بلانے کی تدبیر نہ کی ہو۔ اسی لیے آپؐ نے تحقیق فرمائی کہ تمھارا اسے کیا دینے کا ارادہ ہے۔

اس حدیث کا حاصل یہ ہے کہ زبان کو کسی حال میں بھی جھوٹ سے آلودہ نہیں کرنا

چاہیے۔ کوشش یہ ہونی چاہیے کہ آدمی کا شمار جھوٹوں میں نہ ہو۔ یہاں یہ بات بھی پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ ماں باپ اگر اپنے بچوں سے جھوٹ بولیں گے تو بچے بھی جھوٹ بولنے لگیں گے اور ان کو اس میں کوئی قباحت محسوس نہ ہوگی۔

﴿۷﴾ وَ عَنْ اَبِیْ اُمَامَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: یُطْبَعُ الْمُؤْمِنُ عَلَى الْخِلَالِ کُلِّهَا اِلَّا الْخِیَانَةَ وَالْکَذِبَ۔ (احمد، البیہقی فی شعب الایمان)

ترجمہ: حضرت ابو امامہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ”طبیعۃً مومن کا ہر خصلت پر پیدا ہونا ممکن ہے سوائے خیانت اور جھوٹ کے۔“

تشریح: مومن کی طبیعت اور فطرت میں اس کی گنجائش نہیں ہے کہ وہ خائن اور کاذب ہو۔ مومن اگر صحیح معنی میں مومن ہے تو اس سے جھوٹ اور خیانت کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ رہیں دوسری کم زوریاں اور برائیاں تو ان کے امکان سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن جھوٹ اور خیانت جیسی منافقانہ خصلت ایمان کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتی۔ اگر کسی مسلمان میں جھوٹ اور خیانت کا عیب موجود ہے تو اس کو اپنے ایمان کی طرف توجہ دینی چاہیے اور کوشش کرنی چاہیے کہ اس کی زندگی ان برائیوں سے پاک ہو۔ کیوں کہ اس کے بغیر حقیقی ایمان نصیب نہیں ہوا کرتا۔

﴿۸﴾ وَ عَنْ بَهْزِ بْنِ حَکِیْمٍ عَنْ اَبِیْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَیْلٌ لِّمَنْ یُّحَدِّثُ فَیَکْذِبُ لِیُضْحِکَ بِهِ الْقَوْمَ وَیْلٌ لَّهٗ وَیْلٌ لَّهٗ۔ (احمد، ترمذی، ابوداؤد، دارمی)

ترجمہ: بہز بن حکیم بواسطہ اپنے والد کے اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ”افسوس اس شخص پر جو اپنی گفتگو میں لوگوں کو ہنسانے کی غرض سے جھوٹ بولے، اس پر افسوس! اس پر افسوس!“

تشریح: ہنسنے ہنسانے اور لطفِ صحبت میں اضافہ کے لیے جھوٹ کا سہارا لینا حد درجہ معیوب ہے خواہ اس سے کسی کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہ ہو۔ زبان کو ہر حال میں ہمیشہ پاک رکھنا چاہیے۔ اسے جھوٹ سے آلودہ کرنا کوئی دانش مندی کا کام نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ایک کم زوری سے دوسری کم زوریوں کے لیے راہ ہم وار ہوتی ہے۔ اس سے سماج میں جھوٹ کے رواج پانے کا خدشہ پیدا ہوتا ہے اور مومن کو کذب بیانی اور جھوٹی باتوں سے جو نفرت ہونی چاہیے اس میں کمی واقع ہوجاتی ہے۔

﴿۹﴾ وَ عَنِ ابْنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: اِنَّ اَفْرَی الْفِرٰی اَنْ یُّرِیَ عَیْنَیْہِ مَالَمْ تَرَیَا۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''سب سے بڑا افترا یہ ہے کہ آدمی اپنی آنکھوں کو وہ خواب دکھائے جو انھوں نے دیکھا نہیں۔''

تشریح: یعنی اگر کوئی شخص اچھا یا برا خواب گڑھ کر لوگوں سے بیان کرتا ہے تو یہ جھوٹ ہی نہیں ایک افترا بھی ہے اور بڑا افترا۔ کیوں کہ یہ افترا جھوٹے دعویٔ نبوت کے مشابہ ہے خواب میں جو کچھ آدمی دیکھتا ہے اس میں اس کا اپنا کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ خدا کی طرف سے خواب کے ذریعہ سے بندے کو آئندہ واقع ہونے والے کسی حادثہ کی اطلاع بھی دی جاسکتی ہے اور خواب کسی امر کے سلسلہ میں ایک انتباہ یا بشارت بھی ہوسکتا ہے۔ اسی لیے رویائے صادقہ (سچے خواب) کو نبوت کا ۴۰ واں حصہ کہا گیا ہے۔ اس لیے اگر کوئی شخص من گھڑت خواب بیان کرتا ہے تو گویا وہ خدا کی طرف ایسی بات منسوب کرتا ہے جس کا خدا سے سرے سے کوئی تعلق ہی نہیں ہوتا۔

﴿۱۰﴾ وَ عَنْ اُمِّ کُلْثُوْمٍ رضی اللہ عنہا قَالَتْ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم لَیْسَ الْکَذَّابُ الَّذِیْ یُصْلِحُ بَیْنَ النَّاسِ وَ یَقُوْلُ خَیْرًا وَ یَنْمِیْ خَیْرًا۔ (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت امِّ کلثومؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ شخص جھوٹا نہیں ہے جو لوگوں میں صلح کرانے کی غرض سے کوئی خیر اور بھلائی کی بات کہہ دے۔ اور کسی کو کسی کی طرف سے بھلی بات پہنچادے۔''

تشریح: بعض اوقات دو شخصوں یا دو فریقوں کے درمیان کچھ ایسے جھگڑے کھڑے ہوجاتے ہیں جن کے نتائج حد درجہ دردناک ثابت ہوتے ہیں۔ عداوت اور دشمنی کی وجہ سے ہر فریق ایسا اقدام کرنے لگ جاتا ہے جس سے قتل اور غارت گری تک کی نوبت آجاتی ہے۔ ایسی صورت میں اگر کوئی بے لوث اور مخلص شخص ان کے درمیان صلح کرانے کی کوشش کرتا ہے اور اس سلسلے میں وہ اس کی ضرورت محسوس کرتا ہے کہ وہ ایک فریق کی جانب سے دوسرے فریق کو ایسی خیر اندیشی کی باتیں پہنچائے جس سے دونوں کے درمیان خوش گمانی کی فضا پیدا ہوسکے اور عداوت کی بھڑکتی ہوئی آگ ٹھنڈی ہو تو ایسی خیر اندیشی کی باتوں کے پہنچانے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ اہم مصلحتوں کے پیشِ نظر ایسی ذومعنین باتوں کے کہنے کی پوری گنجائش ہے جس سے کسی خیر کی توقع

کی جاسکتی ہو اسے توریہ کہتے ہیں۔ بعض کے نزدیک اس میں کچھ زیادہ ہی وسعت ہے۔ ان کے نزدیک ضروری اور جائز مقصد کے حصول کے لیے اگر جھوٹ بولنا ناگزیر ہو جائے تو جھوٹ بولنے میں قباحت نہیں بل کہ کبھی کبھی تو جھوٹ سے کام لینا واجب ہو جاتا ہے۔ مثلاً ایک شخص کسی ظالم سے جو اس کے قتل کے درپے ہے، بچ کر ہمارے گھر میں چھپا ہوا ہے تو واجب ہے کہ ہم اسے بچانے کے لیے اس ظالم شخص کے دریافت کرنے پر صاف کہہ دیں کہ وہ یہاں نہیں ہے۔ لیکن یہ اسی وقت جب کہ توریہ سے کام نہ چل سکے۔ ورنہ جہاں تک ممکن ہو توریہ سے کام لیں۔ صریح جھوٹ بولنے سے اجتناب کریں۔ توریہ کی ایک مثال آگے کی حدیث میں آ رہی ہے۔ ابن قتیبہ نے اس کی کئی مثالیں دی ہیں۔ (دیکھیں "تاویل مختلف الاحادیث صفحہ ۴۳ تا ۴۷")

﴿۱۱﴾ وَ عَنْ سُوَیْدِ بْنِ حَنْظَلَۃَؓ قَالَ: خَرَجْنَا نُرِیْدُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم وَ مَعَنَا وَائِلُ بْنُ حُجْرٍ فَاَخَذَہٗ عَدُوٌّ لَّہٗ فَتَحَرَّجَ الْقَوْمُ اَنْ یَّحْلِفُوْا وَ حَلَفْتُ اَنَّہٗ اَخِیْ فَخَلّٰی سَبِیْلَہٗ فَاَتَیْنَا رَسُوْلَ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم فَاَخْبَرْتُہٗ اَنَّ الْقَوْمَ تَحَرَّجُوْا اَنْ یَّحْلِفُوْا وَ حَلَفْتُ اَنَّہٗ اَخِیْ فَقَالَ: صَدَقْتَ، اَلْمُسْلِمُ اَخُو الْمُسْلِمِ لَا یَظْلِمُہٗ وَلَا یَخْذُلُہٗ وَلَا یُسْلِمُہٗ۔

(ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت سوید بن حنظلہؓ کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری کے ارادے سے نکلے۔ ہمارے ساتھ وائل بن حجر بھی تھے۔ انھیں (راستے میں) ان کے ایک دشمن نے پکڑ لیا۔ لوگوں کو قسم کھانے میں کچھ تامّل ہوا مگر میں نے قسم کھالی کہ وہ میرا بھائی ہے۔ اس لیے اس نے انھیں چھوڑ دیا پھر جب ہم رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو میں نے آپؐ کو اس کی اطلاع کی کہ ان لوگوں کو تو قسم کھانے میں تامّل ہوا مگر میں نے قسم کھالی۔ کہ وہ میرا بھائی ہے۔ آپؐ نے فرمایا: "تم نے سچ کہا، مسلمان مسلمان کا بھائی ہی ہوتا ہے، وہ نہ اس کی حق تلفی کرتا ہے، نہ وقت پر اس کی مدد کرنے سے گریز کرتا ہے اور نہ اسے (کسی مصیبت وغیرہ میں) گرفتار کر سکتا ہے۔"

گم راہی

﴿۱﴾ عَنْ صَفِیَّۃَ قَالَتْ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم: اِنَّ الشَّیْطَانَ یَجْرِیْ مِنَ الْاِنْسَانِ مَجْرَی الدَّمِ۔

(ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت صفیہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: شیطان انسان (کی رگوں) میں اس طرح پھرتا ہے جیسے خون گردش کرتا ہے۔“

تشریح: یہ ایک اہم روایت کا حصہ ہے۔ حضور ﷺ ایک رات اپنی اہلیہ محترمہ حضرت صفیہؓ کے ساتھ گزر رہے تھے۔ راہ میں انصار کے دو شخص ملے۔ انھوں نے آپؐ کو دیکھا تو تیز تیز چلنے لگ گئے۔ آپؐ نے فرمایا کہ اپنی چال چلو (تیز نہ چلو) یہ صفیہ بنت حُیَیؔ ہیں۔ (جو میری بیوی ہیں۔ کوئی غیر عورت میرے ساتھ نہیں ہے) انھوں نے کہا کہ سُبْحَانَ اللّٰہِ یارسول اللہ (یعنی معاذ اللہ، کیا آپؐ کے بارے میں ہمیں کوئی بدگمانی ہوسکتی ہے؟) اس پر آپؐ نے فرمایا کہ شیطان آدمی کی رگوں میں خون کی طرح گردش کرتا ہے۔“ مطلب یہ ہے کہ مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں شیطان کو یہ موقع نہ مل جائے کہ وہ تمھارے دلوں میں کوئی برا خیال ڈال دے۔

معلوم ہوا کہ شیطان کی کوشش ہی یہ ہوتی ہے کہ وہ انسان کو گناہ اور برائی میں مبتلا کرے۔ وہ اپنے کام میں پوری طرح لگا ہوا ہے۔ خون کی گردش انسان کو زندہ رکھتی ہے۔ شیطان اپنی تدابیر میں کامیاب ہوکر انسان کے ذہن وفکر اور اس کے رجحانات تک کو متاثر کرسکتا ہے۔ اس طرح انسان کی ذہنی واخلاقی صحت تباہ وبرباد ہوسکتی ہے ایک حدیث میں آیا ہے کہ میری امت میں ایسے لوگ پیدا ہوں گے جن میں گم راہیاں اس طرح سما جائیں گی جیسے ’کلب‘ انسان کی رگ رگ اور جوڑوں میں سما جاتی ہے۔ کلب ایک بیماری ہے جو دیوانے کتے کے کاٹنے سے پیدا ہوتی ہے۔

گناہ

〈۱〉 **عَنْ عَبْدِ اللّٰہِؓ قَالَ قُلْتُ: یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ، اَیُّ الذَّنْبِ اَعْظَمُ؟ قَالَ: اَنْ تَجْعَلَ لِلّٰہِ نِدًّا وَ ھُوَ خَلَقَکَ، ثُمَّ قَالَ: اَیٌّ؟ قَالَ: اَنْ تَقْتُلَ وَلَدَکَ خَشْیَۃَ اَنْ یَّاْکُلَ مَعَکَ، قَالَ ثُمَّ اَیٌّ؟ قَالَ: تَزْنِیَ حَلِیْلَۃَ جَارِکَ۔** (بخاری)

ترجمہ: حضرت عبداللہؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسولؐ، کون سا گناہ سب سے بڑا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ” یہ کہ تم کسی کو اللہ کا مدِ مقابل بناؤ حالاں کہ اللہ ہی نے تم کو پیدا فرمایا ہے۔“ پوچھا، پھر کون سا؟ آپؐ نے فرمایا: ” یہ کہ تم اپنی اولاد کو اس خوف سے قتل کرو کہ

وہ کھانے میں تمھاری شریک ہوگی۔" پوچھا پھر کون سا؟ آپؐ نے فرمایا: "یہ کہ تم اپنے پڑوسی کی بیوی سے زنا کے مرتکب ہو۔"

تشریح: ان کبیرہ گناہوں کا قرآن میں بھی ایک ساتھ ذکر ہوا ہے: وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ ۚ وَ مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ۙ (الفرقان:۶۸) "اور جو لوگ اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو نہیں پکارتے، اور نہ کسی جان کو جسے اللہ نے حرام کیا ہے، قتل کرتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ حق کا تقاضا ہی یہی ہو، اور نہ وہ زنا کرتے ہیں۔ اور جو کوئی یہ کام کرے وہ گناہ کے وبال سے دوچار ہوگا۔"

گناہ آدمی کی بدطینتی کی دلیل ہوتا ہے۔ اور بڑے گناہ جنھیں کبائر کہتے ہیں۔ ان میں مبتلا رہنے والے تو خدا کے انتہائی نافرمان اور حق وانصاف کے دشمن ہوتے ہیں۔ ان پر خدا کا غصہ بھڑکتا ہے اور بالآخر ایسے لوگ حسرت واندوہ اور ایسے عذاب سے دوچار ہوں گے جس کا صحیح طور پر اندازہ کرنا بھی مشکل ہے۔ اسلام کی تعلیم اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ انسان خدا کے قہر وغضب سے بچے اور زندگی میں کوئی ایسی روش اختیار نہ کرے جو اس کے لیے موجب خسران وہلاکت ہو۔ وہ ایک طرف انسان کو حق سے آشنا کرتا ہے اور دوسری طرف اسے اس کی اپنی ذمہ داریوں سے آگاہ وباخبر کرتا ہے۔

(۲) وَ عَنْ مَالِكٍ اَنَّهُ بَلَغَهُ اَنَّ اُمَّ سَلَمَةَؓ زَوْجَ النَّبِيِّ ﷺ قَالَتْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَنُهْلَكُ وَ فِيْنَا الصَّالِحُوْنَ؟ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: نَعَمْ اِذَا كَثُرَ الْخَبَثُ۔ (موطا امام مالک)

ترجمہ: امام مالکؒ بیان کرتے ہیں کہ انھیں یہ روایت پہنچی کہ حضرت ام سلمہؓ نے جو نبی ﷺ کی اہلیہ تھیں، کہا کہ یارسول اللہ کیا ہم اس وقت بھی تباہ ہوں گے جب کہ ہمارے درمیان نیک لوگ موجود ہوں گے؟ آپؐ نے فرمایا: "ہاں، اس وقت جب کہ گناہوں کی کثرت ہو جائے۔"

تشریح: یعنی جب خباثت اور برائیوں کی کثرت ہو جاتی ہے تو اس کا قوی اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے کہ قوم پر خدا ہلاکت نازل کر دے۔ ایسی صورت میں نیک لوگ بھی اس ہلاکت کی زد میں آسکتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ آخرت میں ان کا حشر نافرمانوں اور خدا کے باغیوں کے ساتھ نہ ہو۔ لیکن دنیا میں جب عام تباہی آتی ہے تو قوم کے نیک لوگوں کا اس سے بچ سکنا مشکل ہوتا ہے۔ اور اگر نیک اور صالح لوگ قوم کو برائی اور اس کے برے انجام سے ڈرانے اور اس کو راہِ راست پر لانے کی کوشش سے بے پروا رہے ہوں تو پھر وہ اپنی اس کوتاہی کی سزا سے کیوں کر بچ سکیں گے۔

بدذوقی

کبر

﴿۱﴾ عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ لاَ یَدْخُلُ الْجَنَّۃَ مَنْ کَانَ فِیْ قَلْبِہٖ مِثْقَالُ ذَرَّۃٍ مِّنْ کِبْرٍ۔ فَقَالَ رَجُلٌ: اِنَّ الرَّجُلَ یُحِبُّ اَنْ یَّکُوْنَ ثَوْبُہٗ حَسَنًا وَ نَعْلُہٗ حَسَنًا! قَالَ: اِنَّ اللّٰہَ جَمِیْلٌ یُحِبُّ الْجَمَالَ۔ اَلْکِبْرُ بَطَرُ الْحَقِّ وَ غَمْطُ النَّاسِ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ”جنت میں وہ شخص داخل نہ ہوگا جس کے دل میں ذرّہ برابر بھی کبر و غرور ہوگا۔“ ایک شخص نے عرض کیا کہ آدمی پسند کرتا ہے کہ اس کا کپڑا اچھا ہو اور اس کا جوتا اچھا ہو۔ آپؐ نے فرمایا: ”اللہ جمیل ہے، جمال کو پسند کرتا ہے۔ کبر تو حق کے مقابلے میں اترانے اور لوگوں کو حقیر سمجھنے کا نام ہے۔“

تشریح: اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جنت کس درجہ پاک اور ستھرا مقام ہے۔ جنت میں کسی قسم کی گندگی اور کثافت کا گزر نہیں ہوسکتا خواہ وہ گندگی بہ ظاہر مقدار میں کتنی ہی کم کیوں نہ ہو۔ کبر بھی ایک اخلاقی گندگی اور نحوست ہے۔ اس نحوست کو لیے ہوئے کوئی شخص جنت میں داخل نہیں ہوسکے گا۔ اہلِ جنت وہی لوگ ہیں جو کسی گندگی سے ذرا بھی آلودہ نہ ہوں۔

اگر کوئی شخص جائز حدود کے اندر لباس اور رہائش میں زیبائش اور خوش ذوقی کا لحاظ رکھتا ہے تو اسے کبر پر محمول نہیں کریں گے۔ خدا خود صاحبِ جمال و کمال ہے۔ اور جمال کو پسند فرماتا ہے۔ دنیا میں جہاں کہیں بھی اور جس شکل میں بھی حسن و جمال پایا جاتا ہے وہ درحقیقت خدا ہی کے جمال و کمال کا مظہر ہے۔

یہاں یہ بات پیشِ نظر رہے کہ زندگی میں حسن و جمال ظاہر اور باطن دونوں ہی پہلوؤں سے مطلوب ہے۔ ہمارے ظاہری رہن سہن، وضع اور لباس وغیرہ میں بھی کسی بدنمائی اور بے ڈھنگے پن کا مظاہرہ نہیں ہونا چاہیے اور ہمارے افکار و اعمال کے ذریعہ سے بھی حسن و جمال ہی کا اظہار ہونا چاہیے۔ جس چیز کو عام بول چال میں ہم مذہب کہتے ہیں، گہرائی میں جانے کے بعد وہی چیز جمالیاتی تجربہ اور جمالیاتی احساس و شعور بن جاتی ہے۔

یہ حدیث یہ بتاتی ہے کہ حقیقت کے لحاظ سے کبر یہ ہے کہ آدمی کو حق کی پروا نہ ہو اور وہ لوگوں کو نگاہ حقارت سے دیکھتا ہو۔ یہ چیز اس کے باطن کی خباثت کی بیّن دلیل ہوگی۔ اگر کوئی شخص اپنی زندگی میں ایسا طرزِ عمل اختیار کرتا ہے جس میں خدا کے حقوق اور حق و صداقت کا لحاظ نہیں رکھا گیا ہے یا اس کے رہن سہن کے انداز، اس کی اپنی آرائش و زیبائش وغیرہ کے پیچھے یہ جذبہ کام کرتا ہے کہ دوسرے اسے بڑا سمجھیں اور اس کے آگے اپنے کو کم تر جانیں تو یہ روش صریحاً کبر و نخوت کی روش ہے جسے کسی صورت میں بھی صحیح اور درست نہیں کہا جا سکتا۔ اپنی اس روش کے ساتھ وہ کبھی بھی اس حقیقی عظمت کو حاصل نہیں کر سکتا جو عمر بھر اس کی منتظر رہتی ہے۔

(۲) وَ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ثَلاَثَةٌ لاَ یُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَلاَ یُزَكِّیْهِمْ، وَ فِیْ رِوَایَةٍ: وَلاَ یَنْظُرُ اِلَیْهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ شَیْخٌ زَانٍ وَ مَلِكٌ كَذَّابٌ وَ عَآئِلٌ مُّسْتَكْبِرٌ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ”تین آدمی ایسے ہیں کہ قیامت کے روز خدا ان سے بات نہ کرے گا اور نہ ان کا تزکیہ فرمائے گا“ اور ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ ”وہ ان کی طرف نگاہ بھی نہ کرے گا۔“ اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ ایک بوڑھا زناکار، دوسرا جھوٹا فرماں روا، تیسرا مفلس و غریب متکبر۔“

تشریح: مطلب یہ ہے کہ خدا ایسے لوگوں سے اس قدر ناراض اور ناخوش ہوگا کہ وہ انھیں اس قابل ہی نہ سمجھے گا کہ انھیں اپنی ہم کلامی کا شرف بخشے یا نگاہِ لطف سے انھیں دیکھے یا ان کو مزکّٰی قرار دے اور ان کی تحسین فرمائے۔

زنا ہر حالت میں ایک قبیح فعل ہے لیکن بڑھاپے کی عمر میں جب کہ شہوانی جذبات بڑی

حد تک سرد ہو چکے ہوتے ہیں، اگر کوئی زنا کا مرتکب ہوتا ہے تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کی طبیعت میں حد درجہ خباثت پائی جاتی ہے...اسی طرح جھوٹ بولنا ہر ایک کے لیے معیوب ہے لیکن ایک فرماں روا کے لیے تو یہ موت سے کم نہیں۔ اس لیے کہ آدمی جھوٹ کبھی حصول نفع کے لیے بولتا ہے اور کبھی دفعِ ضرر کی غرض سے اس کا مرتکب ہوتا ہے۔ ایک حاکم اور فرماں روا کو اس کی کیا حاجت ہے کہ وہ جھوٹ کا سہارا لے۔ ایک فرماں روا کی ذمّہ داری تو یہ ہے کہ وہ انتظامِ مملکت اور عام لوگوں کے مسائل کی فکر رکھے اور اس بات کے لیے کوشاں ہو کہ پبلک کو زیادہ سے زیادہ سہولت پہنچ سکے اور وہ امن و عافیت کے ساتھ رہ سکے۔ اب اگر حاکم اتنا گرا ہوا ہے کہ جھوٹ تک بولنے سے اسے عار نہیں ہوتا تو اپنی سلطنت میں خیر اور بھلائی کو فروغ دینے میں وہ کیوں کر کامیابی حاصل کر سکے گا۔

اسی طرح کبر اور غروریوں تو کسی کے لیے بھی زیبا نہیں لیکن ایک مفلس اور نادار شخص اگر کبر میں مبتلا ہو تو یہ انتہائی دناءت اور کمینگی کی بات ہوگی۔ اس لیے کہ اس کے یہاں سرے سے کوئی ایسی چیز نہیں پائی جاتی جس کی بنا پر وہ کبر میں مبتلا ہو۔ اس کے باوجود اگر وہ متکبر ہے تو اسے اس کی ذہنی خباثت اور پستی کے سوا کسی اور چیز سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔

﴿۳﴾ وَ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ اللّٰهُ تَعَالٰى: اَلْكِبْرِيَآءُ رِدَآئِيْ، وَالْعَظْمَةُ اِزَارِيْ فَمَنْ نَازَعَنِيْ وَاحِدًا مِّنْهُمَا اَدْخَلْتُهُ النَّارَ وَ فِيْ رِوَايَةٍ قَذَفْتُهُ فِي النَّارِ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ”بزرگی میری چادر ہے اور عظمت میرا ازار (تہ بند) ہے۔ پس جو شخص ان میں سے کسی ایک کو بھی مجھ سے چھیننا چاہے تو میں اسے دوزخ کی آگ میں ڈالوں گا۔“ اور ایک روایت میں ہے کہ ”میں اسے دوزخ کی آگ میں پھینک دوں گا۔“

تشریح: اس حدیث میں مثال کے ذریعہ سے ایک بڑی حقیقت کو ذہن نشین کرانے کی کوشش کی گئی ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ کبریائی اور عظمت خدا کی ایسی صفتیں ہیں جو اسی کے لیے خاص ہیں۔ بندوں کے لیے جو چیز زیب دیتی ہے وہ عظمت و بزرگی نہیں بل کہ وہ عجز و نیاز ہے۔

جو شخص تکبر کرے اور بڑا بننا چاہے اور عظمت و بزرگی کا دعوے دار ہو۔ وہ میری چادر یا تہ بند چھینا چاہتا ہے۔

﴿۴﴾ عَنْ حَارِثَةَ بْنِ وَهْبٍؓ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: اَلَا اُخْبِرُكُمْ بِاَهْلِ النَّارِ؟ كُلُّ عُتُلٍّ جَوَّاظٍ مُسْتَكْبِرٍ۔ (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت حارث بن وہبؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو سنا، آپؐ فرماتے تھے: ''کیا میں تمھیں خبر دوں کہ اہلِ دوزخ کون ہیں؟ ہر سرکش، درشت خو، متکبر۔''

تشریح: یعنی سرکشی، درشت خوئی اور کبر یہ ایسی بری خصلتیں ہیں جن کی وجہ سے آدمی کا شمار اہلِ دوزخ میں ہوتا ہے۔ اب اگر وہ اپنی اصلاح کی طرف توجہ نہیں دیتا تو خدا کے غضب سے اسے بچانے والی کوئی چیز نہ ہوگی۔ قرآن میں بھی مختلف مقامات پر اس بات کا اعلان کر دیا گیا ہے کہ متکبروں کا ٹھکانا جہنم ہی ہوگا۔ مثلاً قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اُدْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ۝ (المومن: ۷۲) ''جہنم کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ، اس میں مستقل رہنے کے لیے، پس بہت ہی برا ٹھکانا ہے متکبروں کا!''

قوموں کے کفر و انکار کے پیچھے اکثر سرکشی اور استکبار ہی کا جذبہ کام کرتا رہا ہے۔ استکبار کی وجہ سے کتنی ہی قومیں دولتِ ایمان سے یکسر محروم رہیں۔ انھوں نے اپنے رسولوں کا انکار کیا۔ دنیا میں بھی وہ خدا کے غضب میں گھر کر رہیں اور آخرت میں جہنم ہی کا ایندھن بن کر رہیں گی۔

﴿۵﴾ وَ عَنْ مُعَاوِيَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَنْ سَرَّهٗ اَنْ يَّتَمَثَّلَ لَهُ الرِّجَالُ قِيَامًا فَلْيَتَبَوَّاْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ۔ (ترمذی، ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت معاویہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جو شخص اس سے مسرور ہو اور یہ پسند کرے کہ لوگ اس کے سامنے کھڑے رہیں تو اسے چاہیے کہ وہ دوزخ میں اپنی نشست کی جگہ تیار کرے۔''

تشریح: یہ امر بہ معنی خبر کے ہے یعنی اس کے لیے دوزخ میں داخل ہونا لازم ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جو شخص کبر و نخوت کی بنا پر اس بات کا خواہاں رہتا ہے کہ لوگ اس کی تعظیم میں جھکیں

اور اس کے آگے دست بستہ کھڑے ہوں اسے سمجھ لینا چاہیے کہ اس کی جگہ خدا کے یہاں جنت نہیں، نارِ جہنم ہے۔ دوزخ کی بھڑکتی ہوئی آگ اسے بتادے گی کہ وہ عزت والا ہے یا ذلیل۔

عجب وخود پسندی

(۱) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ ؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: ثَلَاثٌ مُّنْجِیَاتٌ وَ ثَلَاثٌ مُّهْلِكَاتٌ، فَاَمَّا الْمُنْجِیَاتُ فَتَقْوَی اللّٰهِ فِی السِّرِّ وَالْعَلَانِیَةِ وَالْقَوْلُ بِالْحَقِّ فِی الرِّضَا وَالسَّخَطِ، وَالْقَصْدُ فِی الْغِنَا وَالْفَقْرِ، وَ اَمَّا الْمُهْلِكَاتُ فَهَوًی مُّتَّبَعٌ وَّ شُحٌّ مُّطَاعٌ وَّ اِعْجَابُ الْمَرْءِ بِنَفْسِهٖ وَ هُوَ اَشَدُّهُنَّ۔ (البیہقی فی شعب الایمان)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”تین چیزیں نجات دینے والی اور تین ہلاکت میں ڈالنے والی ہیں۔ نجات دینے والی چیزیں یہ ہیں: چھپے اور کھلے اللہ کا ڈر رکھنا۔ خوشی کی حالت ہو یا ناراضی کی، ہر حال میں حق بات کہنی۔ اور ناداری ہو یا خوش حالی، ہر صورت میں اعتدال کی راہ اختیار کرنی۔ رہیں ہلاکت میں ڈالنے والی چیزیں تو وہ یہ ہیں: خواہش نفس جس کا کوئی تابع بن کر رہ جائے، وہ حرص اور بخل جس کا کوئی مطیع وفرماں بردار بن کر رہے اور آدمی کی خود پسندی۔ اور یہ ان سب میں زیادہ سخت ہے۔“

تشریح: غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تین چیزیں کہ آدمی ہر حال میں اللہ سے ڈرے، حق بات ہی کہے اور اعتدال پر قائم رہے، نہایت اہم اور بنیادی ہیں۔ ان کو اختیار کرنے کے بعد آدمی نہ صرف یہ کہ آخرت میں ہلاکت اور تباہی سے نجات پائے گا بل کہ دنیا میں بھی وہ مختلف قسم کے فتنوں اور پریشانیوں سے مامون رہ کر زیادہ سے زیادہ وقت حق کی خدمت کے لیے نکال سکے گا۔

شخصیتوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ جب بھی کسی شخص نے زندگی کی باگ ڈور خواہشاتِ نفسانی کے حوالہ کی اور تنگ دلی اور حرص وبخل اس کا مزاج بن گیا، اخلاقی زندگی اس کی ختم ہو کر رہی۔ ھُدَیٰ (خدا کی ہدایت اور رہ نمائی) کے مقابلہ میں جس کسی نے بھی ھَوَیٰ (خواہشِ نفس) کو ترجیح دی اور اعلیٰ ظرفی اور فیاضی کے مقابلہ میں تنگ دلی اور حرص وہوس کو اپنا شعار بنایا وہ نہ دنیا میں اپنا کوئی وزن قائم کرسکا اور نہ آخرت میں اس کا کوئی وزن ہوگا۔ ایسا شخص ہرگز کسی اعلیٰ اور عظیم مقصدِ حیات کا حامل نہیں ہوسکتا اور نہ اس سے انسانیت کی کسی بڑی خدمت

کی توقع کی جاسکتی ہے۔ فلاح اور کام یابی کے لیے ضروری ہے کہ آدمی کے دل میں فراخی اور اس کی نگاہ میں بلندی و وسعت ہو۔ قرآن میں ہے: وَ مَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ o (الحشر ۹، التغابن:۱۶) ''اور جو اپنے نفس کے حرص و بخل سے محفوظ رہا تو ایسے ہی لوگ کام یاب ہیں۔''

خود پسندی کو نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) سب سے بڑھ کر سنگین اور مہلک قرار دے رہے ہیں۔ ایک تو خود پسندی بہ ذات خود ایک نہایت گھناؤنی چیز ہے۔ دوسرے یہ کہ جس کسی شخص کے اندر خود پسندی کی بیماری پیدا ہو جاتی ہے اس کی اصلاح کی امید بہت کم کی جاسکتی ہے۔ خود پسندی ایک ایسا فریب ہے جس کے جال سے نکل پانا حد درجہ دشوار اور مشکل ہوتا ہے۔ خود پسندی میں مبتلا شخص کے لیے ہدایت کی راہیں عام طور پر مسدود ہوتی ہیں۔ وہ اپنی غلطیوں پر متنبہ نہیں ہوتا۔ نہ اس کے اندر کچھ جاننے اور سمجھنے کی طلب اور تڑپ باقی رہتی ہے۔

جسمانی توانائی یا صحت ہو یا مال و دولت یا اپنے زہد و تقویٰ کا زعم، وہ ان ہی پر نازاں ہوتا ہے اور یہی کبر اور خود پسندی اس کے جینے کا نفسیاتی سہارا بن جاتی ہے۔ ایسی صورت میں اس کی اصلاح کا کام کتنا دشوار اور مشکل ہوتا ہے۔ اس کا اندازہ ہر صاحبِ فکر و نظر بہ آسانی کرسکتا ہے۔

〈۲〉 وَ عَنِ الْمِقْدَادِؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم: اِذَا رَأَيْتُمُ الْمَدَّاحِيْنَ فَاحْثُوْا فِيْ وُجُوْهِهِمُ التُّرَابَ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت مقدادؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب تم مدح سرائی کرنے والوں کو دیکھو تو ان کے منہ پر خاک ڈال دو۔''

تشریح: یعنی ان کی مدح سرائی سے خوش مت ہو بل کہ اسے ناپسند کرو۔ اور اگر وہ تمھاری مدح سرائی کے ذریعہ سے اپنی کسی مادی منفعت کے لیے تم سے کوئی غلط کام کرانا چاہتے ہوں تو انھیں ان کے اس مقصد میں ہرگز کام یاب ہونے نہ دو۔

〈۳〉 وَ عَنْ اَبِيْ بَكْرَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم: لَا يَقُوْلَنَّ اَحَدُكُمْ اِنِّيْ صُمْتُ رَمَضَانَ كُلَّهٗ وَ قُمْتُهٗ كُلَّهٗ۔ (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت ابوبکرہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تم میں سے کوئی یہ نہ کہے کہ میں نے رمضان بھر روزے رکھے اور پورے ماہ قیام کیا۔''

تشریح: اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی پسندیدہ بات نہیں ہے کہ آدمی خود اپنی خوبیاں بیان کرتا پھرے اور اس میں مبالغہ سے کام لے۔ ایسا شخص اگر خود پسندی کے مرض میں مبتلا نہ بھی ہو جب بھی اس کا قوی امکان رہتا ہے کہ یہ مہلک مرض اس کے اندر پیدا ہو جائے۔

شہرت کی طلب

﴿۱﴾ عَنِ ابْنِ عُمَرؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَنْ لَبِسَ ثَوْبَ شُهْرَةٍ فِي الدُّنْيَا، اَلْبَسَهُ اللّٰهُ ثَوْبَ مَذِلَّةٍ يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ۔ (ترمذی، احمد، ابوداؤد، ابن ماجہ)

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جس کسی نے دنیا میں شہرت کا لباس زیب تن کیا، خدا اسے قیامت کے روز ذلّت کا لباس پہنائے گا۔''

تشریح: ابوداؤد میں حضرت ابن عمرؓ سے ایک روایت آئی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: مَنْ لَبِسَ ثَوْبَ شُهْرَةٍ اَلْبَسَهُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ثَوْبًا مِّثْلَهٗ زَادَ عَنْ اَبِيْ عَوَانَةَ ''ثُمَّ تَلْهَبُ فِيْهِ النَّارُ'' (جس کسی نے مشہور ہونے کی غرض سے کپڑا پہنا، قیامت کے روز خدا اسے ویسا ہی کپڑا پہنائے گا (ابوعوانہ کی روایت میں اتنا مزید ہے کہ) پھر اس میں آگ لگا دے گا۔''

کپڑا ہو یا جوتا وغیرہ کوئی بھی چیز آدمی اسے ضرورت سمجھ کر استعمال کرے نہ کہ لوگوں پر اپنی بڑائی جتانے کی غرض سے وہ اسے استعمال کرے اور اسے اظہارِ فخر کا ذریعہ بنائے۔ دنیا میں اگر کوئی شخص لباس اس مقصد سے پہنتا ہے کہ لوگوں میں اس کا نام ہو اور عوام کے دلوں پر اس کی عظمت و وجاہت کا سکّہ جم سکے، اسی طرح اگر کوئی اپنے تقدس اور روحانی پاک بازی کے اظہار کے لیے راہبوں اور درویشوں کا مخصوص لباس زیب تن کیے رہتا ہے تو خدا کو یہ انداز ہرگز پسند نہیں ہے کیوں کہ یہ خود بینی اور تکبر کی علامت ہے۔ ایسے لوگوں کو قیامت کے روز سخت ذلّت سے دوچار ہونا پڑے گا۔

یہاں یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ اسلامی تہذیب میں نہ مال دار طبقہ کے لیے

کوئی مخصوص لباس متعین کیا گیا ہے اور نہ کسی ایسے مذہبی طبقہ کو گوارا کیا گیا ہے جو اپنے آپ کو سب سے فائق، بہتر اور ممتاز سمجھتا ہو اور اپنے دینی تقدس کو باور کرانے کے لیے کوشاں رہتا ہو۔

﴿۲﴾ وَ عَنْ طَرِيفٍ اَبِی تَمِيمَةَ قَالَ: شَهِدْتُّ صَفْوَانَؓ وَ جُنْدُبًاؓ وَّ اَصْحَابَهٗ وَ هُوَ يُوْصِيهِمْ فَقَالُوْا: هَلْ سَمِعْتَ مِنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم شَيْئًا؟ قَالَ: سَمِعْتُهٗ يَقُوْلُ: مَنْ سَمَّعَ سَمَّعَ اللّٰهُ بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ. قَالَ: وَ مَنْ يُّشَاقِقْ يَشْقُقِ اللّٰهُ عَلَيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَقَالُوْا: اَوْصِنَا فَقَالَ: اِنَّ اَوَّلَ مَا يُنْتِنُ مِنَ الْاِنْسَانِ، بَطْنُهٗ فَمَنِ اسْتَطَاعَ اَنْ لَّا يَاْكُلَ اِلَّا طَيِّبًا فَلْيَفْعَلْ، وَ مَنِ اسْتَطَاعَ اَنْ لَّا يُحَالَ بَيْنَهٗ وَ بَيْنَ الْجَنَّةِ بِمِلْءِ كَفِّهٖ مِنْ دَمٍ اَهْرَاقَهٗ فَلْيَفْعَلْ. قُلْتُ لِاَبِی عَبْدِ اللّٰهِ: مَنْ يَّقُوْلُ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم؟ جُنْدُبٌ؟ قَالَ: نَعَمْ، جُنْدُبٌ. (بخاری)

ترجمہ: حضرت طریف ابوتمیمہؒ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں صفوانؓ اور جندبؓ اور ان کے ساتھیوں کے پاس موجود تھا۔ وہ لوگوں کو نصیحت کر رہے تھے۔ لوگوں نے دریافت کیا کہ کیا آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ سنا ہے؟ انھوں نے کہا کہ میں نے آپؐ کو فرماتے ہوئے سنا کہ ''جس کسی نے لوگوں کو سنانے کی غرض سے اور شہرت کی خواہش میں کچھ کیا تو اللہ قیامت کے روز اس کے پوشیدہ عیب ظاہر کرے گا۔ اور جس کسی نے کسی کو مشقت میں ڈالا تو اللہ قیامت کے دن اس پر مشقت کا بوجھ ڈال دے گا۔'' لوگوں نے عرض کیا کہ ہمیں مزید نصیحت فرمائیں تو آپؐ نے ارشاد فرمایا: ''سب سے پہلے انسان کا پیٹ سڑتا ہے۔ اس لیے جس کسی شخص کو یہ قدرت حاصل ہو کہ وہ پاک وطیب چیز ہی کھائے تو اسے چاہیے کہ وہ ایسا کرے۔ اور جو شخص یہ کرسکتا ہو کہ اس کے اور جنت کے درمیان اس کا بہایا چلو بھر خون بھی حائل نہ ہو تو اسے چاہیے کہ وہ ایسا ضرور کرے۔'' میں نے ابوعبداللہ سے کہا کہ کون کہتا ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے؟ کیا جندبؓ نے کہا ہے؟ انھوں نے کہا کہ ہاں، جندبؓ نے کہا ہے۔''

تشریح: جو کوئی شہرت کا بھوکا ہے تو اسے جان لینا چاہیے کہ عزت اور ناموری اسے ملتی ہے جس کو خدا عطا فرمائے۔ عزت درحقیقت خدا کی عظمت کے آگے اپنے آپ کو جھکا دینے ہی میں ہے۔ جو شخص اسے کسی اور طریقہ سے حاصل کرنے کے لیے کوشاں ہے تو خدا اسے ذلیل و رسوا

کر کے رہے گا۔ اس لیے کہ دنیا میں اس نے خدا کے جلال اور اس کی عظمت کا کچھ بھی پاس ولحاظ نہ کیا۔ اگر صحیح معنی میں دنیا کی زندگی میں اسے خدا کی عظمت اور اس کی بزرگی کا احساس ہوتا تو اسے سرے سے اپنی شہرت کا خیال بھی نہ آتا۔

خدا کو اپنے بندوں سے پیار ہے۔ اب اگر کوئی بندگانِ خدا میں سے کسی کو تکلیف پہنچاتا ہے اور اسے کسی مشقت وکلفت میں مبتلا کرتا ہے تو خدا اسے بھی قیامت کے دن سخت مشقت میں ڈال کر رہے گا۔ غرضیکہ دنیا میں انسان کا اپنا جیسا کردار ہوگا اسی کے مطابق آخرت کی زندگی میں اسے جزا وسزا حاصل ہوگی۔ اس اصول کی روشنی میں ہر ایک شخص بہ آسانی یہ اندازہ کرسکتا ہے کہ وہ اپنے لیے کس طرح کی آخرت چاہتا ہے۔

غافل اور حق ناآشنا شخص کو سب سے بڑھ کر فکر اپنا پیٹ بھرنے کی ہوتی ہے۔ حالاں کہ آدمی کے مرنے کے بعد تمام اعضاء میں سب سے پہلے اس کا پیٹ ہی سڑتا ہے۔ یہ اکل وشرب کی لذتیں نہایت عارضی ہیں۔ انسان عارضی لذات کے حصول کے لیے ہرگز پیدا نہیں کیا گیا ہے۔ اس کی فطرت تو اس چیز کی تلاش میں رہا کرتی ہے جو عارضی نہ ہو بل کہ باقی رہنے والی ہو۔ اور باقی رہنے والی نعمتوں کا مستحق انسان اسی صورت میں ہوسکتا ہے جب کہ وہ حساس، نیک سیرت اور تقویٰ شعار ہو۔ اسی لیے فرمایا کہ انسان کو چاہیے کہ وہ پاک وطیب غذا سے ہی اپنا پیٹ بھرے۔ اور وہ شخص بڑا ہی خوش قسمت ہے جس کو یہ توفیق حاصل ہو کہ وہ اپنا پیٹ حلال اور پاک رزق اور صرف حلال اور پاک رزق سے بھرے۔

ظالم کا ظلم اسے جنت میں داخل ہونے سے روک دے گا۔ مظالم میں قتل، یا خون ریزی اتنا بڑا ظلم ہے جس کے ظلم اور جفا ہونے سے کسی کو بھی انکار نہیں ہوسکتا۔ قتل اور خون کی سنگینی ہی ہے جس کی وجہ سے قیامت میں سب سے پہلے لوگوں کے درمیان قتل کے معاملات کے فیصلے سنائے جائیں گے۔ (بخاری، مسلم)

اب جو شخص بھی جنت کا جو خدا کی رضا اور اس کی رحمت کی سب سے بڑی مظہر ہے خواہاں ہو اسے لازماً قتل وخوں ریزی سے اپنا ہاتھ روک رکھنا چاہیے۔ اور جس کسی کو یہ توفیق ملے کہ وہ ظلم وستم اور ناحق خون بہانے سے باز رہے، وہ بلاشبہ عاقبت اندیش اور سعادت مند ہے۔

﴿۳﴾ وَ عَنْ اَبِیْ ذَرٍّ ؓ قَالَ: قِیْلَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ: اَرَاَیْتَ الرَّجُلَ یَعْمَلُ الْعَمَلَ

مِنَ الْخَيْرِ وَ يَحْمَدُهُ النَّاسُ عَلَيْهِ وَ فِي رَوَايَةٍ: وَ يُحِبُّهُ النَّاسُ عَلَيْهِ. قَالَ: تِلْكَ عَاجِلُ بُشْرَى الْمُؤْمِنِ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ آپؐ اس شخص کے بارے میں کیا خیال رکھتے ہیں جو اچھا عمل کرتا ہے اور لوگ اس کی وجہ سے اس کی تعریف کرتے ہیں؟ ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ اس (نیک عمل) کی وجہ سے لوگ اس سے محبت کرتے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: ''یہ تو مومن کے لیے نقد اور فوری بشارت ہے۔''

تشریح: شہرت پسندی کی مذمت کی وجہ سے صحابۂ کرامؓ کو یہ اندیشہ ہوا کہ نیک اور اچھے عمل پر کسی کی تعریف کرنے یا اس سے محبت کرنے کی وجہ سے کہیں وہ نیک عمل ضائع ہو کر نہ رہ جائے اور آخرت میں اسے اس کا کوئی اجر و ثواب حاصل نہ ہو سکے اور کہہ دیا جائے کہ تمھیں اپنے عمل کا صلہ دنیا میں مل چکا ہے، آخرت میں اس کا کوئی اجر و ثواب تمھیں نہیں ملے گا۔ اسی لیے صحابہؓ نے اس سلسلہ میں نبی (ﷺ) سے وضاحت کی درخواست کی۔

معلوم ہوا کہ یہ تو ایک نقد اور فوری طور پر حاصل ہونے والا صلہ ہے جو خدا کے فضل و کرم سے بشارت کی شکل میں مردِ مومن کو حاصل ہوتا ہے۔ یہ درحقیقت اس بندہ کی مقبولیت و محبوبیت کی ایک مسرت بخش علامت ہے۔ یہ بشارت تو فوراً حاصل ہو جاتی ہے۔ اصل صلہ اور اجر وثواب جو اسکیم کے تحت اس کے لیے مقرر ہے، وہ اپنی جگہ محفوظ ہے اور وہ اسے آخرت کی زندگی میں حاصل ہوگا۔ اس نقد انعام کی وجہ سے نہ تو اس کا عمل باطل ہوگا اور نہ اس سے اس کے اجر و ثواب میں کسی قسم کی کوئی کمی کی جائے گی۔ عمل کے پیچھے اگر اخلاص کام کر رہا ہے تو اس طرح کی چیزوں سے کسی کا عمل ہرگز ضائع اور برباد نہیں ہوتا۔

تصنع

⟨۱⟩ عَنْ اَبِیْ ثَعْلَبَةَ الْخُشَنِیِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: اِنَّ اَحَبَّكُمْ اِلَیَّ وَ اَقْرَبَكُمْ مِنِّیْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اَحَاسِنُكُمْ اَخْلَاقًا، وَ اِنَّ اَبْغَضَكُمْ اِلَیَّ وَ اَبْعَدَكُمْ مِنِّیْ مَسَاوِیْكُمْ اَخْلَاقًا، اَلثَّرْثَارُوْنَ وَالْمُتَشَدِّقُوْنَ وَالْمُتَفَیْهِقُوْنَ۔ (البیہقی فی شعب الایمان)

ترجمہ: حضرت ابی ثعلبہ خشنیؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تم میں

مجھے سب سے زیادہ محبوب اور سب سے زیادہ مجھ سے قریب قیامت کے روز وہ لوگ ہوں گے جو اخلاق کے لحاظ سے تم میں سب سے بہتر ہیں۔ اور تم میں مجھے سب سے زیادہ ناپسند اور سب سے زیادہ مجھ سے دور وہ لوگ ہوں گے جو تم میں اخلاق میں برے ہیں، جو بہت زیادہ باتیں بنانے والے اور بغیر احتیاط و احتراز کے باتوں کو طول دینے والے اور تکبر سے منہ پھلا پھلا کر باتیں کرنے والے ہیں۔''

تشریح: ایک روایت میں ہے کہ صحابہؓ نے عرض کیا: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، قَدْ عَلِمْنَا الثَّرْثَارُوْنَ وَالْمُتَشَدِّقُوْنَ فَمَا الْمُتَفَيْهِقُوْنَ؟ قَالَ الْمُتَكَبِّرُوْنَ (ترمذی) ''یا رسول اللہ، ہم نے ثرثارون اور متشدقون کو جان لیا، یہ متفیہقون کون لوگ ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: ''تکبر کرنے والے۔''

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کسی کی بے فائدہ بکواس اور طول طویل فضول گفتگو اور گفتگو میں بے جا تصنع و تکلف اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اخلاق کے لحاظ سے نہایت گرا ہوا شخص ہے۔ ایسا شخص قیامت کے روز خدا کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نگاہ میں حد درجہ مبغوض ہوگا۔ پھر وہ آپؐ کی معیت اور آپؐ کا قرب کیوں کر حاصل کر سکے گا۔

خود غرضی

﴿۱﴾ عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم لَا تَسْأَلِ الْمَرْأَةُ طَلَاقَ اُخْتِهَا لِتَسْتَفْرِغَ صَحْفَتَهَا وَلِتَنْكِحَ، فَاِنَّ لَهَا مَا قُدِّرَ لَهَا. (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''کوئی عورت اپنی بہن کی طلاق کا مطالبہ نہ کرے کہ اس کے پیالے کو خالی کر دے اور خود شادی کر لے، کیوں کہ اسے وہی ملے گا جو اس کے لیے مقدر ہے۔''

تشریح: یعنی عورت شادی کے لیے کسی کے سامنے یہ شرط ہرگز نہ رکھے کہ تم پہلے اپنی بیوی کو طلاق دے دو تو مجھ سے شادی رچا سکتے ہو۔ یہ نہایت خود غرضی اور بے مروتی کی بات ہوگی جس کی اسلام میں قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے اس کے لیے یہ قطعاً جائز نہیں کہ اس سے اس کے شوہر کو چھین لے اور اس طرح کا اس کا حق مار کر سب کچھ اپنے لیے سمیٹ لے۔

وہ نکاح کرنا چاہتی ہے تو کر لے، جو کچھ اس کے لیے مقدر ہے وہ اس کو مل کر رہے گا۔ اس لیے اپنی مسلمان بہن کو نقصان پہنچانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

نفس پرستی

(۱) عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ اَنَّ النَّبِیَّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: اَوَّلُ صَلَاحِ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اَلْيَقِيْنُ وَالزُّهْدُ وَ اَوَّلُ فَسَادِهَا اَلْبُخْلُ وَالْاَمَلُ۔ (البیہقی فی شعب الایمان)

ترجمہ: حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد، وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ''اس امت کی پہلی اصلاح یقین اور زہد کی وجہ سے ہوئی اور اس کی سب سے پہلی خرابی و بربادی بخل اور دراز امیدوں کے سبب سے ہوگی۔''

تشریح: اس حدیث میں امتِ مسلمہ کی صلاح و فلاح کے اصل راز اور اس کے بگاڑ کے اصل سبب پر روشنی ڈالی گئی ہے جس سے صرف نظر کر کے امت نہ کبھی کام یابی سے ہم کنار ہو سکتی ہے اور نہ بگاڑ اور فساد سے اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکتی ہے۔ یقین و زہد جب تک اس امت کا اجتماعی کیریکٹر نہ ہو، وہ کبھی نہ تو اپنے اصل منصب پر قائم رہ سکتی ہے اور نہ اس ذمہ داری کو کما حقہ ادا کر سکتی ہے جو خدا کی جانب سے اسے سونپی گئی ہے۔

زہد درحقیقت یقین کا ثمرہ ہوتا ہے۔ آدمی کا یقین جتنا زیادہ خدا اور اس کے کیے ہوئے وعدہ پر اور اخروی کامرانیوں پر بڑھتا جاتا ہے، اتنا ہی زیادہ دنیا اور اس کی مادی منفعتیں اس کی نگاہ میں بے وقعت ہوتی جاتی ہیں۔ اس نگاہ میں اصل چیز خدا کی رضا کا حصول یا پھر کردار کی بلندی ہوتی ہے۔ جن افراد میں یقین و ایمان اور زہد کی صفت پیدا ہو جاتی ہے ان کو راہِ حق سے ہٹانا ممکن نہیں ہوتا۔ وہ ہر خوف اور ہر لالچ اور طمع سے بے نیاز ہو کر راہِ راست پر گام زن ہوتے ہیں۔ مستیِ کردار ان کا اصل سرمایہ ہوتا ہے جو انھیں ہر چیز سے غنی رکھتا ہے۔

بخل اور لمبی امیدیں اور خواہشیں درحقیقت ایمان و زہد کے منافی چیزیں ہیں جن لوگوں میں بخل کی بیماری پائی جاتی ہو اور جو زیادہ سے زیادہ جینے کی امید اور آرزو میں مرے جاتے ہوں وہ کبھی بھی اس کردار کے حامل نہیں ہو سکتے جو دین میں مطلوب ہے۔ اور جس میں جان و مال کے زیاں کا اندیشہ بھی ہو سکتا ہے۔ جب امت کے اندر بخل و امل اور حرص و آز کی بیماری راہ پالے

تو سمجھ لینا چاہیے کہ اس کی بربادی اور تباہی کے دن قریب آگئے۔ اس تباہی سے بچنے کی ایک صورت رہتی ہے کہ امت کے اندر سے اس اخلاقی بیماری کو دور کیا جائے اور اس کے اندر اعلیٰ کردار کی روح دوبارہ پھونکی جائے۔

﴿۲﴾ وَ عَنْ جَابِرٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: اِنَّ اَخْوَفَ مَآ اَتَخَوَّفُ عَلٰی اُمَّتِی الْھَوٰی وَ طُوْلَ الْاَمَلِ فَاَمَّا الْھَوٰی فَیَصُدُّ عَنِ الْحَقِّ وَ اَمَّا طُوْلُ الْاَمَلِ فَیُنْسِی الْاٰخِرَۃِ وَ ھٰذِہِ الدُّنْیَا مُرْتَحِلَۃٌ ذَاھِبَۃٌ وَ ھٰذِہِ الْاٰخِرَۃُ مُرْتَحِلَۃٌ قَادِمَۃٌ وَ لِکُلِّ وَاحِدَۃٍ مِّنْھُمَا بَنُوْنٌ فَاِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ لَّا تَکُوْنُوْا مِنْ بَنِی الدُّنْیَا فَافْعَلُوْا فَاِنَّکُمُ الْیَوْمَ فِیْ دَارِ الْعَمَلِ وَلاَ حِسَابَ وَ اَنْتُمْ غَدًا فِیْ دَارِ الْاٰخِرَۃِ وَلاَ عَمَلَ۔

(البیہقی فی شعب الایمان)

ترجمہ: حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جن چیزوں کا مجھے اپنی امت کے لیے خوف واندیشہ ہے ان میں ان دو سے مجھے ڈر ہے: خواہشِ نفس اور درازیِ امید۔ خواہشِ نفس حق سے باز رکھتی ہے اور درازیِ امید آخرت کو بھلا دیتی ہے۔ اور یہ دنیا کوچ کرنے والی، جانے والی ہے اور یہ آخرت آگے بڑھنے والی آنے والی ہے۔ اور ان دونوں میں سے ہر ایک کے فرزند ہیں۔ پس اگر تم سے ہو سکے کہ تم دنیا کے فرزند نہ ہو تو ایسا کرو کیوں کہ آج تم دار العمل میں ہو جہاں حساب نہیں لیکن کل تم دارِ آخرت میں ہو گے وہاں عمل نہیں ہوگا۔“

تشریح: خواہش پرستی اور لمبی لمبی امیدوں سے ہمیں سب سے زیادہ احتراز کرنا چاہیے۔ خرابیاں یوں تو اور بھی ہیں لیکن یہ دو چیزیں ایسی ہیں کہ ان کے نتائج انتہائی ہول ناک اور ہلاکت خیز ہوتے ہیں۔ خواہش پرست انسان کو حق اور ناحق کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی۔ اسے تو صرف اپنی ذاتی خواہشات اور ذاتی اغراض ہی عزیز ہوتے ہیں۔ وہ زیادہ سے زیادہ دنیا میں رہنے اور دنیوی منفعتوں سے زیادہ سے زیادہ بہرہ مند ہونے کی فکر میں جیتا ہے۔ وہ نہیں سمجھتا کہ زندگی کا اس سے بلند بھی کوئی مقصد ہو سکتا ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ آخرت اور اس کی کامیابی بھی کوئی چیز ہے جسے حاصل کرنے کی اسے فکر ہونی چاہیے۔ نفس پرستی اس کی قوتِ فکریہ کو سلب کر لیتی ہے۔ وہ محض خواہش کا بندہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ نفسانی خواہشات جس سمت بھی اسے

ہانک کر لے جائیں وہ بے تامل اس سمت چلا جاتا ہے خواہ اس سے اس کا اخلاقی وجود باقی رہ سکے یا باقی نہ رہے۔ اسے اس کی کوئی فکر نہیں ہوتی۔ نفس پرستی، خود غرضی اور ایثار وقربانی سے احتراز یہی اس کی سیرت ہوتی ہے۔

حضور ﷺ کے اس ارشاد کا کہ ان دونوں میں سے ہر ایک کے فرزند ہیں مفہوم یہ ہے کہ دنیا اور آخرت، دونوں میں سے انسان اصلاً کسی ایک کو ہی اختیار کر سکتا ہے۔ کیوں کہ دونوں میں سے ہر ایک کا مطالبہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی اسی کا ہو کر رہے۔ اب عقل مندی اور دور اندیشی یہ ہے کہ آدمی دنیا کا فرزند یعنی اس کا تابع ہو کر نہ رہے بل کہ دنیا میں رہ کر اصل فکر اسے آخرت کی ہونی چاہیے گرچہ دنیا سے محبت کرنے والے اس کے فرزند بہت ہیں لیکن اس کو ہرگز ایسے لوگوں کی پیروی اختیار نہیں کرنی چاہیے۔ ہمیشہ یہ بات پیش نظر رکھنے کی ہے کہ دنیا کی اصل حیثیت دار العمل کی ہے۔ یہ دار الجزاء یا دار العیش نہیں ہے۔ دار الجزاء تو حقیقت میں آخرت ہے۔ دنیا میں زندگی کا حساب نہیں دینا ہوتا لیکن آخرت میں ہمیں اپنے تمام اعمال کی جواب دہی کرنی ہوگی۔ پھر اپنے اعمال کے لحاظ سے ہم وہاں جزا یا سزا کے مستحق قرار پائیں گے۔

پھر آخرت کوئی دور بھی نہیں ہے۔ بہت جلد ہم اس سے دو چار ہونے کو ہیں۔ یہ دنیا، جس پر لوگ جان چھڑکتے ہیں، فانی اور گزر جانے والی ہے۔ اس کے برخلاف آخرت کی دنیا جس کی طرف زندگی کا قافلہ رواں دواں ہے، ایک دائمی عالم ہے، جو کوئی عارضی اور ناپائیدار عالم ہرگز ثابت نہ ہوگا۔

حرص وطمع

(۱) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ يَقُوْلُ: سَمِعْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَقُوْلُ: لَوْ كَانَ لِابْنِ اٰدَمَ وَادِيَانِ مِنْ مَّالٍ لَابْتَغٰى ثَالِثًا وَّلَا يَمْلَأُ جَوْفَ ابْنِ اٰدَمَ اِلَّا التُّرَابُ وَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰى مَنْ تَابَ۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: ''اگر آدم زاد (یعنی آدمی) کے پاس مال کی دو ۲ وادیاں بھی ہوں تو وہ تیسری کا

طالب ہوگا۔ ابن آدم کے پیٹ کو صرف مٹی ہی بھرتی ہے اور اللہ توبہ کرنے والے کی توبہ کو قبول فرماتا ہے۔"

تشریح: صحیح بخاری ہی کی ایک دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں: لَوْ اَنَّ ابْنَ اٰدَمَ اُعْطِیَ وَادِیًا مَّلْأً مِّنْ ذَھَبٍ اَحَبَّ اِلَیْہِ ثَانِیًا، وَ لَوْ اُعْطِیَ ثَانِیًا اَحَبَّ اِلَیْہِ ثَالِثًا، وَلاَ یَسُدُّ جَوْفَ ابْنِ اٰدَمَ اِلَّا التُّرَابَ۔ "اگر ابن آدم کو سونے سے بھری ہوئی ایک وادی دے دی جائے تو وہ دوسری کی خواہش کرے گا اور اگر اسے دوسری بھی مل جائے تو وہ تیسری کا خواہاں ہوگا۔ اور ابنِ آدم کے پیٹ کو تو مٹی ہی بھر سکتی ہے۔"

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مال و متاع کی بھوک کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ آدمی کو کتنی ہی دولت کیوں نہ مل جائے مزید کی طلب باقی ہی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ مر کر خاک میں مل جاتا ہے۔ البتہ جو لوگ خدا کی طرف رجوع کرتے اور اس کے دامنِ رحمت میں پناہ ڈھونڈتے ہیں خدا کی ان پر خاص عنایت ہوتی ہے۔ وہ اپنے رب کو پا کر ہر چیز سے مستغنی ہو جاتے ہیں۔ خدا کی خوش نودی ان کے لیے دنیا و مافیہا سے بڑھ کر محبوب ہوتی ہے۔

(۲) وَ عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ ؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: تَعِسَ عَبْدُ الدِّیْنَارِ وَالدِّرْھَمِ وَالْقَطِیْفَۃِ وَالْخَمِیْصَۃِ، اِنْ اُعْطِیَ رَضِیَ وَ اِنْ لَّمْ یُعْطَ لَمْ یَرْضَ۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "دینار و درہم اور قطیفہ و خمیصہ کا بندہ ہلاک ہو۔ اگر اسے یہ چیزیں ملتی ہیں تو وہ خوش ہو جاتا ہے اور اگر نہیں ملتی ہیں تو خوش نہیں ہوتا۔"

تشریح: قطیفہ و خمیصہ ریشمی چادر اور اونی کپڑے ہیں۔

ایک روایت میں وَ اِنْ لَّمْ یُعْطَ سَخِطَ (اور اگر نہیں ملتی ہیں تو ناراض ہوتا ہے) کے الفاظ ملتے ہیں۔

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ ایسا شخص جو دنیوی مال و متاع کا پرستار ہے، اس کے حصے میں ہلاکت کے سوا کچھ اور نہیں آتا۔ وہ مادی اشیاء کے پیچھے مقامِ عظمت سے گر جاتا ہے۔ جائے حیرت ہے کہ اس کی خوشی اور راحت یا بے چینی مادی چیزوں سے وابستہ ہو کر رہتی ہے حالاں کہ آدمی کی راحت اور خوشی کا تعلق خوش نودیِ رب سے ہونا چاہیے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر

اس کا خدا اس سے راضی اور خوش ہے تو کانٹے بھی اس کے لیے پھول ہیں اور اگر اس کے برعکس اس کا رب اس سے ناخوش اور ناراض ہے تو دنیا کی کوئی بھی راحت یا دولت کیوں نہ ہو، وہ اس کے لیے کسی عذاب سے کم نہیں۔

﴿۳﴾ وَ عَنِ ابْنِ عُمَرَؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم سَمِعَ رَجُلاً یَتَجَشَّأُ فَقَالَ: اَقْصِرْ مِنْ جُشَآءِ کَ فَاِنَّ اَطْوَلَ النَّاسِ جُوْعًا یَّوْمَ الْقِیٰمَۃِ اَطْوَلُھُمْ شِبَعًا فِی الدُّنْیَا۔

(شرح السنہ، ترمذی)

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کی ڈکار سنی تو فرمایا: ''اپنی ڈکار کو مختصر کرو کیوں کہ قیامت کے روز سب سے زیادہ بھوکا وہ شخص ہوگا جو دنیا میں خوب پیٹ بھر کھاتا ہے۔''

تشریح: ڈکار کو مختصر کرو یعنی ڈکار نہ لو۔ اتنا مت کھاؤ کہ ڈکار لینے کی نوبت آئے۔

خوب پیٹ بھر کھانا اور ڈکاریں لینی انتہائی غفلت کی علامت ہے۔ مومن کو ہر اس عادت سے اجتناب کرنا چاہیے جو دنیا پرستوں اور غافلوں کی عادت اور غفلت میں مزید اضافہ کرنے والی ہوتی ہے۔ یہ زندگی غفلت میں گزار دینے کے لیے نہیں عطا ہوئی ہے۔ آدمی کو بہت سے دشوار گزار مراحل سے گزرنا ہے۔ موت کا اور پھر خدائے بزرگ و برتر کے سامنے کھڑے ہونے کا مرحلہ ایسا سخت مرحلہ ہے کہ آدمی کو اگر اس کا صحیح طور پر خیال ہو تو کبھی بھی اس پر غفلت طاری نہیں ہو سکتی۔ خدا کے سامنے جواب دہی کا تصور اسے یہ احساس دلانے کے لیے کافی ہوگا کہ وہ سخت قسم کی آزمائش اور امتحان میں ہے پھر وہ ہرگز غافل رہ کر مطمئن زندگی نہیں گزار سکتا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اس دنیا میں جس شخص کی زندگی بے خوفی اور بے پروائی کی حالت میں بسر ہوتی ہے، وہ آخرت میں بڑے خسارے میں رہے گا۔ یہاں غافل انسان کو اگر صرف اپنے پیٹ بھرنے ہی کی فکر رہتی ہے تو آخرت میں اسے آسودگی حاصل نہ ہوگی اور یہ اس کی غفلت اور بے پروائی کا لازمی نتیجہ ہوگا۔

﴿۴﴾ وَ عَنْ عَمْرِو بْنِ عَوْفٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم: فَوَ اللّٰہِ، لَا الْفَقْرَ اَخْشٰی عَلَیْکُمْ وَلٰکِنْ اَخْشٰی عَلَیْکُمْ اَنْ تُبْسَطَ عَلَیْکُمُ الدُّنْیَا کَمَا بُسِطَتْ عَلٰی مَنْ کَانَ قَبْلَکُمْ فَتَنَا فَسُوْھَا کَمَا تَنَافَسُوْھَا وَ تُھْلِکَکُمْ کَمَآ اَھْلَکَتْھُمْ۔ (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت عمرو بن عوفؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”بہ خدا میں تمھارے لیے فقر و افلاس سے نہیں ڈرتا بل کہ مجھے تمھارے بارے میں اس بات کا خوف ہے کہ دنیا تم پر کشادہ کردی جائے جس طرح سے ان لوگوں پر کشادہ کی گئی جو تم سے پہلے گزرے ہیں اور پھر تم اسی طرح اسے بے طرح چاہنے لگو جس طرح تم سے پہلے کے لوگ اس کی چاہت اور رغبت میں مبتلا ہوئے اور یہ دنیا تمھیں بھی ہلاک کردے جس طرح اس نے ان کو ہلاک کیا۔“

تشریح: یعنی فقر و افلاس کی وجہ سے آدمی فتنہ و آزمائش میں پڑسکتا ہے لیکن اس سے بڑھ کر اس کے بارے میں اندیشہ اس وقت ہوتا ہے جب کہ اس کے لیے مال و متاع کی راہیں کھل جائیں اور وہ دولت کی چاہت میں اپنی اصل ذمہ داریوں کو فراموش کر بیٹھے۔ اسے دھن ہو تو اس بات کی کہ کتنی جلد وہ اپنے لیے زیادہ سے زیادہ سرمایہ سمیٹ لے۔ وہ حرص کا ایسا بندہ بن کر رہ جائے کہ نہ اسے فقراء و مساکین پر رحم آئے اور نہ اپنی دولت کو راہِ خدا میں صرف کرسکے۔ اور بالآخر، خدا کے غضب میں گرفتار ہو کر رہے۔ جس طرح پچھلی قومیں خدا کے عذاب کا شکار ہوئی ہیں۔

یہاں یہ بات یاد رہے کہ ضروریات سے بڑھ کر جب کسی شخص کے پاس دولت جمع ہوجاتی ہے تو اس کے ساتھ ہی اس کا قوی اندیشہ پیدا ہوجاتا ہے کہ کہیں وہ دنیا میں اس طرح منہمک نہ ہوجائے کہ نہ اسے خدا یاد آئے اور نہ اسے آخرت کی کوئی فکر دامن گیر ہو اور نہ دنیا میں ہلاکت سے دوچار ہونے کا اسے خیال آئے۔

﴿۵﴾ وَ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: لَا یَجْتَمِعُ الشُّحُّ وَالْاِیْمَانُ فِیْ قَلْبِ عَبْدٍ اَبَدًا۔ (نسائی)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول خدا ﷺ نے فرمایا: ”حرص و بخل اور ایمان کسی بندے کے دل میں بھی کبھی جمع نہیں ہوتے۔“

تشریح: مسند احمد کی ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں: خَصْلَتَانِ لَا تَجْتَمِعَانِ فِیْ مُؤْمِنٍ: اَلْبُخْلُ وَ سُوْءُ الْخُلُقِ: ”دو خصلتیں ایسی ہیں جو کسی مومن میں جمع نہیں ہوسکتی ہیں، وہ ہیں بخل اور بد خلقی۔“

صحیح مسلم میں حضرت جابرؓ سے ایک روایت آئی ہے کہ حضور (ﷺ) نے فرمایا:
اِتَّقُوا الظُّلْمَ فَاِنَّ الظُّلْمَ ظُلُمَاتٌ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ، وَاتَّقُوا الشُّحَّ، فَاِنَّ الشُّحَ مَنْ کَانَ قَبْلَکُمْ

حَمَلَهُمْ عَلَى اَنْ سَفَكُوْا دِمَآءَ هُمْ وَاسْتَحَلُّوْا مَحَارِمَهُمْ۔ (مسلم) بچو ظلم سے، کیوں کہ ظلم سے قیامت کے روز تاریکیاں ہوں گی اور بخل وحرص سے بچو، کیوں کہ بخل وحرص نے تم سے پہلے لوگوں کو ہلاک کیا، انھوں نے اس کی وجہ سے خون بہائے اور حرام کو حلال قرار دے لیا۔‘‘

نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اس ارشاد سے کہ ’’حرص وبخل اور ایک ایمان کسی بندے کے دل میں جمع نہیں ہوتے۔ معلوم ہوا کہ حرص وبخل درحقیقت ایمان اور اس کے تقاضوں کے منافی ہے۔ ایمان کا مفہوم یہ ہے کہ آدمی دنیوی مال ومتاع کا نہیں بل کہ خدا کا پرستار ہو۔ اگر خدا نے اسے دولت بخشی ہے تو وہ اس دولت کو اپنی ذات ہی تک محدود نہ رکھے بل کہ اسے بے سہارا لوگوں پر بھی اور خدا کے دین کی اقامت پر صرف کرے۔ لیکن حرص وبخل میں مبتلا شخص نہ اپنی دولت کو راہِ خدا میں خرچ کرتا ہے اور نہ اس کی دولت سے ناداروں کو کوئی فائدہ پہنچ پاتا ہے۔

〈۲〉 وَعَنْ اَنَسٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم: يَهْرَمُ ابْنُ اٰدَمَ وَيَشِبُّ فِيْهِ اثْنَانِ: اَلْحِرْصُ عَلَى الْمَالِ وَالْحِرْصُ عَلَى الْعُمْرِ۔ (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’آدم زاد بوڑھا ہوجاتا ہے مگر اس کے اندر دو چیزیں زیادہ جوان ہوتی جاتی ہیں: مال ودولت کی حرص اور جینے کی حرص۔‘‘

تشریح: بخاری ومسلم میں حضرت ابوہریرہؓ سے ایک حدیث مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا: لَا يَزَالُ قَلْبُ الْكَبِيْرِ شَابًّا فِيْ اِثْنَيْنِ فِيْ حُبِّ الدُّنْيَا وَ طُوْلِ الْاَمَلِ۔ ’’بوڑھے آدمی کا دل دو چیزوں کے سلسلے میں ہمیشہ جوان ہی رہتا ہے ایک دنیا کی محبت، دوسری لمبی لمبی تمنائیں اور امیدیں۔‘‘

عام طور پر دیکھنے میں یہی آتا ہے کہ آدمی بوڑھا اور کم زور ہوجاتا ہے لیکن اس کی دولت کی حرص اور دنیا کی محبت اور جینے کی تمنا میں کوئی کمی نہیں آتی۔ قویٰ مضمحل ہونے کی وجہ سے خواہشات پر قابو پانا بھی اس کے لیے آسان نہیں ہوتا۔ اس کی خواہشات ہوس کا درجہ اختیار کرلیتی ہیں۔ لیکن اس سے خدا کے وہ بندے مستثنیٰ ہیں جن کی نگاہیں ہمیشہ انجام پر ہوتی ہیں۔ جو دنیا کی زندگی اور اس کے اسباب وسامان کو عارضی سمجھتے ہیں۔ جنھوں نے اپنے نفس کی تربیت آخرت کو پیشِ نظر رکھ کر کی ہوتی ہے۔ وہ فانی آرزوؤں کی جگہ رضائے الٰہی اور آخرت کی نعمت ہائے فراواں کے آرزومند ہوتے ہیں اور بڑھاپے میں بھی ان کے اس شوق واشتیاق میں کوئی ضعف پیدا نہیں ہوتا۔

﴿۷﴾ وَ عَنْ کَعْبِ بْنِ مَالِکٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: مَاذِئْبَانِ جَآئِعَانِ اُرْسِلاَ فِیْ غَنَمٍ بِاَفْسَدَ لَھَا مِنْ حِرْصِ الْمَرْءِ عَلَی الْمَالِ وَالشَّرَفِ لِدِیْنِہٖ۔

(ترمذی، دارمی)

ترجمہ: حضرت کعب بن مالکؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ’’دو بھوکے بھیڑیے جو بکریوں میں چھوڑ دیے جائیں وہ ان بکریوں کو اس سے بڑھ کر تباہ نہیں کرتے جتنا مال اور عزت وجاہ کے لیے آدمی کی حرص اس کے دین کو تباہ اور برباد کر کے رکھ دیتی ہے۔‘‘

تشریح: دین کیا ہے؟ زندگی میں خدا کو اختیار کرنا۔ اس طور پر زندگی بسر کرنا کہ آدمی کی پوری زندگی جمالِ خداوندی کی تابع بن کر رہ جائے۔ اس کے کردار و اعمال سے صاف ظاہر ہو کہ وہ خدا کی عزت و عظمت اور اس کے جمال و کمال پر قربان ہے۔ اس کی ساری نیاز مندیاں ایک خدا کے لیے مخصوص ہو کر رہ گئی ہیں۔ ایسے شخص کی دلی تمنا یہ ہوتی ہے کہ وہ خدا کے سامنے اپنے آپ کو انتہا درجہ تک پست کر دے تاکہ اس کے خدا کی برتری نمایاں ہو۔ وہ اس بات کا آرزو مند ہوتا ہے کہ خدا کی محبت میں وہ اس طرح سرشار ہو کہ یہ چیز اسے فانی اشیاء کی محبتوں سے بے نیاز کر دے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس شخص کو صحیح معنی میں خدا کا علم ہو گیا، اس کی نگاہ میں خدا کے مقابل میں نہ کہیں اور کوئی عزت و عظمت ہے اور نہ اس کے مقابل میں کہیں کوئی وجہ دل کشی وجاذبیت پائی جاتی ہے جس کے لیے اس کا دل بے تاب و مضطرب ہو سکے۔ یہی اصل دین ہے۔ اب اگر کوئی آدمی دنیوی مال و متاع اور دنیوی عزت و مرتبہ اور شہرت کا بھوکا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ دین اور اس کی لذتوں سے بالکل نا آشنا ہے۔ وہ اگر اپنی اصلاح کی طرف متوجہ نہیں ہوتا تو اس کے دین کی تباہی میں کیا شبہ باقی رہتا ہے۔

حضور (ﷺ) نے دو بھوکے بھیڑیوں اور بکریوں کی مثال دین کی ہول ناک تباہی کا احساس دلانے کے لیے پیش فرمائی ہے۔ بھوکے بھیڑیے بکریوں کو کب زندہ چھوڑ سکتے ہیں! ٹھیک اسی طرح حرصِ مال اور حرصِ جاہ کی حیثیت دو خطرناک بھیڑیے کی ہے۔ یہ آدمی کے دین کے لیے انتہائی تباہ کن ثابت ہوتے ہیں۔ اس سے کہیں زیادہ تباہ کن جتنا دو بھوکے بھیڑیے بکریوں کے لیے غارت گر ہوتے ہیں۔

﴿۸﴾ وَ عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عَمْرٍوؓ قَالَ: خَطَبَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ فَقَالَ: اِیَّاکُمْ

وَالشُّحُّ فَاِنَّمَا هَلَکَ مَنْ کَانَ قَبْلَکُمْ بِالشُّحِّ اَمَرَهُمْ بِالْبُخْلِ فَبَخِلُوْا وَ اَمَرَهُمْ بِالْقَطِيْعَةِ فَقَطَعُوْا وَ اَمَرَهُمْ بِالْفُجُوْرِ فَفَجَرُوْا۔ (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے ایک دن خطبہ دیا اور اس میں فرمایا: "حرص وطمع سے بچو کیوں کہ تم سے پہلے جو گزرے ہیں، وہ حرص وطمع ہی کے سبب سے تباہ ہوئے۔ اسی نے انھیں بخل پر ابھارا تو انھوں نے بخل اختیار کیا، اسی نے انھیں قطع رحمی کے لیے آمادہ کیا تو وہ قطع رحمی کے مرتکب ہوئے اور اسی نے انھیں فسق وفجور پر اکسایا تو وہ فسق وفجور میں مبتلا ہوئے۔"

تشریح: شح یا حرص سے آدمی کا دین کس طرح تباہ وبرباد ہوتا ہے اور کس طرح یہ چیز خود اس کے لیے بھی موجبِ ہلاکت ثابت ہوتی ہے۔ اس حدیث سے یہ بات بہ خوبی واضح ہوتی ہے۔ حرص اور تنگ دلی کی وجہ سے پچھلی قوموں نے بخل کو اپنا شعار بنایا اور پھر اس بخل نے انھیں ہر ظلم وستم پر آمادہ کیا۔ انھوں نے اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں تک کے حقوق پامال کیے اور اس کی وجہ سے انھوں نے ہر قسم کے فسق وفجور کا ارتکاب کیا اور بالآخر وہ خدا کے عذاب کی مستحق ہو کر رہیں۔

〈۹〉 وَ عَنْ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم: اِنَّ لِقَلْبِ ابْنِ اٰدَمَ بِکُلِّ وَادٍ شُعْبَةً فَمَنْ اَتْبَعَ قَلْبَهُ الشُّعَبَ کُلَّهَا لَمْ يُبَالِ اللّٰهُ بِاَيِّ وَادٍ اَهْلَکَهُ وَ مَنْ تَوَکَّلَ عَلَى اللّٰهِ کَفَاهُ الشُّعَبَ۔ (ابن ماجہ)

ترجمہ: حضرت عمرو بن العاصؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "آدم زاد کے دل کے لیے ہر ایک وادی اور میدان میں ایک شاخ ہے۔ پس جو شخص ان میں سے ہر ایک شاخ (خواہش) کے پیچھے اپنے دل کو لگائے گا تو اللہ کو اس کی کوئی پرواہ نہ ہوگی کہ اسے کس وادی میں تباہ وہلاک کرے اور جو شخص اللہ پر توکل کرے تو اللہ ان تمام شاخوں کے معاملہ میں اس کے لیے کافی ہو جائے گا۔"

تشریح: آدمی کے دل کی خواہشات ہر میدان میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اب اگر وہ ان خواہشات کے پیچھے پڑے گا، ان ہی کو اپنا قبلۂ مقصود بنائے گا اور فکر کے گھوڑے ہر طرف دوڑاتا رہے گا تو خدا اپنی حفاظت سے اسے الگ کر دے گا۔ اسے اس کی کوئی پروانہ ہوگی کہ وہ کہاں تباہ وبرباد ہوتا

ہے لیکن اس کے برعکس اگر وہ خدا پر توکل کر کے راہِ راست پر چلنے کی کوشش کرتا ہے اور اس کی بندگی میں لگا رہتا ہے تو نہ صرف یہ کہ خدا اس کے دین و ایمان اور اخلاق کی حفاظت فرمائے گا بلکہ اس کی ساری ضروریات کے معاملے میں بھی وہ اس کے لیے کافی ہو جائے گا۔ خدا اسے ایسا سکون و اطمینان عطا کرے گا جس سے بڑھ کر دنیا میں کوئی دولت نہیں ہے۔

حب دنیا

﴿۱﴾ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: بَادِرُوْا بِالْاَعْمَالِ فِتَنًا كَقِطَعِ اللَّیْلِ الْمُظْلِمِ، یُصْبِحُ الرَّجُلُ مُؤْمِنًا وَّ یُمْسِیْ كَافِرًا اَوْ یُمْسِیْ مُؤْمِنًا وَّ یُصْبِحُ كَافِرًا یَبِیْعُ دِیْنَهٗ بِعَرَضٍ مِّنَ الدُّنْیَا۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”جلد سے جلد نیک کام کرلو، اس فتنے سے پہلے جو تاریک شب کے ٹکڑے جیسا (تاریک) ہوگا۔ صبح کو آدمی مومن ہوگا اور شام کو کافر، یا شام کو مومن ہوگا اور صبح کو کافر۔ وہ اپنے دین کو دنیوی اسباب و سامان کے عوض بیچ ڈالے گا۔“

تشریح: فتنہ جو تاریک شب کے ٹکڑے جیسا ہوگا یعنی یہ فتنہ روشنی کو نگل لینے کے درپے ہوگا۔ کوئی شخص صبح کو مومن ہوگا لیکن یہ نہیں کہا جاسکے گا کہ وہ شام تک مومن رہ بھی سکے گا یا نہیں۔ اسی طرح ایک شخص شام کو مومن ہوگا لیکن اس کی کوئی گارنٹی نہ ہوگی کہ وہ آنے والی صبح کو بھی مومن رہ سکے۔ ایسا انقلاب رونما ہوگا کہ کوئی صبح دم مومن تو شام کو کافر ہوگا یا شام کو مومن تو صبح اس کے لیے کفر کا پیغام ثابت ہوگی۔ ایمان میں کوئی استحکام نہ ہوگا۔ لوگ اعلیٰ کردار سے عاری ہوں گے۔

اس وقت دنیا کی طمع ایسی غالب ہوگی کہ لوگوں کے دلوں میں دین کی کوئی قدر و قیمت باقی نہ رہے گی۔ دنیوی مفاد کے لیے لوگ اپنے دین و ایمان تک کا سودا کریں گے۔ ان کو دنیا حاصل کرنے کے لیے اپنے دین کو بیچ دینے میں کوئی تامل یا عار نہ ہوگا۔

﴿۲﴾ وَ عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: اِنَّ هٰذَا الْمَالَ خَضِرَةٌ حُلْوَةٌ فَمَنْ اَخَذَهٗ بِحَقِّهٖ وَ وَضَعَهٗ فِیْ حَقِّهٖ فَنِعْمَ الْمَعُوْنَةُ هُوَ۔ وَ مَنْ اَخَذَهٗ بِغَیْرِ حَقِّهٖ كَالَّذِیْ یَاْكُلُ وَلَا یَشْبَعُ یَكُوْنُ شَهِیْدًا عَلَیْهِ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ۔ (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ”بے شک یہ مال سبز، خوش گوار، تروتازہ اور لذیذ ہے۔ پس جو شخص اسے جائز طریقے پر حاصل کرلے اور جائز مصارف میں صرف کرے تو یہ مال بہترین مددگار ہے۔ اور جو شخص اس کو ناجائز طریقے سے حاصل کرے تو وہ اس شخص کی طرح ہوتا ہے کہ جو کھاتا ہے اور سیر نہیں ہوتا اور یہ مال قیامت کے روز اس کا شاہد ہوگا۔“

تشریح: یہ درحقیقت طویل حدیث کا ایک حصہ ہے۔ حضور (ﷺ) کے ارشاد کا حاصل یہ ہے کہ دنیا کا مال انسان کے لیے لذیذ بھی ہوتا ہے اور خوش نما بھی۔ عقل مند وہ ہے جو اسے مقصدِ حیات کے لیے اپنا معاون بناتا ہے۔ مال کو جائز طریقے سے حاصل کرتا ہے اور اسے جائز مصارف میں خرچ کرتا ہے۔ مال کی اسے فکر ہوتی ہے تو بس بہ قدر ضرورت ہوتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ دنیا سمیٹنے کی حرص میں وہ کبھی مبتلا نہیں ہوتا۔ اس کے برخلاف جو کوئی مال کے حصول اور اس کے استعمال میں جائز و ناجائز کی پروا نہیں کرتا وہ حقیقت میں مال کا پرستار ہے۔ مال ہی اس کا مقصودِ حیات ہے ایسے شخص کو کبھی بھی آسودگی اور اطمینان کی دولت حاصل نہیں ہوسکتی۔ آج نہیں تو کل قیامت میں یہ ظاہر ہوکر رہے گا کہ اس کی زندگی، زندگی کے اعلیٰ مفہوم سے خالی رہی ہے دنیا کا سرمایہ ہی اس کے لیے سب کچھ تھا۔ وہ مال کی محبت میں ایسا گرفتار رہا کہ اسے اس کی فرصت ہی نہ تھی کہ وہ زندگی میں اپنی اصل ذمہ داری کو محسوس کرسکتا۔ وہ تادمِ آخر مال ہی کا حریص بنا رہا۔ اور یہ حرص ہی ایسی تھی جو ختم ہونے والی نہ تھی۔ بالآخر موت نے اس سے وہ سب چھین لیا جس پر وہ جان چھڑکتا رہا ہے۔ جس بڑی حقیقت سے اسے دوچار ہونا تھا اس کی اسے فکر نہ ہوسکی۔ مال جو زندگی کے مقصود یعنی خوش نودیِ رب کے حصول میں اس کا معاون ثابت ہوسکتا تھا وہ اس کے لیے وبالِ جان ہوکر رہا۔ اس کے حصہ میں حسرت وندامت کے سوا کچھ اور نہ آسکا۔ قیامت میں اس کا بھی موقع نہ ہوگا کہ وہ اپنی غلطی کی کوئی تلافی کرسکے۔

﴿۳﴾ وَ عَنْ كَعْبِ بْنِ عَيَاضٍ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: اِنَّ لِكُلِّ اُمَّةٍ فِتْنَةً وَّ فِتْنَةُ اُمَّتِي الْمَالُ۔ (ترمذی)

ترجمہ: حضرت کعب بن عیاضؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ”ہر امت کے لیے ایک فتنہ ہے اور میری امت کا فتنہ مال ہے۔“

تشریح: یعنی ہر قوم کو خدا نے کسی نہ کسی چیز کے ذریعہ سے آزمایا ہے۔ اس امت کی آزمائش خاص طور سے مال کے ذریعہ سے ہوگی۔ اگر کوئی شخص مادی منفعت ہی کو سب کچھ سمجھتا ہے اور مال کی محبت میں گرفتار ہو کر رہتا ہے اور مال کے حصول ہی کو اپنی کامیابی تصور کرتا ہے تو اس کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ یہ مال اس کے لیے ایسا فتنہ ثابت ہوا جس سے وہ سلامتی کے ساتھ گزرنے میں ناکام رہا۔

اس حدیث میں حضور (ﷺ) نے درحقیقت اپنی امت کو تنبیہ فرمائی ہے کہ اس امت کو گرچہ یوم السبت یا فتنۂ سامری جیسی کسی چیز سے سابقہ پیش نہیں آئے گا لیکن مال کا فتنہ خود ایک بڑا فتنہ ہے جس سے اسے سابقہ پیش آئے گا۔ مال کی محبت میں پڑ کر آدمی اکثر اپنے ایمان و یقین کے تقاضوں کو فراموش کر دیتا ہے اور خدا کی نگاہ میں ظالم قرار پاتا ہے۔ اس امت کی سرخ روئی اور کامیابی کا انحصار اس بات پر ہے کہ یہ دنیا کو دنیا سمجھے اور اپنی نگاہ ہمیشہ اخروی فلاح اور آخرت میں حاصل ہونے والی کامیابیوں پر جمائے رکھے۔ دنیوی مال و متاع کی محبت کے ساتھ یہ امت کبھی بھی اس ذمہ داری کو کما حقہ ادا نہیں کر سکتی جو ذمہ داری خدا نے اس کے سپرد کی ہے یعنی خود راہِ راست پر قائم رہنا اور اہلِ عالم کو حق کی طرف دعوت دینی اور اس سلسلہ میں قیادت کا فرض ادا کرنا، یہ ایسا فریضہ ہے جو کسی حالت میں بھی ساقط نہیں ہوتا۔

(۴) وَ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رضی اللہ عنہ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: اَلَآ اِنَّ الدُّنْیَا مَلْعُوْنَةٌ وَ مَلْعُوْنٌ مَّا فِیْهَا اِلَّا ذِکْرُ اللّٰهِ وَمَا وَالَاهُ وَ عَالِمٌ اَوْ مُتَعَلِّمٌ۔ (ترمذی، ابن ماجہ)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ”خبردار، دنیا ملعون ہے اور جو کچھ دنیا میں ہے وہ بھی ملعون ہے سوائے خدا کی یاد اور اس چیز کے جسے خدا پسند فرماتا ہے اور عالم یا متعلم کے۔“

تشریح: یعنی یہ دنیا اور اس کی چیزیں بے وقعت ہیں۔ یہ انسان کا مقصود نہیں ہو سکتی ہیں۔ مٹ جانے والی دنیا ایسی چیز نہیں جس پر کوئی راضی ہو سکے۔ آدمی کی آرزوؤں کا مرکز تو آخرت کی دنیا ہی ہو سکتی ہے جو ہمیشہ باقی رہنے والی ہوگی۔ جہاں کی بہاریں خزاں ناآشنا ہوں گی۔ دنیا کی خوش نمائیاں اکثر فریب کار ثابت ہوتی ہیں۔ ان میں پڑ کر اکثر لوگ خدا سے غافل ہو جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے بھی اہلِ نظر کی نگاہ میں ان کی کوئی خاص وقعت نہیں ہوتی۔ اس دنیا میں اگر قابلِ قدر کوئی

چیز ہے تو وہ خدا کی یاد اور اس کی عظمت کا شعور واحساس ہے۔ یا وہ چیزیں جنھیں وہ پسند فرمائے جیسے طاعت وبندگی، حسنِ اخلاق اور نیک اعمال۔ یا پھر عالِم جو خدا کو پہچانتا ہے اور لوگوں میں خدا پرستی کی روح پھونکنے کی فکر میں مصروف ہوتا ہے۔ یا وہ شخص جو علم حق کی طلب میں لگا رہتا ہے۔

اس حدیث میں ''ذِکْرُ اللّٰہِ وَمَا وَالاَہُ'' آیا ہے۔ ''وَمَا وَالاَہُ'' کا ایک مطلب تو وہ ہے جو ہم نے حدیث کے ترجمے میں اختیار کیا ہے۔ اس کا دوسرا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے: ''وہ چیزیں جو ذکراللہ کے قریب اور مشابہ ہوں۔'' اور اس کا ایک تیسرا مفہوم یہ بھی ممکن ہے: ''وہ چیزیں جو ذکراللہ کے مقتضیات اور لوازم میں سے ہوں۔''

﴿۵﴾ وَ عَنْ اَبِی الدَّرْدَآءِؓ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ: حُبُّکَ الشَّیْءَ یُعْمِیْ وَ یُصِمُّ۔

(ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت ابودرداءؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''کسی چیز سے تیری محبت تجھے اندھا اور بہرا بنا دیتی ہے۔''

تشریح: نبی (ﷺ) نے مختصر الفاظ میں بڑی تنبیہ فرمائی ہے اور انسان کو اس کی ایک بہت بڑی کم زوری سے آگاہ فرمایا ہے۔ آدمی کی یہ سب سے بڑی کم زوری ہے کہ جب اس کے دل میں کسی چیز کی محبت گھر کر جاتی ہے تو اس کے عیب بھی اسے ہنر نظر آنے لگتے ہیں۔ وہ اس پوزیشن میں نہیں رہتا کہ حق و ناحق میں تمیز کر سکے اور صرف حق بات کی حمایت کرے اور ناحق کو رد کرے۔

اس لیے انسان کے لیے پہلے قدم پر یہ ضروری ہے کہ وہ سنجیدگی کے ساتھ فیصلہ کرے کہ اس زندگی میں کیا چیز ہے جس سے وہ جی لگائے اور کون سی چیز ہے جس سے اس کو بے پروا ہونا چاہیے۔ اسے جاننا چاہیے کہ اس کے لیے وہ کون سی چیز ہوسکتی ہے جس کی طلب میں وہ سرگرم عمل ہو۔ اس لیے کہ اگر وہ خدانخواستہ کسی ایسی چیز کا گرویدہ ہو گیا ہو جو اس بات کی مستحق نہ تھی کہ آدمی اس کا گرویدہ ہو تو پھر بعد میں اس سے دامن چھڑانا آسان نہ ہوگا۔

آدمی تین چیزوں سے عبارت ہے۔ اس کے کچھ افکار وخیالات اور نظریات ہوتے ہیں۔ اسی طرح اس کے کچھ جذبات واحساسات ہوتے ہیں جن کی وہ تسکین وتشفی چاہتا ہے اور پھر اس کی قوت عمل ہوتی ہے جو اپنے لیے میدان تلاش کرتی ہے۔ ان تینوں ہی پہلوؤں سے دین نے جو رہ نمائی کی ہے وہی صحیح اور درست ہوسکتی ہے۔

بہترین اور بلند و مستحکم نظریات وہی ہیں جن کی تعلیم ہمیں کتاب وسنت میں ملتی ہے اس لیے ان ہی نظریات کو اختیار کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ دوسرے نظریات و افکار جو اسلامی نظریات کے مخالف ہیں، کبھی بھی لائق اعتناء نہیں ہو سکتے۔ آدمی کو پہلے ہی قدم پر یہ جان لینا چاہیے کہ غیر اسلامی نظریات اسے ایک ایسے صحرا میں لا کھڑا کریں گے جہاں نہ کوئی سایہ ہوگا اور نہ ٹھنڈک کا کوئی سامان ہوگا۔ ہم نے ایسے لوگ دیکھے ہیں جو مسلم گھرانے میں پیدا ہونے کے باوجود مارکسی نظریات کے ایسے دل دادہ ہوئے کہ انھیں وہی نظریات سب سے فائق و برتر اور سائنٹفک نظر آنے لگے اور پھر اپنے خلاف وہ معقول سے معقول دلائل کو بھی وزن دینے کو تیار نہ ہوئے۔

احساسات وجذبات کو دیکھیے۔ آدمی اگر سستے قسم کے جذبات کا خوگر ہو گیا تو پھر اسے وہ کیفیات جو نہایت پاکیزہ اور لطیف ہیں، بے کیف معلوم ہوں گی۔ وہ انسان کی گہری نفسیات اور صحیح فطرت سے نا آشنا ہی رہتا ہے۔ جذبۂ عبودیت ہو یا خوشنودیٔ رب کی طلب، تقویٰ وخشیت ہو یا نصح وخیر خواہی کا جذبہ اور خدا اور رسولؐ سے محبت، زندگی کی اعلیٰ قدروں سے اسے کوئی انس نہیں ہوتا اور نہ ان سے اسے وہ حلاوت حاصل ہوتی ہے جو دلوں کے لیے غذا کی حیثیت رکھتی ہے۔

اسی طرح زندگی کے عملی پہلو کو لیجیے۔ اگر کوئی شخص کسی خاص تہذیب کا دل دادہ ہو جاتا ہے تو پھر وہ اسی کا حامی وناصر بن کر کھڑا ہوگا۔ اسے اسلامی تہذیب اور اسلامی طریق حیات میں کوئی کشش اور جاذبیت سرے سے نظر نہیں آئے گی۔

ایسا شخص اندھا بھی بن جاتا ہے اور بہرا بھی ہو جاتا ہے۔ نہ وہ خود دیکھ سکتا ہے کہ وہ معائب یا محاسن کا تجزیہ کر سکے اور نہ کسی کی سن ہی سکتا ہے کہ سن کر اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کر سکے۔

کتنے ہی لوگ ہیں جو دنیا اور اس کی زینتوں پر ایسے فریفتہ ہوئے کہ انھیں اس عالمِ ظاہر کے سوا کچھ اور دکھائی نہیں دیتا۔ اس دنیائے ناپید کی رعنائیاں ہی ان کے لیے سب کچھ ہیں۔ دنیا کی زیب وزینت ہی ان کی طلب کا حاصل ہوتا ہے۔ دنیا کی شہرت اور نام ونمود کا حصول ہی ان کے لیے تکمیل حیات کا درجہ رکھتا ہے۔ ان کی تنگ دامانی پر آپ جتنا بھی ماتم کریں، تھوڑا ہے مگر انسان کی اس کمزوری کو کیا کیجیے کہ آدمی کی اپنی چاہت اسے اندھا اور بہرا بنا کر چھوڑتی ہے۔

حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ارشاد کی صداقت کا آپ روزمرہ کی زندگی میں بھی مشاہدہ کر سکتے

ہیں۔ کبھی آدمی کو اپنی اولاد سے اتنی محبت ہو جاتی ہے کہ اگر وہ فاسق و فاجر اور خدا کا باغی ہی کیوں نہ ہو انھیں ان سے نفرت نہیں ہوتی۔ کبھی آدمی قومی عصبیت اور قومی محبت میں اس طرح گرفتار ہو جاتا ہے کہ اس کی ساری ہم دردیاں و غم خواریاں اپنی ہی قوم کے لیے مختص ہو کر رہ جاتی ہیں۔ دوسرے لوگوں کے لیے اس کے پاس کچھ نہیں ہوتا۔ قوم حق پر ہو یا ناحق پر۔ وہ ہر حالت میں اپنی قوم کی حمایت میں لگا رہے گا حالاں کہ قرآن میں واضح الفاظ میں آگاہ فرمایا گیا ہے: ''وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْآ اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ ط (البقرہ:۱۶۵)'' اور جو اہل ایمان ہیں انھیں سب سے بڑھ کر محبت اللہ سے ہوتی ہے۔'' اہل ایمان کی محبت کا اصل مرکز و محور خدا کی ذات ہوتی ہے۔ ان کی ساری دوستی اور دشمنی اور ان کی زندگی کی ساری تگ و دو بس اسی ایک محبت کی تابع ہوتی ہے۔

﴿۶﴾ وَ عَنْ قَتَادَةَ بْنِ النُّعْمَانِؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ قَالَ: اِذَا اَحَبَّ اللّٰہُ عَبْدًا حَمَاہُ الدُّنْیَا کَمَا یَظَلُّ اَحَدُکُمْ یَحْمِیْ سَقِیْمَهُ الْمَآءَ. (احمد، ترمذی)

ترجمہ: حضرت قتادہ بن نعمانؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: جب اللہ کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو وہ اس کو دنیا سے اس طرح بچاتا ہے جس طرح تم میں سے کوئی اپنے بیمار کو پانی سے پرہیز کراتا ہے۔''

تشریح: یعنی خدا اپنے محبوب بندے کو ضائع ہونے سے محفوظ رکھتا ہے۔ وہ اس کا محافظ بن جاتا ہے۔ جس بندے کو خدا کی محافظت حاصل ہوتی ہے، وہ دنیا کی محبت میں گرفتار نہیں ہوتا۔ حضور (ﷺ) اس بات کو ایک مثال کے ذریعہ سے واضح فرماتے ہیں۔ 'جس طرح سے کوئی شخص اپنے کسی عزیز کو ایسی بیماری (مثلاً استسقاء، ضعف معدہ وغیرہ) میں، جس میں پانی مضر ہوتا ہے، پانی سے بچاتا ہے اور اسے پانی پلانے میں انتہائی احتیاط سے کام لیتا ہے، ٹھیک اسی طرح خدا بھی اپنے محبوب و وفادار بندوں کو دنیا کی محبت اور اس کی ان چیزوں سے دور رکھتا ہے جن سے ان کے دین کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہوتا ہے اور جن سے ان کی عاقبت خطرے میں پڑ سکتی ہے۔

﴿۷﴾ وَ عَنْ ثَوْبَانَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: یُوْشِکُ الْاُمَمُ اَنْ تَدَاعٰی عَلَیْکُمْ کَمَا تَدَاعَی الْاَکِلَةُ اِلٰی قَصْعَتِھَا. فَقَالَ قَآئِلٌ وَّ مِنْ قِلَّةٍ نَحْنُ یَوْمَئِذٍ؟ قَالَ: بَلْ اَنْتُمْ یَوْمَئِذٍ کَثِیْرٌ وَّ لٰکِنَّکُمْ غُثَآءٌ کَغُثَآءِ السَّیْلِ، وَ لَیَنْزِعَنَّ اللّٰہُ مِنْ

صُدُوْرِ عَدُوِّکُمُ الْمَهَابَةَ مِنْکُمْ وَ لَیَقْذِفَنَّ اللّٰهُ فِیْ قُلُوْبِکُمُ الْوَهْنَ۔ فَقَالَ قَآئِلٌ: یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، وَمَا الْوَهْنُ؟ قَالَ: حُبُّ الدُّنْیَا وَ کَرَاهِیَّةُ الْمَوْتِ۔ (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت ثوبانؓ سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''عنقریب ایسا ہوگا کہ قومیں تم پر ٹوٹ پڑیں گی جس طرح کھانے والے ایک دوسرے کو کھانے کے پیالے کی طرف بلاتے ہیں۔'' ایک شخص نے عرض کیا کہ ''اور ایسا اس زمانے میں ہماری قلتِ تعداد کی وجہ سے ہوگا؟'' آپؐ نے فرمایا: ''نہیں، تم تو اس زمانے میں کثیر تعداد میں ہوگے۔ لیکن تمھاری حیثیت کوڑے کرکٹ کی ہوگی، جیسے وہ خاشاک جو دریا اور سیلاب کے جھاگ کے ساتھ ملا ہوا ہوتا ہے۔ اللہ تمھارے دشمنوں کے دلوں سے تمھارا رعب نکال دے گا۔ اور تمھارے دلوں میں 'وہن' (سستی اور کم زوری) ڈال دے گا۔'' ایک شخص نے پوچھا کہ اے اللہ کے رسول! 'وہن' کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''دنیا کی محبت اور موت سے نفرت۔''

تشریح: اس حدیث میں واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ امت مسلمہ کی طاقت اور قوت کا اصل راز کیا ہے؟ آپؐ نے شروع ہی میں مسلمانوں کو خبردار کر دیا ہے کہ جب تک ان کا اپنے مقصدِ حیات سے عشق کا رشتہ رہے گا اور وہ اس کے لیے ہر قسم کی قربانی دینے کو دل وجان سے آمادہ رہیں گے، کوئی بھی قوم ان پر بے باکانہ حملہ کرنے کی جرأت نہیں کر سکتی۔ لیکن جس وقت اہلِ ایمان دنیا کی محبت میں گرفتار ہو جائیں گے اور موت سے ان کو وحشت ہونے لگے گی، اس وقت ان کا رعب ختم ہو جائے گا۔ مخالف قومیں ان کو اپنا تر نوالہ سمجھ لیں گی۔ ان پر دشمنوں کی یلغار ہوگی۔ مسلمانوں کو دوسری قوموں کے مقابلہ میں اگر برتری حاصل ہو سکتی ہے اور وہ میدان عمل میں سب پر بازی لے جا سکتے ہیں تو اس طرح کہ وہ دنیا کو اپنا مقصود حیات نہ سمجھیں اور موت کو جو خدا کی طاعت و بندگی اور اس کی راہ میں آئے، اسے اپنے لیے سب سے بڑی کامیابی تصوّر کریں۔

عیش کوشی

(۱) عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم لَمَّا بَعَثَ بِهٖ اِلَی الْیَمَنِ قَالَ: اِیَّاکَ وَالتَّنَعُّمِ، فَاِنَّ عِبَادَ اللّٰهِ لَیْسُوْا بِالْمُتَنَعِّمِیْنَ۔ (احمد)

ترجمہ: حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے کہ جب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم ان کو گورنر بنا کر یمن

بھیج رہے تھے تو اس موقع پر ارشاد فرمایا: ''تم عیش و عشرت میں پڑنے سے خود کو بچانا۔ کیوں کہ خدا کے بندے عیش کوش نہیں ہوتے۔''

تشریح: یعنی تم یمن میں ایک حاکم کی حیثیت سے جا رہے ہو۔ وہاں زندگی کی لذات اور عیش و تنعم سے فائدہ اٹھانے کے مواقع تمھیں میسر ہوں گے مگر تم دنیا پرست حاکموں کی روش ہرگز اختیار نہ کرنا۔ خدا کے وفادار بندوں کو اصل فکر اس ذمہ داری کو پورا کرنے کی ہونی چاہیے جو ذمہ داری خدا نے اس پر ڈالی ہے۔ یہ دنیا ایسی جگہ نہیں ہے کہ آدمی یہاں عیش و آرام کی زندگی گزارنے کی فکر میں منہمک ہو۔ زندگی تو بس آخرت کی زندگی ہے۔

﴿۲﴾ وَ عَنْ حُذَيْفَةَ قَالَ: نَهَانَا النَّبِيُّ ﷺ اَنْ نَّشْرَبَ فِيْ اٰنِيَةِ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَ اَنْ نَّاْكُلَ فِيْهَا وَ عَنْ لُبْسِ الْحَرِيْرِ وَالدِّيْبَاجِ وَ اَنْ نَّجْلِسَ عَلَيْهِ۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت حذیفہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ہم کو سونے چاندی کے برتن میں کھانے پینے اور ریشم و دیبا کا لباس پہننے اور اس پر بیٹھنے سے منع فرمایا ہے۔''

تشریح: مطلب یہ ہے کہ امیرانہ ٹھاٹ باٹ اور عجمی تکلفات و تعیّشات کا اسلامی طرز زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مومن کے لیے اس طرح کی چیزوں سے احتراز لازم ہے۔

﴿۳﴾ وَ عَنْ جَابِرٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ لَهٗ: فِرَاشٌ لِلرَّجُلِ وَ فِرَاشٌ لِامْرَاَتِهٖ وَالثَّالِثُ لِلضَّيْفِ وَالرَّابِعُ لِلشَّيْطَانِ۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے ان سے فرمایا: ''(گھر میں) ایک بستر مرد کے لیے اور ایک بستر بیوی کے لیے ہوتا ہے اور تیسرا مہمان کے لیے ہوتا ہے اور چوتھا شیطان کے لیے۔''

تشریح: یعنی اسلام تعیّش اور مسرفانہ زندگی کو پسند نہیں کرتا۔ گھر میں سامان بہ قدر ضرورت ہونا چاہیے۔ بلاضرورت فرنیچروں اور فروش اور دیگر ساز و سامان کی کثرت اس بات کا ثبوت ہے کہ شیطان نے آدمی کو اس کے اصل مقصدِ حیات کی جانب سے غافل کر رکھا ہے۔

اس حدیث کا مقصد سامان اور بستر وغیرہ کی تعداد متعین کرنا نہیں ہے بل کہ اس کا اصل مقصد اس ذہنیت کی اصلاح ہے جس سے آدمی کے اندر دنیا پرستی یا دنیا طلبی کا ذوق و رجحان

پرورش پاتا ہے۔ کسی کے یہاں اگر مہمانوں کی کثرت سے آمد ہوتی ہے تو ایسی صورت میں فرش وغیرہ کی زیادہ تعداد کوئی مذموم و معیوب بات نہ ہوگی۔

بے حیائی

﴿۱﴾ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اَلْحَیَآءُ مِنَ الْاِیْمَانِ وَالْاِیْمَانُ فِی الْجَنَّةِ وَالْبَذَآءُ مِنَ الْجَفَاءِ وَالْجَفَاءُ فِی النَّارِ۔ (احمد، ترمذی)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ”حیا اور شرم کا تعلق ایمان سے ہے اور ایمان کا نتیجہ جنت ہے۔ اور بے حیائی کا تعلق درشتی فطرت سے ہے اور درشتی فطرت کا نتیجہ دوزخ ہے۔“

تشریح: یعنی مومن حیادار ہوتا ہے۔ حیا ایمان کا مظہر ہے اور ایمان کا ایک سرا جنت سے ملا ہوا ہے۔ اہل ایمان کی منزل جنت ہی ہوگی۔

اس کے برعکس بے حیائی آدمی کے جفا کار ہونے کا ثبوت ہوتی ہے۔ جفا اور طبیعت کی درشتی بالآخر اسے لے ڈوبے گی۔ ایسا شخص زندگی کی حقیقی لذت سے نا آشنا رہتا ہے۔ اور یہی درشتیِ طبع دوزخ میں اس کے جا پہنچنے کا سبب بن جاتی ہے۔

﴿۲﴾ وَعَنْ اَنَسٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَا كَانَ الْفُحْشُ فِیْ شَیْءٍ اِلَّا شَانَهٗ وَمَا كَانَ الْحَیَآءُ فِیْ شَیْءٍ اِلَّا زَانَهٗ۔ (ترمذی)

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”جس چیز میں فحش اور بے حیائی کی بات ہوتی ہے وہ لازماً اسے عیب دار اور بدنما کر دیتی ہے اور حیا و شرم جس چیز میں ہوتی ہے وہ لازماً اسے خوش نما بنا دیتی ہے۔“

تشریح: یہ حقیقت ہے کہ حیا سراپا زینت اور بے حیائی سرتاپا بدنمائی اور عیب ہے۔ کسی شخص میں لاکھ خوبیاں ہوں لیکن اگر وہ بے شرم، بے غیرت اور بے حیا ہے تو اس کی تمام خوبیوں پر پانی پھر جائے گا اور وہ ہر کسی کی نگاہ سے گر جائے گا۔ اس کے برخلاف حیا جہاں اور جس رنگ میں پائی جائے گی حسن وخوش نمائی اور خوبی کا سبب بنے گی۔ بلاشبہ حیا زندگی کی زینت اور اخلاق و معاشرت کا حسن ہے۔

ذلت و پستی

خستِ نفس

﴿۱﴾ **عَنْ اَبِی الْاَحْوَصِ عَنْ اَبِیْهِ قَالَ: اَتَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ وَ عَلَیَّ ثَوْبٌ دُوْنٌ۔ فَقَالَ لِیْ: اَلَکَ مَالٌ؟ قُلْتُ: نَعَمْ۔ قَالَ: مِنْ اَیِّ الْمَالِ؟ قُلْتُ: مِنْ کُلِّ الْمَالِ قَدْ اَعْطَانِیَ اللّٰهُ مِنَ الْاِبِلِ وَالْبَقَرِ وَالْغَنَمِ وَالْخَیْلِ وَالرَّقِیْقِ۔ قَالَ: فَاِذَا اٰتَاکَ اللّٰهُ مَالاً فَلْیُرَ اَثَرُ نِعْمَةِ اللّٰهِ عَلَیْکَ وَ کَرَامَتِهٖ۔** (نسائی)

ترجمہ: حضرت ابوالاحوصؒ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ ان کا بیان ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، اس وقت میرے جسم پر نہایت خراب و خستہ کپڑے تھے۔ آپؐ نے مجھ سے فرمایا: ''کیا تمھارے پاس مال ہے؟'' میں نے عرض کیا، جی ہاں۔ آپؐ نے فرمایا: ''کس قسم کا مال ہے؟'' میں نے کہا کہ اللہ نے مجھے ہر قسم کے مال سے نوازا ہے۔ اونٹ، گائیں، بکریاں اور گھوڑے بھی ہیں اور غلام بھی۔ آپؐ نے فرمایا: ''جب خدا نے تجھے مال سے نوازا ہے تو خدا کی نعمت کا اور اس کی کرم فرمائی اور عزت بخشی کے اثر کا اظہار بھی ہونا چاہیے۔

تشریح: مطلب یہ ہے کہ خستِ نفس اور سفلہ پن کی ذہنیت ایک طرح سے کفرانِ نعمت ہے۔ اس سے احتراز کرنا چاہیے۔ البتہ اظہارِ نعمت میں آدمی کو اس طرح غلو سے بھی کام نہ لینا چاہیے کہ یہ چیز اسراف و تبذیر اور فخر و نمائش کی شکل اختیار کر لے۔

تنگ ظرفی و تنگ دلی

﴿۱﴾ **عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اَلْعَآئِدُ فِیْ هِبَتِهٖ کَالْکَلْبِ یَعُوْدُ فِیْ قَیْئِهٖ لَیْسَ لَنَا مَثَلُ السَّوْءِ۔** (بخاری)

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”عطیہ دے کر واپس لینے والا اس کتے کی طرح ہے جو قے کر کے اسے چاٹ لیتا ہے۔ یہ بُری مثال ہمارے لائق ہر گز نہیں۔“

تشریح: یعنی مومن کے لیے یہ ہرگز زیب نہیں دیتا کہ عطیہ دے کر وہ بلاوجہ اسے واپس لے لے۔ یہ نہایت ہی پست اور گھناؤنی بات ہوگی۔ مومن کے اندر کسی قسم کی تنگی نہ ہونی چاہیے۔ جو چیز اس کے شایانِ شان ہو سکتی ہے وہ اعلیٰ ظرفی ہے نہ کہ تنگ دلی و تنگ ظرفی۔

﴿۲﴾ وَ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍوؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِتَّقُوا الشُّحَّ فَاِنَّ الشُّحَّ اَهْلَکَ مَنْ کَانَ قَبْلَکُمْ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا: ”بخل و حرص سے بچو، کیوں کہ اس بخل و حرص نے تم سے پہلے کے لوگوں کو ہلاک کیا۔“

تشریح: یعنی شح یا بخل و حرص موجب ہلاکت ہے۔ پچھلی قومیں بھی اس کی وجہ سے ہلاکت سے دو چار ہوئی ہیں۔ اور یہ چیز زندگی کے لیے آئندہ بھی خطرناک ثابت ہو سکتی ہے قرآن میں ہے: وَمَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (الحشر: ۹) ”اور جو اپنے نفس کی حرص اور بخل سے بچا لیا جائے تو ایسے ہی لوگ کام یاب ہیں۔“

بخل اور تنگ دلی کے سبب سے آدمی میں مختلف قسم کی اخلاقی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ پچھلی قوموں میں جب یہ مرض سرایت کر گیا تو وہ قومیں دنیا پرست بن کر رہ گئیں۔ دنیا ہی کو انھوں نے اپنا قبلۂ مقصود بنا لیا۔ پھر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ باہم ایک دوسرے کے حقوق کو بھی پامال کرنے لگے۔ ان کے پیمانے دینے کے اور لینے کے اور ہو گئے۔ لیتے تو پورا پورا لیتے لیکن دینا ہوتا تو کم تولتے۔ ہمدردی و غم خواری کے جذبات ان کے یہاں بے معنی ہو کر رہ گئے۔ پھر یہ مرض اتنا بڑھا کہ ان کے لیے ہر نصیحت غیر موثر ثابت ہوئی۔ انجام کار تباہی و بربادی اور ہلاکت سے انھیں کوئی نہ بچا سکا۔ ایسی قوموں کا جو انجام مقدر ہے اسی سے ان کو دو چار ہونا پڑا۔

انسانی کردار کو اصلاً جو چیز مطلوب ہوا کرتی ہے، وہ ہے وسعتِ قلب اور لطافتِ احساس۔ اگر ہمارے اندر یہ چیز نہیں ہے تو حقیقت کی نگاہ میں ہم سے بڑھ کر بے مایہ کوئی نہیں ہے۔ کسی شخص یا قوم کو جاننے کے لیے اصلاً جو چیز دیکھنے کی ہوتی ہے، وہ یہ نہیں ہے کہ اس کے پاس کیا ساز و سامان اور کتنا مال ہے بل کہ دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ وہ شخص یا قوم خود کیا ہے؟ اس پہلو

سے ہمیں سب سے پہلے خود اپنا جائزہ لیتے رہنا چاہیے۔ انسان محض خاک وخون سے بنا ہوا محض کوئی ڈھانچہ نہیں ہے بل کہ وہ اس کے سوا کچھ اور ہے۔ بالعموم ہماری نگاہیں اسی ظاہری ڈھانچہ پر ٹک کر رہ جاتی ہیں۔ اس ہم اسی کو نفع ونقصان کا اصل معیار سمجھنے کی غلطی کر جاتے ہیں۔ ہم انسانی روح کو ہمیشہ نظر انداز کرتے رہتے ہیں جس کی تجلیات سے خود اس ظاہری وجود کا بھرم بھی قائم ہوتا ہے۔ اس مادی دنیا میں روح کا پورا ادراک تو مشکل ہے مگر قابلِ فہم الفاظ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ انسان درحقیقت ایک اخلاقی وجود ہے۔ اس طرح اس کی روح کی صحت اور عدم صحت کے بارے میں فیصلہ کرنا کچھ دشوار نہیں رہتا۔ روح کی صحت اور اس کے حسن کی علامت ذہن وقلب کی فراخی اور اعلیٰ ظرفی ہے۔ یہ چیز اگر آپ کو حاصل ہے تو آپ ایک صحت مند روح کے حامل ہیں۔ بہ صورت دیگر آپ کی روح کے بیمار ہونے میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا۔ پھر بیماری موت کا پیش خیمہ ہوا کرتی ہے۔ اگر صحت کی طرف سے غفلت برتی جائے تو اس کا انجام ہلاکت اور موت کے سوا کچھ دوسرا نہیں ہوتا۔

اسلامی تعلیمات میں حیرت انگیز حد تک اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ آدمی دنیا میں تنگی، دشواری اور مصائب کو قبول کر لے لیکن اپنی اخلاقی وروحانی موت کو قبول کرنے پر ہرگز آمادہ نہ ہو۔ روح کو ہلاکت سے بچانے کے لیے کسی بھی قربانی کے لیے آدمی کو تیار رہنا چاہیے اور اس کی حفاظت کے لیے ہر تکلیف ومصیبت اسے گوارا ہونی چاہیے۔

شح یا بخل درحقیقت روح انسانی کی موت ہے۔ شح وہ زنداں ہے جس میں مقید ہو کر انسانی روح گھٹ کر دم توڑ دیتی ہے، روح غیر مرئی ہے۔ یہ اس کی وسعت اور گہرائی کی علامت ہے۔ روح غیر مرئی ہونے کے باوجود مختلف اسالیب میں خود کو ظاہر کرتی ہے۔ ان اسالیب کا تعلق انسان کے جذبات واحساسات اور علم وعمل سے ہے۔ جذبات واحساسات اور عمل کے آئینہ میں روح کی جلوہ گری ممکن ہوتی ہے۔ جو لوگ ہدایت سے محروم ہوتے ہیں ان کے جذبات اور ان کی آرزوئیں نہایت پست قسم کی ہوتی ہیں ان کا علم بھٹکا ہوا اور ان کا عمل کسی اعلیٰ کردار کا مظہر نہیں ہوتا۔ پھر ان تینوں کے درمیان توازن اور کامل یگانگت اور ہم آہنگی بھی ان کے یہاں نہیں پائی جاتی جس کے سبب سے ان کی شخصیت حقیقی جاذبیت اور کشش سے بالکل عاری ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس کے برعکس جو لوگ شح اور بخل وحرص میں مبتلا نہیں ہوتے وہ بہ خوبی سمجھ سکتے ہیں کہ ان کو جو ذہنی

وقلبی فراخی حاصل ہے، وہ سب سے قیمتی شے ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو ہدایت کے صحیح مفہوم کو سمجھتے ہیں اور یہی وہ لوگ ہیں جو صحیح معنی میں حق کے لذت شناس ہوتے ہیں۔

بے غیرتی

⟨۱⟩ عَنْ سَعْدِ بْنِ اَبِیْ وَقَّاصٍ وَ اَبِیْ بَکْرَةَ قَالاَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنِ ادَّعٰی اِلٰی غَیْرِ اَبِیْهِ وَ هُوَ یَعْلَمُ (اَنَّهُ غَیْرُ اَبِیْهِ) فَالْجَنَّةُ عَلَیْهِ حَرَامٌ۔ (بخاری، مسلم، ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت سعد بن ابی وقاصؓ اور ابوبکرہؓ کہتے ہیں کہ رسولِ خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جس کسی نے اپنے آپ کو اپنے باپ کے سوا کسی اور کا بیٹا کہا، درآں حالیکہ وہ جانتا ہو کہ وہ شخص اس کا باپ نہیں، اس پر جنت حرام ہے۔''

تشریح: یہ نہایت ہی بے غیرتی اور کم ظرفی کی بات ہے کہ کوئی جان بوجھ کر خود کو ایسے شخص کی اولاد قرار دے جو فی الواقع اس کا باپ نہیں ہے۔ اپنے باپ کا انکار جرم کی نوعیت کے لحاظ سے کفر سے مشابہت رکھتا ہے۔ جنت ایسے گرے ہوئے رذیل اور کمینہ لوگوں کے بسنے کے لیے نہیں ہو سکتی۔

اس سے یہ بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جب اپنے اصل باپ کو چھوڑ کر اپنے آپ کو کسی دوسرے کی طرف منسوب کرنے کی وجہ سے آدمی جنت سے محروم ہو جاتا ہے تو خدا کو چھوڑ کر دوسروں کو اپنا خدا اور معبود قرار دینا کتنا بڑا جرم ہوگا۔

احسان فراموشی

⟨۱⟩ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرؓ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ اَنَّهُ قَالَ: یَا مَعْشَرَ النِّسَآءِ، تَصَدَّقْنَ وَاَکْثِرْنَ الْاِسْتِغْفَارَ فَاِنِّیْ رَاَیْتُکُنَّ اَکْثَرَ اَهْلِ النَّارِ۔ فَقَالَتِ امْرَاَةٌ مِّنْهُنَّ جَزْلَةٌ: وَّمَالَنَا یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، اَکْثَرَ اَهْلِ النَّارِ؟ قَالَ تُکْثِرْنَ اللَّعْنَ وَ تَکْفُرْنَ الْعَشِیْرَ، مَا رَاَیْتُ مِنْ نَاقِصَاتِ عَقْلٍ وَّ دِیْنٍ اَغْلَبَ لِذِیْ لُبٍّ مِّنْکُنَّ۔ قَالَتْ: یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَا نُقْصَانُ الْعَقْلِ وَالدِّیْنِ؟ قَالَ: اَمَّا نُقْصَانُ الْعَقْلِ فَشَهَادَةُ امْرَاَتَیْنِ تَعْدِلُ شَهَادَةَ رَجُلٍ، فَهٰذَا نُقْصَانُ الْعَقْلِ وَ تَمْکُثُ اللَّیَالِیَ مَا تُصَلِّیْ وَ تُفْطِرُ فِیْ رَمَضَانَ فَهٰذَا نُقْصَانُ الدِّیْنِ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے (خواتین سے) فرمایا: ''اے گروہِ زناں! صدقہ اور کثرت سے استغفار کرو کیوں کہ میں نے دیکھا کہ اہلِ دوزخ میں کثرت تم عورتوں کی ہے۔'' ان عورتوں میں سے ایک عقل مند عورت نے عرض کیا کہ یارسول اللہ، ایسا کیوں ہے کہ اہل دوزخ میں اکثریت ہم عورتوں کی ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''تم بہت زیادہ کوستی اور لعنت بھیجتی ہو اور شوہر کی ناشکری کرتی ہو۔ میں نے عقل و دین میں کم تر اور عقل مند کو مغلوب کر دینے والی تم سے بڑھ کر کسی کو نہیں دیکھا۔'' وہ عورت بولی کہ اے اللہ کے رسول، ہماری عقل اور دین میں کیا کمی ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''عقل کی تو اس سے ظاہر ہے کہ دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کی گواہی کے برابر قرار پاتی ہے۔ یہ عقل کی کمی ہوئی اور عورت (مہینے میں) کئی دن (حیض کے ایام میں) نماز نہیں پڑھتی اور رمضان میں (حیض کے دنوں میں) روزہ نہیں رکھتی، یہ دین میں کمی ہوئی۔''

تشریح: لعنت بھیجنی اور ناشکری کرنا یہ دو عیب ایسے ہیں جو مردوں کی بہ نسبت عورتوں میں زیادہ پائے جاتے ہیں وہ بات بات پر دوسروں کو کوسنے اور بد دعائیں دینے لگتی ہیں۔ اور اسی طرح بالعموم وہ اپنے شوہروں کے احسانات کو بھی خاطر میں نہیں لاتیں اور ناشکری ہی کرتی ہیں۔ یہ دونوں برائیاں ایسی ہیں کہ ان کی وجہ سے ان کا اخلاقی درجہ بہت ہی گر جاتا ہے۔ اور یہ ایسی خطرناک صورت حال ہوتی ہے کہ اگر وہ اپنے آپ کو اس اخلاقی پستی سے بچنے اور تلافیِ مافات کی فکر نہیں کرتیں تو وہ جہنم کی سزا کی مستحق ہو کر رہتی ہیں۔ اسی لیے آپؐ نے فرمایا کہ اپنی کمزوریوں کی تلافی صدقہ اور کثرتِ استغفار سے کرو اور کوشش کرو کہ تم ان برائیوں سے محفوظ رہ سکو۔

عورتوں میں ضبط و حفظ کی کمی ہوتی ہے۔ اسی لیے قرآن میں ہے: وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتَانِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ؕ (البقرہ: ۲۸۲) ''اور (لین دین کے معاملہ میں) اپنے مردوں میں سے دو گواہوں کی گواہی کرا لو اور اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں جنھیں تم گواہ ہونے کے لیے پسند کرو، گواہ ہو جائیں (دو عورتیں اس لیے رکھی گئی ہیں) تاکہ اگر ایک بھول جائے تو دوسری اسے یاد دلا دے۔''

عورت کی حیثیت صنف نازک کی ہے۔ جسمانی لحاظ ہی سے نہیں، ذہنی وفکری لحاظ سے بھی عورت صنف نازک ہے۔ اسی لیے اس پر زیادہ عقلی وفکری بوجھ نہیں ڈالا گیا کہ وہ مردوں کی طرح معاملات دنیا کو سمجھے اور ان کو سلجھانے کی کوشش کرے یہ ذمہ داری اصلاً مردوں کی ہے۔ عورت کو جسمانی اور ذہنی صلاحیت عطا کرنے میں یہ لحاظ رکھا گیا ہے کہ اس کی نسائیت برقرار رہے۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ عورت کے لیے اس کی اپنی نسائیت سے بڑھ کر کوئی دوسری چیز قدر و قیمت اور حسن وخوبی کی حامل نہیں ہوسکتی۔ اب اگر عورتوں میں ضبط وحفظ کی کمی پائی جاتی ہے تو یہ کوئی قابلِ اعتراض چیز نہیں ہے۔ البتہ یہ ایک حقیقت ہے جس کا اعتراف کرنا چاہیے۔

عورت باعتبار عقل، مرد سے خواہ پیچھے ہی کیوں نہ ہو لیکن اس میں کچھ ایسی رعنائی اور جاذبیت پائی جاتی ہے کہ وہ اپنے اس سحر سے بڑے سے بڑے عقل مند کو بے عقل بنا سکتی ہے۔

عورت ایام حیض میں نماز نہیں پڑھ سکتی اور نہ اس کے لیے ان ایام میں روزہ رکھنا جائز ہے جب کہ مرد کو اس طرح کی کوئی مجبوری لاحق نہیں ہوتی۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ مرد کے لیے عورت کے مقابلہ میں عبادت کا زیادہ موقع میسر ہوتا ہے۔ یہ ایک قسم کی فوقیت (Advantage) ہے جو مردوں کو عورتوں کے مقابلہ میں حاصل ہے۔ لیکن اس کی وجہ سے عورت کو کوئی مذموم وجود نہیں قرار دے سکتے۔ جو فرق بھی مرد اور عورت کے مابین پایا جاتا ہے وہ خدا کا قائم کیا ہوا ہے۔ دینی لحاظ سے مرد اگر عورت کے مقابلہ میں فائق نظر آتا ہے تو یہ فوقیت درحقیقت صورتاً ہے۔ ورنہ ایک مسلم خاتون بھی ہر حال میں خدا کی تابع فرمان اور اس کی رضا کی طالب ہوتی ہے۔ فرائض کے ادا کرنے میں مرد اور عورت کے درمیان جو فرق پایا جاتا ہے، اس پر اگر گہرائی کے ساتھ غور کریں تو وہ درحقیقت مرد وعورت کا فرق ہے جو عبادات میں بھی نمایاں ہے۔ حضور اکرم (ﷺ) کا اشارہ بھی دراصل اسی فرق کی طرف ہے۔

بخل

﴿۱﴾ عَنْ اَبِی هُرَیْرَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: یَتَقَارَبُ الزَّمَانُ وَ یَنْقُصُ الْعَمَلُ وَ یُلْقَی الشُّحُّ وَ یَکْثُرُ الْهَرَجُ۔ قَالُوْا وَمَا الْهَرَجُ؟ قَالَ: اَلْقَتْلُ، اَلْقَتْلُ۔

(بخاری)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ''زمانہ باہم (دنیا اور قیامت کا زمانہ) قریب ہوتا جائے گا اور اسی کے ساتھ عمل میں بھی کمی واقع ہوتی چلی جائے گی اور بخل وحرص (لوگوں کے دلوں میں) ڈالا جائے گا اور ہرج زیادہ ہوگا۔'' لوگوں نے پوچھا کہ ہرج کیا چیز ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''قتل، قتل۔''

تشریح: ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں: یَتَقَارَبُ الزَّمَانُ وَ یُقْبَضُ الْعِلْمُ وَ تَظْهَرُ الْفِتْنَةُ وَ یُلْقَی الشُّحُّ وَ یُكْثَرُ الْهَرَجُ۔ ''زمانہ باہم قریب ہوتا جائے گا اور علم اٹھالیا جائے گا اور فتنہ کا ظہور ہوگا اور بخل (دلوں میں) ڈالا جائے گا اور ہرج زیادہ ہوگا۔''

مطلب یہ ہے کہ قربِ قیامت کی یہ علامت ہے کہ لوگوں میں برائیاں بڑھتی چلی جائیں گی۔ علم اور عمل سے لوگ دور ہوتے جائیں گے۔ لوگوں میں حرص، تنگ دلی اور بخل بڑھ جائے گا۔ فتنے برپا ہوں گے۔ قتل اور خوں ریزی عام بات ہوگی۔

(۲) وَ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَا مِنْ یَّوْمٍ یُصْبِحُ الْعِبَادُ فِیْهِ اِلَّا مَلَكَانِ یَنْزِلَانِ فَیَقُوْلُ اَحَدُهُمَا: اَللّٰهُمَّ اَعْطِ مُنْفِقًا خَلَفًا وَّ یَقُوْلُ الْاٰخَرُ: اَللّٰهُمَّ اَعْطِ مُمْسِكًا تَلَفًا۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ''لازماً ہر ایک دن جب بندے صبح کرتے ہیں تو دو فرشتے اترتے ہیں۔ ان میں ایک کہتا ہے کہ اے اللہ، خرچ کرنے والے کو اور عطا فرما اور دوسرا کہتا ہے کہ اے اللہ، روکنے والے (بخیل) کو تباہ کر۔''

تشریح: فیاضی اللہ کو اس درجہ پسند ہے کہ خدا کا فرشتہ دعا کرتا ہے کہ اے خدا اسے اور عطا فرما تاکہ تیری خوش نودی کے لیے وہ اپنا مال خرچ کرتا رہے ــــــ اس کے برعکس بخل خدا کو اتنا مبغوض ہے کہ خدا کا فرشتہ اس سے یہ درخواست کرتا ہے کہ اپنا مال روک رکھنے والے کا مال تباہ و برباد کردیا جائے کہ اس سے تیرے بندوں یا تیرے دین کو کسی نفع کی امید نہیں ہے۔

یہ جو فرمایا کہ ہر روز جب لوگ صبح کرتے ہیں، لازماً یہ فرشتے اس طرح کی درخواست کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ آدمی کو ہر روز دنیا میں فیاض بن کر گزارنا چاہیے نہ کہ بخل، تنگ دلی اور تنگ نظری کے ساتھ اس کا دن بسر ہو۔

﴿۳﴾ وَ عَنۡهُ يَقُوۡلُ: سَمِعۡتُ رَسُوۡلَ اللّٰهِ ﷺ: يَقُوۡلُ: شَرُّ مَا فِيۡ رَجُلٍ شُحٌّ هَالِعٌ وَ جُبۡنٌ خَالِعٌ۔ (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: ''آدمی میں یہ خصلتیں سب سے بری ہیں: غم انگیز شدتِ بخل وحرص اور حد سے بڑھی ہوئی بزدلی۔''

تشریح: برائیاں اور بری خصلتیں تو اور بھی ہیں لیکن اگر کسی کے اندر حرص وبخل اور بزدلی کا مرض پایا جاتا ہے تو سمجھنا چاہیے کہ معاملہ انتہائی تشویش ناک (Serious) ہے۔ اس لیے کہ تنگ دل اور بزدل شخص دین کی برکتوں اور اس کی لذتوں سے محروم ہوتا ہے۔ دین اگر ہمارے اندر سے بخل اور بزدلی کو دور نہ کرسکا تو آخر اس سے ہم فیض یاب ہی کیا ہوئے۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ ایک بزدل اور بخیل وحریص سے نہ بندگانِ خدا کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے اور نہ ایسا شخص دینِ حق کا خادم ہی ہوسکتا ہے۔

﴿۴﴾ وَ عَنۡهُ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ ﷺ اَلسَّخِيُّ قَرِيۡبٌ مِّنَ اللّٰهِ، قَرِيۡبٌ مِّنَ النَّاسِ قَرِيۡبٌ مِّنَ الۡجَنَّةِ بَعِيۡدٌ مِّنَ النَّارِ، وَالۡبَخِيۡلُ بَعِيۡدٌ مِنَ اللّٰهِ بَعِيۡدٌ مِّنَ النَّاسِ بَعِيۡدٌ مِّنَ الۡجَنَّةِ قَرِيۡبٌ مِّنَ النَّارِ وَ لَجَاهِلٌ سَخِيٌّ اَحَبُّ اِلَى اللّٰهِ مِنۡ عَابِدٍ بَخِيۡلٍ۔ (ترمذی)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ''فیاض خدا سے قریب ہے، لوگوں سے قریب ہے اور جنت سے قریب ہے اور وہ دوزخ سے دور ہے۔ جب کہ بخیل اللہ سے دور ہے، لوگوں سے دور ہے اور جنت سے دور ہے اور وہ دوزخ سے قریب ہے۔ اور یقیناً ایک جاہل فیاض، اللہ کو ایک عبادت گزار بخیل سے زیادہ محبوب ہے۔''

تشریح: دنیا میں کام یاب انسان وہ ہے جسے قربِ خداوندی بھی حاصل ہو اور لوگوں کا بھی وہ منظورِ نظر ہو۔ جنت کا وہ مستحق ہو اور خدا کے عذاب یا دوزخ سے مامون ومحفوظ ہو۔ فیاضی اور سخاوت آدمی کو خدا سے قریب کرتی ہے۔ سخی اور فیاض سے لوگ بھی محبت کرتے ہیں۔ اب جس کسی کو خدا کا قرب حاصل ہو اور جس سے بندگانِ خدا کو بھی کوئی شکایت نہ ہو، اس کے جنتی ہونے میں کیا شبہ ہوسکتا ہے۔ البتہ شرط یہ ہے کہ اس کی زندگی میں کوئی ایسی خرابی نہ پائی جاتی ہو جس کی وجہ سے آدمی کے سارے اعمال اکارت جاتے ہیں۔ مثلاً کفر وشرک اور نفاق وغیرہ۔

خدا کی خاص صفت فیاضی ہے۔ وہ کسی بخیل کو اپنا قرب کیسے عطا کر سکتا ہے! بخیل اپنے بخل کی وجہ سے لوگوں کی نگاہوں سے بھی گر جاتا ہے۔ پھر جنت بھی ایسے شخص کی منتظر نہیں ہو سکتی۔ جنت کا استحقاق تو اخلاق کے ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے۔ اہل جنت تو وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو اخلاق کے اعلیٰ مقام پر ہوں۔ بخیل اور تنگ دل شخص تو اخلاق سے عاری ہوتا ہے۔ کسی کا بخل جس چیز سے اسے قریب کرتا ہے، وہ ہے خدا کا غضب اور دوزخ کی بھڑکتی ہوئی آگ۔

جاہل فیاض کو وہ چیز حاصل ہوتی ہے جو اصلاً زندگی میں مطلوب ہے یعنی روح کی کشادگی، نشاطِ قلب اور اخلاق حسنہ۔ جب کہ عبادت گزار بخیل اس سے محروم ہوتا ہے۔ وہ عبادت گزار تو کہلا سکتا ہے لیکن وہ کسی اعلیٰ کردار کا حامل نہیں ہو سکتا۔

﴿۵﴾ وَ عَنْ اَبِیْ بَکْرِ ِالصِّدِّیْقِؓ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ: لاَ یَدْخُلُ الْجَنَّةَ خِبٌّ وَّلاَ بَخِیْلٌ وَّلاَ مَنَّانٌ۔ (ترمذی)

ترجمہ: حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا: ''دھوکہ باز، بخیل اور احسان جتانے والا جنت میں داخل نہ ہو سکے گا۔''

تشریح: ایسے لوگ اگر جنت میں داخل ہو سکتے تو پھر دوزخ کو پیدا کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ جنت ان لوگوں کے لیے تیار کی گئی ہے جو اخلاقی برائیوں سے پاک اور اخلاقی خوبیوں کے حامل ہوں۔

جنت میں جو راحتیں ہیں اور وہاں جو لذتیں فراہم ہیں، وہ تو ان ہی لوگوں کو میسر آ سکتی ہیں جو ان لذتوں اور راحتوں کے قدر شناس اور ان کے طالب ہوں۔ اور یہ وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو جنت میں داخل ہونے سے پہلے اپنی تسکین، اخلاقی پاکیزگی اور نیک اعمال میں ڈھونڈتے ہیں۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ جنت کی راحتوں اور خوشیوں کا عکس اگر دیکھا جا سکتا ہے تو خدا کی یاد، نفوس کی پاکیزگی اور نیک اعمال میں ہی دیکھا جا سکتا ہے۔ اب اگر کسی کو ذکر اللہ اور نیک اعمال کی رغبت ہی نہیں ہے بل کہ اس کے برعکس وہ برے اخلاق کا حامل ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ درحقیقت جنت کا شایق ہی نہیں ہے اب اگر غیر شایقین کو جنت بخشی جائے تو یہ جنت کی قدر و منزلت کے منافی بات ہوگی۔

غصّہ

〈۱〉 عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ ؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: لَیْسَ الشَّدِیْدُ بِالصُّرْعَةِ، اِنَّمَا الشَّدِیْدُ الَّذِیْ یَمْلِکُ نَفْسَهٗ عِنْدَ الْغَضَبِ۔ (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”پہلوان اور طاقت ور وہ نہیں ہے جو لوگوں کو کشتی میں پچھاڑ دے بل کہ قوی وہ ہے جو غصّہ کے موقع پر اپنے آپ کو قابو میں رکھے۔“

تشریح: آدمی کو سب سے مشکل اپنے نفس کو زیر کرنے میں پیش آتی ہے۔ اس لیے جو شخص غصہ میں اپنے نفس پر قابو پا سکے وہ شجاعت میں سب سے بڑھ کر ہے۔

سخت ناگوار بات پر آدمی کو غصہ آتا ہی ہے۔ یہ بالکل فطری بات ہے۔ مطلوب یہ نہیں ہے کہ آدمی کو سرے سے غصہ آئے ہی نہیں بل کہ جو چیز مطلوب ہے وہ یہ کہ وہ غصّہ اور غیض و غضب سے مغلوب نہ ہو کہ ایسی حرکتیں کرنے لگ جائے جو کسی طرح اس کے لیے زیبا نہیں ہیں۔

〈۲〉 وَ عَنْ بَهْزِ بْنِ حَکِیْمٍ عَنْ اَبِیْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اِنَّ الْغَضَبَ لَیُفْسِدُ الْاِیْمَانَ کَمَا یُفْسِدُ الصِّبْرُ الْعَسَلَ۔

ترجمہ: حضرت بہز بن حکیمؓ اپنے والد سے اور وہ ان کے دادا (اپنے والد) سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”غصّہ ایمان کو خراب کر دیتا ہے جس طرح سے ایلوا شہد کو خراب کر دیتا ہے۔“

تشریح: ایمان آدمی کے اندر صرف یقین وعقیدہ ہی بن کر نہیں رہتا بل کہ ایمان کے زیر اثر آدمی ایک خاص قسم کے اخلاق کا حامل ہوتا ہے۔ یہ اخلاق اپنی دل کشی اور جاذبیت میں اپنی مثال آپ ہوتا ہے۔ اب اگر ہم غصّہ پر قابو نہ رکھ سکیں تو ہمارا مومنانہ اخلاق یقیناً اس سے متاثر ہو کر رہے گا اور اس کی جاذبیت ودل کشی میں نمایاں فرق واقع ہو جائے گا۔ اور یہ کوئی معمولی نقصان کی بات ہرگز نہ ہوگی۔ جس طرح ایلوا کی تلخی شہد کو خراب کر دیتی ہے اسی طرح غصّہ ایمانی کیفیت کے لیے تباہ کن ہوتا ہے۔

﴿۳﴾ وَ عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ رضی اللہ عنہ اَنَّ رَجُلاً قَالَ لِلنَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وسلم: اَوْصِنِیْ۔ قَالَ: لَا تَغْضَبْ۔ فَرَدَّدَ ذٰلِکَ مِرَارًا۔ قَالَ: لَا تَغْضَبْ۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ مجھے کوئی وصیت فرمائیں۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا: ''غصّہ مت کیا کرو۔'' اس شخص نے اپنی درخواست کئی بار دہرائی۔ آپؐ نے ہر بار یہی ارشاد فرمایا: ''غصّہ مت کیا کرو۔''

تشریح: ایک روایت میں ہے کہ ایک شخص رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے آپؐ سے عرض کیا: یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ، عَلِّمْنِیْ کَلِمَاتٍ اَعِیْشُ بِھِنَّ وَلَا تُکْثِرْ عَلَیَّ فَاَنْسٰی، ''اے اللہ کے رسولؐ، آپؐ مجھے چند باتیں تعلیم فرمائیں کہ میں ان سے فائدہ اٹھاؤں۔ زیادہ باتیں نہ بتائیں، میں بھول جاؤں گا۔'' آپؐ نے فرمایا: لَا تَغْضَبْ ''غصہ مت کیا کرو۔''

ممکن ہے آپؐ سے وصیت اور نصیحت کی درخواست کرنے والے صحابیؓ مزاج کے ذرا تیز رہے ہوں، اس لیے آپؐ نے ان کو یہ نصیحت کی ہو کہ غصہ مت کیا کرو۔'' پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جو شخص غصہ پر قابو رکھ سکے گا وہ نفس کے دوسرے غلط تقاضوں پر بھی قابو پا سکے گا۔ یہ بڑا کلیہ ہے جو آپؐ نے انھیں بتایا۔

غصہ کا انجام کبھی اچھا نہیں ہوتا۔ غصّہ کی حالت میں شیطان انسان پر بہ آسانی قابو پالیتا ہے اور پھر اس سے ایسی حرکتیں سرزد ہوتی ہیں کہ جن کا عام حالات میں کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا۔ غصہ کی حالت میں کفریہ کلمات تک لوگ بک جاتے ہیں۔

یہاں یہ بات پیش نظر رہے کہ جس غصہ کی مذمت فرمائی گئی ہے اس سے مراد وہ غصہ ہے جس کے پیچھے نفسانیت کام کررہی ہو۔ اور جس سے مغلوب ہوکر انسان حدودِ الٰہی سے تجاوز کر جاتا ہے۔ لیکن وہ غصّہ جو اپنی ذات کے لیے نہ ہو بل کہ وہ غصہ دشمنانِ دین کی ریشہ دوانیوں اور فتنہ پردازیوں پر آرہا ہو تو وہ ہرگز مذموم نہیں ہے بل کہ ایسا غصہ تو محمود ہے بہ شرطے کہ دشمنانِ حق کے خلاف جو اقدام بھی کیا جائے اس میں حق وانصاف اور حدود کا پورا لحاظ رکھا جاسکے۔

﴿۴﴾ وَ عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم: مَا تَجَرَّعَ عَبْدٌ اَفْضَلَ عِنْدَ اللّٰہِ عَزَّوَجَلَّ مِنْ جُرْعَۃِ غَیْظٍ یَکْظِمُھَا ابْتِغَآءَ وَجْہِ اللّٰہِ تَعَالٰی۔ (احمد)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اللہ عزوجل

کے نزدیک کسی بندے نے غصہ کے اس گھونٹ سے بہتر کوئی گھونٹ نہیں پیا جسے وہ اللہ تعالیٰ کی خوش نودی کے لیے پی جائے۔''

تشریح: یوں تو زندگی میں کتنی ہی ایسی چیزیں ہوسکتی ہیں جن کو انگیز کرنا اور پی جانا خوش نودیِ رب کا باعث ہوتا ہے لیکن خوش نودیِ رب کی خاطر غصہ کو پینا ان سب میں افضل ہے۔ اس لیے کہ غصہ کا گھونٹ پینا نہایت مشکل اور دشوار ہوتا ہے۔ جس شخص کو اپنے غصہ پر قابو حاصل ہوگیا سمجھ لیجیے کہ اس ایک خوبی کی وجہ سے اس کے لیے کتنی ہی خوبیوں کے دروازے وا ہوں گے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت جن محسنین کے لیے آراستہ کی گئی ہے، ان میں جہاں دوسری پاکیزہ صفات پائی جاتی ہیں وہیں یہ بات بھی ہے کہ ''غصّہ کو پی جانے والے اور لوگوں سے درگزر کا معاملہ کرنے والے ہیں۔'' وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ط (آلِ عمران: ۱۳۴)

﴿۵﴾ وَ عَنْ اَنَسٍ رضی اللہ عنہ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: مَنْ خَزَنَ لِسَانَهٗ سَتَرَ اللّٰهُ عَوْرَتَهٗ وَ مَنْ كَفَّ غَضَبَهٗ كَفَّ اللّٰهُ عَنْهُ عَذَابَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَ مَنِ اعْتَذَرَ اِلَى اللّٰهِ قَبِلَ اللّٰهُ عُذْرَهٗ۔ (البیہقی فی شعب الایمان)

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس کسی نے اپنی زبان کو بند رکھا اللہ اس کے عیب کی پردہ پوشی فرماتا ہے اور جس کسی نے اپنے غصّہ کو روکا اللہ قیامت کے روز اس سے اپنے عذاب کو روک لے گا اور جو کوئی اپنی خطا کی معذرت خدا کے حضور کرتا ہے اللہ اس کی معذرت قبول فرماتا ہے۔''

تشریح: خدا کا رویہ بندے کے ساتھ کیا ہوتا ہے، اس کا دارومدار اس پر ہے کہ خود بندہ اپنے رب کے ساتھ کیا رویہ اختیار کرتا ہے اور اس کا سلوک اس کے بندوں کے ساتھ کیسا ہوتا ہے۔ جو شخص دوسروں کی اپنی زبان سے برائی نہیں کرتا اور نہ انھیں ذلیل و رسوا کرتا ہے تو ایسے شخص کی پردہ پوشی خود خدا کرتا ہے اور اس کے عیبوں کو چھپاتا ہے ورنہ خدا جس کسی کی پردہ دری پر آجائے وہ اسے تمام خلائق میں بدنام اور رسوا کر کے رہے۔

اسی طرح جو شخص سخت ناگواری محسوس کرنے کے باوجود لوگوں پر اپنا غصہ نہیں اتارتا بل کہ اپنے غصہ کو پی جاتا ہے تو خدا کا رویہ بھی اس کے ساتھ یہی ہوتا ہے۔ وہ ایسے شخص کو اپنے غضب اور عذاب سے محفوظ رکھتا ہے۔ اسی طرح یہ بھی ناممکن ہے کہ کوئی سچے دل سے توبہ کرے

اور خدا سے اپنی خطاؤں کی معافی طلب کرے اور خدا اسے معاف نہ کرے۔ خدا سے بڑھ کر معذرت قبول کرنے والا دوسرا کوئی نہیں ہوسکتا۔ بہ شرطے کہ یہ معذرت رسمی نہ ہو بل کہ بندہ سچے دل سے خدا کے حضور معذرت خواہ ہو۔

﴿۶﴾ وَ عَنْ مُعَاذِ بْنِ اَنَسٍؓ اَنَّ النَّبِیَّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: مَنْ كَظَمَ غَيْظًا وَ هُوَ قَادِرٌ عَلٰی اَنْ يُّنْفِذَهٗ، دَعَاهُ اللّٰهُ عَلٰی رُءُوْسِ الْخَلَآئِقِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ حَتّٰی يُخَيِّرَهٗ فِیْ اَیِّ الْحُوْرِ الْعِيْنِ مَاشَآءَ۔ (ترمذی، ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت معاذ بن انسؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جو شخص غصہ کو پی جائے حالاں کہ وہ اس پر قادر ہو کہ اپنے غصّہ کے تقاضے کو نافذ اور پورا کرے، اللہ اسے قیامت کے روز ساری خلقت کے سامنے بلائے گا اور اس کو اختیار دے گا کہ وہ جنت کی کشادہ چشم حوروں میں سے جس کو چاہے اپنے لیے منتخب کرلے۔“

تشریح: یعنی جو شخص ایسا نیک ہو کہ قدرت حاصل ہونے کے باوجود انتقام لینے کی نہ سوچے بل کہ اپنے غصہ کو پی جائے تو خدا کی پاک ذات اس کی قدرداں ہوتی ہے۔ خدا قیامت کے روز اس کی قدرافزائی تمام خلائق کے سامنے فرمائے گا۔ دنیا میں خواہ کسی کو اس کی پاکیزگی اور بلند کرداری کا احساس نہ ہوا ہو لیکن آخرت میں خدا ہر ایک کو اس کا احساس کرادے گا کہ وہ ایک بلند کردار کا حامل انسان ہے۔ پھر وہ شخص اپنی عالی ظرفی اور نفیس الطبعی کا انعام کشادہ چشم، حسین حورِ بہشتی کی صورت میں حاصل کرلے گا۔

﴿۷﴾ وَ عَنْ اَبِیْ ذَرٍّؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: اِذَا غَضِبَ اَحَدُكُمْ وَ هُوَ قَائِمٌ فَلْيَجْلِسْ فَاِنْ ذَهَبَ عَنْهُ الْغَضَبُ وَ اِلَّا فَلْيَضْطَجِعْ۔ (احمد، ترمذی)

ترجمہ: حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جب تم میں سے کسی کو غصّہ آئے اور وہ کھڑا ہو تو چاہیے کہ وہ بیٹھ جائے، پھر اگر اس کا غصّہ جاتا رہے تو فبہا ورنہ اسے لیٹ جانا چاہیے۔“

تشریح: غصہ کو فرو کرنے کی یہ ایک کارگر نفسیاتی تدبیر ہے جو نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بتائی ہے۔ آدمی کھڑا ہو تو بیٹھ جائے یا پھر لیٹ جائے تو اس سے اپنے نفس پر قابو پانے میں بڑی آسانی ہوتی ہے

اوراس کا امکان بہت کم باقی رہتا ہے کہ وہ ایسی بے جا اور لغو قسم کی حرکتیں کرے جو بالعموم غصہ کی حالت میں لوگوں سے سرزد ہوتی ہیں۔

﴿۸﴾ وَ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: عَلِّمُوْا وَ يَسِّرُوْا وَلاَ تُعَسِّرُوْا وَ اِذَا غَضِبَ اَحَدُكُمْ فَلْيَسْكُتْ وَ اِذَا غَضِبَ اَحَدُكُمْ فَلْيَسْكُتْ وَ اِذَا غَضِبَ اَحَدُكُمْ فَلْيَسْكُتْ۔ (احمد، الطبرانی فی الکبیر)

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ''لوگوں کو تعلیم دو، اور آسانی پیدا کرو، دشواری پیدا نہ کرو اور جب تم میں سے کسی شخص کو غصہ آجائے تو اسے چاہیے کہ خاموشی اختیار کرلے، تم میں سے کسی شخص کو غصہ آجائے تو اسے چاہیے کہ خاموشی اختیار کرلے، تم میں سے کسی شخص کو غصہ آجائے تو اسے چاہیے کہ خاموشی اختیار کرلے۔''

تشریح: اس حدیث سے کئی باتیں معلوم ہوئیں۔ لوگوں کو دین کی تعلیم سے روشناس کرانا ضروری ہے۔ تنگی اور دشواری کی جگہ آسانی اور سہولت پیدا کرنے کی کوشش ہونی چاہیے۔ اور اگر کسی بات پر غصہ آجائے تو آدمی کو خاموش رہنے کا فیصلہ کرلینا چاہیے۔ ایک خاموشی ہزار مصیبتوں سے نجات دلاتی ہے۔ اس کو نہ بھولنا چاہیے۔ خاموشی اختیار کرلینے سے بات کے آگے بڑھنے کا امکان باقی نہیں رہتا۔ ورنہ غصہ میں بات بڑھتے بڑھتے اکثر ہاتھا پائی تک کی نوبت آجاتی ہے جو کسی طرح مومن کے شایانِ شان نہیں ہے۔

﴿۹﴾ وَ عَنْ عَطِيَّةَ بْنِ عُرْوَةَ السَّعْدِيِّؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اِنَّ الْغَضَبَ مِنَ الشَّيْطَانِ وَ اِنَّ الشَّيْطَانَ خُلِقَ مِنَ النَّارِ وَ اِنَّمَا تُطْفَأُ النَّارُ بِالْمَآءِ فَاِذَا غَضِبَ اَحَدُكُمْ فَلْيَتَوَضَّأْ۔ (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت عطیہ بن عروہ سعدیؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''غصہ شیطان کے اثر سے آتا ہے اور شیطان آگ سے پیدا کیا گیا ہے اور آگ صرف پانی سے بجھتی ہے۔ لہٰذا جب تم میں سے کسی شخص کو غصّہ آئے تو اسے چاہیے کہ وضو کرلے۔''

تشریح: اس حدیث میں بھی غصہ کا ایک علاج تجویز فرمایا گیا ہے۔ وہ یہ کہ اگر کسی کو غصہ آجائے تو وہ وضو کرلے۔ اس سے اس کا غصہ فرو ہوجائے گا۔ بتایا گیا کہ غصہ (بالعموم) شیطان

کے زیر اثر آتا ہے اور شیطان آتشی مزاج رکھتا ہے۔ جس طرح آگ کو پانی سے بجھاتے ہیں اسی طرح شیطان کے اثر کو زائل کرنے کے لیے بھی پانی استعمال کرنا چاہیے۔ غصہ آجائے اور اس پر آدمی قابو نہ پا رہا ہو تو وہ اٹھ کر وضو کر لے۔

شدت پسندی و درشت مزاجی

﴿۱﴾ عَنْ حَارِثَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ الْجَوَّاظُ الْجَعْظَرِيُّ۔

(شرح السنہ)

ترجمہ: حضرت حارثہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ''جنت میں اجڈ، سخت گو شخص داخل نہ ہوگا۔''

تشریح: جَوَّاظ کے معنی بعض اہل علم نے متکبر بھی لیے ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ جواظ وہ ہے جو مال جمع کرے اور سائل کو نہ دے۔

سختی و درشتی خواہ مزاج میں ہو یا رویہ میں، یہ ایک نہایت ناپسندیدہ چیز ہے۔ ناپسندیدہ اور مبغوض شے کا جنت سے کوئی رشتہ نہیں ہو سکتا۔

اسلام دلوں کو اطمینان اور روح کو آرام دینے آیا ہے۔ وہ ذہنوں کو کشادہ کرتا اور دلوں کو زندگی بخشتا ہے۔ وہ بے حوصلہ لوگوں کو حوصلہ عطا کرتا ہے۔ وہ ٹوٹے ہوئے دلوں کے لیے امید بن کر ظاہر ہوا ہے۔ وہ لوگوں کو ان کی فلاح و کامرانی کی راہ پر لگانا چاہتا ہے۔ اسلام جس کا پیغام محبت ہو، جو اتحاد و اتفاق اور مساوات و عدل کی تعلیم دیتا ہو۔ جو اتنا کشادہ داماں ہو کہ ساری انسانیت کو ایک کنبہ قرار دیتا ہو۔ عفو و درگزر سے کام لینے کی تاکید کرتا ہو۔ کُوْنُوْا عِبَادَ اللّٰهِ اِخْوَانًا (خدا کے بندے اور بھائی بھائی بن کر رہو) جس کا مطالبہ ہو، وہ سخت گیری کو کیسے پسند کر سکتا ہے۔ بے جا سختی کسی بھی معاملہ میں اسے پسند نہیں سخت گیری اور شدت پسندی نہ دین کے معاملہ میں صحیح ہے اور نہ دنیوی امور میں صحیح ہو سکتی ہے۔ وہ لوگ اسلام کے مزاج سے قطعاً ناآشنا ہیں جو چھوٹی چھوٹی باتوں کو لے کر طوفان کھڑا کر دیتے ہیں۔ اسلام جس تہذیب اور نظامِ فکر و عمل کا علم بردار ہے اس کی نمائندگی وہ شخص ہرگز نہیں کر سکتا جو بدخو اور سخت دل ہو۔ پھر جسے نہ تو اسلام کی نمائندگی کی فکر ہے اور نہ وہ ذاتی حیثیت سے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اپنی شخصیت کی تعمیر

کی فکر رکھتا ہے، اس کو آخر کس طرح یہ خوش خبری سنائی جائے کہ تم چاہے جیسے ہو، تمھارے لیے جنت میں اعلیٰ قسم کی رہائش گاہ کا الاٹمنٹ ہو چکا ہے۔

〈۲〉 وَ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَؓ قَالَ: بَالَ اَعْرَابِیٌّ فِی الْمَسْجِدِ فَقَامَ النَّاسُ اِلَیْهِ لِیَقَعُوْا فِیْهِ، فَقَالَ النَّبِیُّ صلی اللہ علیہ وسلم: دَعُوْهُ وَ اَرِیْقُوْا عَلٰی بَوْلِهٖ سَجْلاً مِّنْ مَّآءٍ اَوْ ذَنُوْبًا مِّنْ مَّآءٍ۔ فَاِنَّمَا بُعِثْتُمْ مُیَسِّرِیْنَ وَلَمْ تُبْعَثُوْا مُعَسِّرِیْنَ۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دیہاتی نے مسجد میں پیشاب کر دیا۔ لوگ اس پر بگڑنے لگے۔ آپؐ نے فرمایا: ”اسے چھوڑ دو اور اس کے پیشاب پر ایک بڑا ڈول پانی بہا دو۔ تم تو آسانی پیدا کرنے کے لیے بھیجے گئے ہو۔ سختی کے لیے تمھیں نہیں بھیجا گیا ہے۔“

تشریح: اس حدیث سے بہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام میں ضبط و تحمل اور عفو و درگزر سے کام لینے کی کس درجہ اہمیت ہے۔ اشتعال یا بے جا سختی اور شدت پسندی مومن کے شایانِ شان ہرگز نہیں ہو سکتی۔

سخت دلی

〈۱〉 عَنِ ابْنِ عُمَرَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم: لَا تُكْثِرُوا الْكَلَامَ بِغَیْرِ ذِكْرِ اللّٰهِ تَعَالٰی فَاِنَّ كَثْرَةَ الْكَلَامِ بِغَیْرِ ذِكْرِ اللّٰهِ قَسْوَةٌ لِّلْقَلْبِ وَ اِنَّ اَبْعَدَ النَّاسِ مِنَ اللّٰهِ الْقَلْبُ الْقَاسِیْ۔ (ترمذی)

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”ذکر اللہ کے بغیر بہت باتیں نہ کیا کرو کیوں کہ بغیر ذکر اللہ کے بسیار گوئی دل کی سختی کا باعث ہوتی ہے اور یاد رکھو، لوگوں میں خدا سے سب سے زیادہ دور وہ شخص ہوتا ہے جو دل کا سخت ہو۔“

تشریح: یہ حدیث بتاتی ہے کہ آدمی کی زندگی کی کام یابی کا اصل راز یہ ہے کہ وہ ہمیشہ خدا سے قریب رہے۔ خدا کا ذکر اور اس کی یاد ہی آدمی کو خدا سے قریب رکھتی ہے۔ ذکر ہی قلب کی اصل غذا ہے۔ یہی دل کو گداز رکھتا ہے۔ دل کی نرمی اور رقت ہی دل کی اصل حقیقت ہے۔ اگر دل میں نرمی باقی نہ رہے تو حقیقت میں وہ دل ہی نہیں رہتا۔ دل سے محرومی انسان کو خدا سے بھی

محروم کر دیتی ہے۔ اس لیے کہ دل ہی وہ چیز ہے جس کے ذریعہ سے انسان کا اپنے رب سے تعلق قائم ہوتا ہے۔

یہ حدیث یہ بھی بتاتی ہے کہ بسیار گوئی دل کی سختی اور قساوتِ قلبی کا سبب بنتی ہے۔ بہت زیادہ بولنے والا بالعموم اپنی ہی بات کی دھن میں رہتا ہے۔ اسے دوسروں کی باتوں کی بہت ہی کم پروا ہوتی ہے۔ خواہ دوسرے کی بات حق ہی کیوں نہ ہو۔ پھر ایسا شخص لوگوں سے اختلاط و ارتباط کا زیادہ خواہش مند رہتا ہے تاکہ اسے اپنی بات کا سکہ بٹھانے کا موقع مل سکے۔ یہ چیز اسے اس بات سے غافل رکھتی ہے کہ اسے زندگی میں اصلاً کس بات کی فکر رکھنی چاہیے اور فی الواقع وہ کون سی چیز ہے جس میں خدا نے انسانوں کے لیے فی الاصل تسکین کا سامان کر رکھا ہے۔

(۲) وَ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَؓ اَنَّ رَجُلاً شَکَا اِلَی النَّبِیِّ ﷺ قَسْوَةَ قَلْبِهٖ. قَالَ: اِمْسَحْ رَأْسَ الْیَتِیْمِ وَ اَطْعِمِ الْمِسْکِیْنَ. (احمد)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے نبی ﷺ سے اپنی قساوتِ قلبی کی شکایت کی۔ آپؐ نے فرمایا: ”یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرا کرو اور مسکین کو کھانا کھلایا کرو۔“

تشریح: اس سے پہلے جو حدیث گزر چکی ہے اس میں قلب کی صحت اور درستی کے لیے یہ ضروری قرار دیا گیا ہے کہ آدمی خدا کے ذکر اور اس کی یاد سے کبھی غافل نہ رہے۔ اس حدیث میں آپؐ نے قساوتِ قلبی (سخت دلی) کا ایک علاج تجویز فرمایا ہے۔ اور وہ یہ کہ آدمی یتیموں کے سر پر شفقت کا ہاتھ پھیرے اور مسکینوں اور بھوکوں کو کھانا کھلائے۔ یہ علاج نفسیات کے اصول کے عین مطابق ہے۔ جن لوگوں کے دلوں میں نرمی یا رحم کا جذبہ پایا جاتا ہے وہ بھوکوں اور مسکینوں کو دیکھ کر تڑپ اٹھتے ہیں۔ وہ ان بھوکوں کو کھلانے کی فکر کرتے ہیں۔ اسی طرح یتیموں پر انھیں رحم آتا ہے اور وہ ان کے سر پر شفقت و محبت کا ہاتھ پھیرتے ہیں تاکہ انھیں اپنی بے چارگی کا احساس نہ ستائے اور وہ یہ سمجھ سکیں کہ دنیا میں ان سے بھی پیار اور محبت کرنے والے لوگ موجود ہیں۔ اب ایسے نرم اور رحم دل لوگوں کے طرزِ عمل کو اختیار کرنے سے لازماً سخت دل آدمی کے دل میں بھی رحم کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور دھیرے دھیرے اس کے دل کی سختی دور ہو سکتی ہے۔

اس کے علاوہ یتیم موت کی یاد دلاتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ موت ہی نے اس سے اس کے باپ کو جدا کیا ہے۔ موت کا خیال آتے ہی دل نرم پڑ جاتا ہے۔ مسکین کو کھانا کھلانا آدمی کو خدا

کا وہ احسان یاد دلاتا ہے جو خدا نے اس پر اسے غنی بنا کر کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں بھی آدمی کے دل کی کیفیت وہ نہیں رہتی جو ایک سخت دل شخص کے دل کیفیت ہوتی ہے۔

عداوت

﴿۱﴾ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَؓ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ: اِیَّاکُمْ وَالظَّنَّ فَاِنَّ الظَّنَّ اَکْذَبُ الْحَدِیْثِ وَلاَ تَجَسَّسُوْا وَلاَ تَحَسَّسُوْا وَلاَ تَبَاغَضُوْا وَ کُوْنُوْا اِخْوَانًا وَلاَ یَخْطُبُ الرَّجُلُ عَلٰی خِطْبَةِ اَخِیْهِ حَتّٰی یَنْکِحَ اَوْ یَتْرُکَ۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”بدگمانی سے بچو، اس لیے کہ بدگمانی سب سے جھوٹی بات ہے۔ اور نہ تو لوگوں کی باتوں کی ٹوہ میں رہو اور نہ باہم دشمنی کرو بل کہ ایک دوسرے کے بھائی بنے رہو۔ اور کوئی شخص اپنے بھائی کی منگنی پر منگنی کا پیغام نہ بھیجے یہاں تک کہ وہ نکاح کر لے یا پھر منگنی چھوڑ دے۔“

تشریح: یہ حدیث بتاتی ہے کہ اہل ایمان کے باہمی تعلقات کس درجہ خوش گوار ہونے چاہئیں۔ اسلام جس مثالی معاشرہ کی تعمیر کا مطالبہ کرتا ہے اس کے لیے ناگزیر ہے کہ معاشرہ کے افراد کے دل ایک دوسرے کی طرف سے بالکل صاف ہوں۔ ان میں ایک دوسرے کے لیے دشمنی یا نفرت کا جذبہ ہرگز نہ پایا جائے۔ وہ ایک دوسرے کی کم زوریوں کی تلاش میں نہ رہیں بل کہ ہر شخص اپنے بھائی کی عزت و آبرو کا محافظ ہو۔ وہ کوئی ایسا کام نہ کریں جس سے دوسرے کی دل شکنی ہو اور جو ہم دردی اور بہی خواہی کے منافی ہو۔ مثال کے طور پر اگر کسی نے کسی کے یہاں شادی کا پیغام بھیجا ہے تو پھر یہ کسی طرح درست نہ ہوگا کہ کوئی دوسرا شخص اس پیغام کے بعد وہاں اپنا پیغام بھیجے۔ ہاں، اگر لڑکی والے اس پیغام کو قبول نہ کریں یا کسی وجہ سے منگنی کا پیغام بھیجنے والا خود ہی اپنے پیغام کو واپس لے لے تو پھر دوسرے شخص کو یہ حق حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ وہاں شادی کا پیغام بھیجے۔

﴿۲﴾ وَ عَنْهُ، اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: اِیَّاکُمْ وَالظَّنَّ فَاِنَّ الظَّنَّ اَکْذَبُ الْحَدِیْثِ وَلاَ تَجَسَّسُوْا وَلاَ تَحَسَّسُوْا وَلاَ تَنَافَسُوْا وَلاَ تَحَاسَدُوْا وَلاَ تَبَاغَضُوْا وَلاَ تَدَابَرُوْا وَ کُوْنُوْا عِبَادَ اللّٰهِ اِخْوَانًا۔ (مؤطا امام مالک)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بدگمانی سے بچو، کیوں کہ بدگمانی سب سے جھوٹی بات ہے۔ اور نہ تو لوگوں کی برائیوں کی ٹوہ میں رہو اور نہ تفتیش کرو اور نہ (دنیا کی) حرص کرو اور نہ حسد کرو اور نہ بغض رکھو اور نہ ایک دوسرے سے پیٹھ پھیرو بلکہ اللہ کے بندے اور بھائی بھائی ہو کر رہو۔''

تشریح: اس حدیث میں بھی اس تدبیر کا ذکر فرمایا گیا ہے کہ کس طرح اسلامی معاشرہ کی پاکیزگی کو باقی رکھا جائے۔ بالعموم دنیا کی حرص آدمی کو بے انصافی اور ظلم پر آمادہ کرتی ہے اور وہ اس اعلیٰ ظرفی اور بلندی کا اظہار نہیں کر پاتا جو اسلام کو مطلوب ہے۔ اس لیے اس میں دنیا کی حرص اور ہوس سے باز رہنے کی تاکید فرمائی گئی ہے۔

اس حدیث میں نہایت مختصر اور جامع الفاظ میں اسلامی معاشرہ کی اصل خصوصیت بیان فرمائی گئی ہے جو اس کی ایک واضح مثال ہے کہ حضور ﷺ کو خدا کی طرف سے جوامع الکلم عطا فرمایا گیا تھا۔ آپؐ فرماتے ہیں: کُوْنُوْا عِبَادَ اللّٰہِ اِخْوَانًاط (اللہ کے بندے اور بھائی بھائی ہو کر رہو) کتنے حسین و موثر الفاظ میں اہل ایمان کی حسین تصویر پیش کر دی گئی ہے۔ مومن خدا کے باغی نہیں بل کہ اس کے فرماں بردار بندے ہوتے ہیں اور وہ باہم ایک دوسرے کے دشمن بن کر نہیں بل کہ بھائی بن کر رہتے ہیں۔ ایسے بھائی جو ایک دوسرے کے خیر خواہ و غم گسار ہوتے ہیں۔

﴿۳﴾ وَ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: تُفْتَحُ اَبْوَابُ الْجَنَّةِ یَوْمَ الْاِثْنَیْنِ وَ یَوْمَ الْخَمِیْسِ، فَیُغْفَرُ لِکُلِّ عَبْدٍ لَّا یُشْرِکُ بِاللّٰهِ شَیْئًا اِلَّا رَجُلًا کَانَتْ بَیْنَهٗ وَ بَیْنَ اَخِیْهِ شَحْنَآءُ فَیُقَالُ: اَنْظِرُوْا هٰذَیْنِ حَتّٰی یَصْطَلِحَا۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''دوشنبہ اور پنج شنبہ کے روز جنت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں اور ہر ایسے بندے کی مغفرت کر دی جاتی ہے جو خدا کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھیراتا ہو۔ البتہ وہ شخص مغفرت سے محروم رہ جاتا ہے جس کے اپنے اور کسی اپنے بھائی کے درمیان عداوت ہو۔ اس صورت میں (فرشتوں سے) کہا جاتا ہے کہ انھیں مہلت دو یہاں تک کہ یہ باہم صلح کر لیں۔''

تشریح: یعنی ہر دوشنبہ اور پنج شنبہ کو فرشتوں کے درمیان اس کی توثیق اور اس کا اظہار کیا جاتا

ہے کہ وہ لوگ جو خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتے اور نہ انھیں اپنے بھائیوں سے کوئی عداوت اور دشمنی ہے۔ ان کی مغفرت کر دی گئی۔ وہی خدا کی جنت کے وارث ہیں۔ ان کے لیے جنت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں۔ گویا جنت کو اب اپنے مکینوں کے سوا کسی اور چیز کا انتظار نہیں۔ یہ عمل ہفتہ میں دو ۲ بار دہرایا جاتا ہے۔ اور ان اہل جنت کو یاد کیا جاتا ہے جو ابھی دنیا ہی میں ہوتے ہیں۔ اور ابھی وہ دنیا سے واپس نہیں ہوئے ہوتے۔

لیکن اس موقع پر ان لوگوں کی مغفرت کا اعلان نہیں ہوتا جن کے باہمی تعلقات درست نہ ہوں، جو اپنے بھائی سے بغض و عداوت اور کینہ رکھتے ہوں۔ ان کا معاملہ التواء میں ڈال دیا جاتا ہے۔ ان کی مغفرت اور بخشش باہمی صلح و صفائی اور عداوت کے مٹ جانے پر موقوف رہتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ خدا اور اس کے بندوں سے تعلق کی درستی ہی پر ہماری مغفرت اور نجات کا دارومدار ہے۔ بل کہ تعلقات کی درستی ہی ہماری نجات اور مغفرت ہے۔ مغفرت اور باہمی تعلقات کی خوش گواری و درستی کے درمیان نہایت گہرا رشتہ پایا جاتا ہے۔ اور یہ رشتہ بیج اور درخت کے باہمی رشتہ سے بھی زیادہ قریبی ہوتا ہے۔

بزدلی

﴿۱﴾ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَؓ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ یَقُوْلُ: شَرُّ مَا فِیْ رَجُلٍ شُحٌّ هَالِعٌ وَ جُبْنٌ خَالِعٌ۔ (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: ”آدمی میں سب سے بُری بات غم میں ڈالنے اور کڑھن پیدا کرنے والی حرص اور گھبرا دینے والی بزدلی ہے۔“

تشریح: حریص و بخیل شخص ہمیشہ اس غم میں مبتلا رہتا ہے کہ اسے فلاں اور فلاں چیز میسر نہیں اور فلاں شخص مال و دولت میں مجھ سے بہت آگے ہے۔ اسی طرح بزدل شخص بھی ہمیشہ موہوم خطرات سے گھبراتا رہتا ہے۔ کبھی اطمینان کا سانس لینا اسے نصیب نہیں ہوتا۔ دل کی یہ دونوں ہی حالتیں نہایت بدترین حالتیں ہیں۔ اس لیے کہ ان کی وجہ سے آدمی خدا کی بخشی ہوئی زندگی سے صحیح فائدہ اٹھانے سے قاصر رہتا ہے۔ اس کے دل میں کبھی جذبۂ شکر پیدا نہیں ہوسکتا۔ سکون و اطمینان

زندگی کی سب سے بڑی نعمت ہے۔ آدمی سے جو چیز اس کے سکون و اطمینان کو چھین لے اس کے لیے اس سے بُری چیز کیا ہوگی۔

ہم بزدلی اور حرص و بخل سے ہمیشہ اپنے دل کو محفوظ رکھنے کی کوشش کریں۔ یہی اس حدیث کی اصل تعلیم ہے۔

پست ہمتی

(۱) عَنْ اَنَسٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم: لَا یَتَمَنَّیَنَّ اَحَدُکُمُ الْمَوْتَ مِنْ ضُرٍّ، اَصَابَهٗ فَاِنْ کَانَ لَا بُدَّ فَاعِلاً فَلْیَقُلْ: اَللّٰهُمَّ اَحْیِنِیْ مَا کَانَتِ الْحَیٰوۃُ خَیْرًا لِّیْ وَ تَوَفَّنِیْ اِذَا کَانَتِ الْوَفَاۃُ خَیْرًا لِّیْ۔ (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”تم میں سے کوئی (جسمانی یا مالی) ضرر و تکلیف کی وجہ سے جو اسے پہنچے، موت کی تمنا نہ کرے۔ اور اگر اس قسم کی تمنا کرنی اس کے لیے ناگزیر ہو جائے تو اسے یہ کہنا چاہیے کہ اے اللہ، مجھے اس وقت تک زندہ رکھ جب تک زندگی میرے لیے بہتر ہو اور اس وقت موت دے جب کہ میرا مرنا بہتر ہو۔“

تشریح: زندگی جیسی نعمت کے ختم ہونے کی آرزو کفرانِ نعمت ہے۔ اس لیے اسلام نے خودکشی تو کجا موت کی تمنا کرنے سے بھی روکا ہے۔ عام طور پر لوگ مصائب یا آزمائش میں ہمت ہار جاتے ہیں اور وہ موت کے دامن میں پناہ ڈھونڈتے ہیں۔ یہ مومنانہ شان کے خلاف ہے۔ البتہ راہِ خدا میں شہادت کی تمنا دوسری چیز ہے۔ چناں چہ مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ جس شخص نے صدقِ دل سے اور خلوصِ نیت کے ساتھ شہادت کی آرزو کی، اسے شہادت کا اجر و ثواب عطا ہوتا ہے (خواہ اس کی موت بستر پر ہی کیوں نہ ہوئی ہو)

امام نوویؒ کے نزدیک دینی فتنہ و فساد کے خوف سے موت کی تمنا کرنا مکروہ نہیں ہے بل کہ وہ اسے مستحب سمجھتے ہیں۔

مداہنت

(۱) عَنْ اَبِیْ اُمَامَۃَؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: مِنْ شَرِّ النَّاسِ مَنْزِلَۃً عِنْدَ اللّٰهِ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ عَبْدٌ اَذْهَبَ اٰخِرَتَهٗ بِدُنْیَا غَیْرِهٖ۔ (ابن ماجہ)

ترجمہ: حضرت ابوامامہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ''مرتبے کے لحاظ سے بدترین شخص خدا کے نزدیک قیامت کے روز وہ ہوگا جس نے دوسرے کی دنیا بنانے میں اپنی آخرت برباد کردی۔''

تشریح: خود اپنے دنیوی مفاد کو آخرت کے مفاد پر ترجیح دینا ہی بڑے خسارہ کی بات ہے کجا یہ کہ کوئی دوسروں کو خوش کرنے اور ان کو دنیوی فائدہ پہنچانے کی غرض سے جائز و ناجائز اور حلال و حرام کی تمیز نہیں کرتا تو اس سے بڑھ کر بے عقل اور ناعاقبت اندیش دوسرا کون ہوسکتا ہے۔ ایسا شخص خدا کی گرفت اور آخرت کے عذاب سے بچ نہیں سکتا۔ ایسا شخص لازماً بدترین اور نہایت ہی برا آدمی سمجھا جائے گا جس نے نہ تو حق کا کچھ پاس ولحاظ کیا اور نہ خدا کی بخشی ہوئی عقل سے کچھ کام لیا۔

مرعوبیت

﴿۱﴾ عَنِ ابْنِ عُمَرَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ۔

(احمد، ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص کسی قوم کی مشابہت اختیار کرے تو وہ اسی قوم میں سے ہے۔''

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے لیے یہ جائز نہ ہوگا کہ وہ کسی قوم سے اس درجہ متاثر و مرعوب ہوجائیں کہ وہ بالکل اسی قوم کے لوگوں کا رہن سہن، لباس، طرز بود و باش، اندازِ فکر اور اطوار و اخلاق وغیرہ اختیار کرلیں کہ ان کی اپنی انفرادیت باقی نہ رہے۔ غیر مسلموں کے شعار کو اختیار کرنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہمیں اپنے دینی تشخص اور اسلامی تہذیب کا کچھ پاس ولحاظ نہیں رہا۔ ہم دوسروں کی تہذیب، دوسروں کے کلچر اور ان کے رسوم کو دل سے پسند کرتے ہیں۔ آدمی کی پہچان اس کی پسند اور ناپسند اور اس کے ذوق و رجحان سے ہی ہوتی ہے۔ غیروں کے شعار اور ان کی خصوصیات کو اختیار کرکے آدمی اس بات کا ثبوت بہم پہنچاتا ہے کہ وہ اپنی پسند اور ذوق وجذبہ کے لحاظ سے ان ہی کے ساتھ ہے اور یہ اسلامی کردار کے لیے کسی موت سے کم نہیں۔

یہاں یہ بات پیشِ نظر رہے کہ کسی قوم کی کوئی مفید چیز لینی اس حدیث کے منافی نہیں

ہے۔خرابی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کوئی شخص غیر قوم کی تہذیب واخلاق اوراس کے رہن سہن کی پیروی اس طرح کرنے لگ جائے کہ اسے اس کی مطلق پرواہ ہی نہ ہو کہ اس سے اس کا ملّی امتیاز اور وقار باقی بھی رہ سکتا ہے یا نہیں۔

عصبیت

﴿۱﴾ عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍؓ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ: مَنْ نَصَرَ قَوْمَهٗ عَلٰی غَیْرِ الْحَقِّ فَهُوَ کَالْبَعِیْرِ الَّذِیْ رَدٰی فَهُوَ یَنْزِعُ بِذَنْبِهٖ۔ (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص ناحق اپنی قوم کی حمایت کرے وہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی اونٹ کنویں میں گر پڑے، پھر اسے اس کی دم پکڑ کر کھینچا جائے۔''

تشریح: اپنی قوم کے لوگ اگر ناحق کے لیے لڑ رہے ہیں تو اس لڑائی میں ان کا ساتھ محض اس لیے دینا کہ وہ اپنی قوم کے ہیں، جاہلی عصبیت ہے۔اسلام کا اس سے دور کا بھی تعلق نہیں ہوسکتا۔ جو کوئی حق کو چھوڑ کر ظلم کی روش اختیار کرتا ہے، وہ درحقیقت خود کو تباہ و برباد کرتا ہے۔اس کی اس روش سے اس کا دین واخلاق تباہ و برباد ہو کر رہ جاتا ہے۔اس کی حالت اس اونٹ کی سی ہوتی ہے جو کسی کنویں میں گر پڑا ہو۔کنویں میں گرے ہوئے اونٹ کو اس کی دم پکڑ کر نہیں نکالا جا سکتا۔ظالم کی حمایت اور اس کی مدد، اسے اس تباہی سے نہیں بچا سکتی جس کو اس نے خود ہی اپنے لیے پسند کرلیا ہے۔اپنی قوم کی حمایت کرنے، اسے وہ بچانے سے رہا، وہ تو خود جاہلی عصبیت کی وجہ سے تباہ و ہلاک ہوتا ہے،اس کی کوئی دینی واخلاقی حیثیت باقی نہیں رہتی۔

لعنت وملامت

﴿۱﴾ عَنْ اَبِی الدَّرْدَآءِؓ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ یَقُوْلُ: لَا یَکُوْنُ اللَّعَّانُوْنَ شُهَدَآءَ وَلَا شُفَعَآءَ۔ (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت ابو درداءؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: ''لعنت کرنے والے نہ گواہ ہوں گے اور نہ سفارش کرسکیں گے۔''

تشریح: یعنی انھیں قیامت کے روز یہ پوزیشن حاصل نہ ہو سکے گی کہ ان کی شہادت کو وزن دیا جائے اور انھیں کسی کے حق میں سفارش کرنے کی سعادت حاصل ہو سکے۔ بہت زیادہ لعنت و ملامت کرنے والے لوگ بالعموم وہی ہوتے ہیں جو کم ظرف اور تنگ دل اور تنگ نظر ہوتے ہیں۔ ان کے اندر نہ علم ہوتا ہے اور نہ حلم ہوتا ہے اور نہ ان میں فکر و تدبر کی کوئی صلاحیت ہوتی ہے۔ حالات کے اچھے برے اثرات اور انسان کی مجبوریوں اور اس کی نفسیاتی دقتوں کی وہ کچھ بھی خبر نہیں رکھتے۔ کوئی بات انھیں ناگوار محسوس ہوئی نہیں کہ وہ لگے لعنتیں بھیجنے۔ ایسا نہیں ہوتا کہ وہ لوگوں کی اصلاح کے لیے فکر رکھتے ہوں اور اصلاحی کوششوں میں ان کا کوئی نمایاں حصہ ہو۔ ایسے لوگ حق کی نگاہ میں کبھی معتبر اور قابلِ اعتماد نہیں ہو سکتے۔

کردار کی خرابی

(۱) عَنْ عَائِشَةَ ؓ قَالَتْ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اِنَّ شَرَّ النَّاسِ مَنْزِلَةً عِنْدَ اللّٰهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَدَعَهُ اَوْ تَرَكَهُ النَّاسُ لِاتِّقَاءِ فُحْشِهٖ۔ (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول خدا ﷺ نے فرمایا: ''قیامت کے روز خدا کے نزدیک لوگوں میں سب سے برا آدمی وہ ہوگا جس کی بدتہذیبی کی وجہ سے لوگ اس سے ملنا چھوڑ دیں۔''

تشریح: یہ بات آپؐ نے ایک خاص موقع پر فرمائی تھی۔ ایک بار ایک شخص نے آپؐ سے ملاقات کی اجازت مانگی، آپؐ نے فرمایا: یہ برا آدمی ہے کنبہ کا۔ پھر آپؐ نے اسے اندر آنے کی اجازت دی اور اس سے نہایت نرمی سے گفتگو کی۔ حضرت عائشہؓ نے آپؐ سے کہا کہ آپؐ نے تو اس سے نہایت نرمی سے باتیں کیں حالاں کہ آپؐ فرما چکے ہیں کہ وہ کیسا ہے! اس موقع پر آپؐ نے وہ بات فرمائی جو یہاں نقل کی گئی ہے۔ آپؐ کے ارشاد کا منشا یہ ہے کہ آدمی کو کبھی بھی برا نہیں ہونا چاہیے۔ یہاں تک کہ اگر کسی برے شخص سے واسطہ پڑ جائے پھر بھی آدمی کو اپنی بھلائی اور شرافت کو ہرگز فراموش نہیں کرنا چاہیے۔

اجتماعی مفاسد

اجتماعی مفاسد

عدمِ بصیرت

نفاق

〈۱〉 عَنِ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم: اٰیَۃُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ، اِذَا حَدَّثَ کَذَبَ وَ اِذَا وَعَدَ اَخْلَفَ وَ اِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”منافق کی تین نشانیاں ہیں۔ جب بات کرے تو جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو وعدہ خلافی کرے اور جب اسے امین اور قابلِ اعتماد سمجھا جائے تو وہ خائن ثابت ہو۔“

تشریح: نفاق یہ ہے کہ آدمی دعویٰ تو اپنے مومن و مسلم ہونے کا کرے مگر فی الواقع اس کا دل ایمان سے خالی ہو۔ نفاق حقیقت میں بے کرداری کی انتہا ہے۔ اس لیے اسے کفر سے بھی بڑھ کر قابلِ نفرت سمجھا گیا ہے۔ قرآن میں ہے: اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْکِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ج وَ لَنْ تَجِدَ لَھُمْ نَصِیْرًا (النساء:۱۴۵) ”کچھ شک نہیں کہ منافقین آگ کے سب سے نیچے کے طبقے میں ہوں گے، اور تم ہرگز ان کا کوئی مددگار نہ پاؤ گے۔“

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ روش منافق کی ہوتی ہے کہ وہ جھوٹ بولے اور اپنے کیے ہوئے وعدے کا اسے کوئی پاس ولحاظ نہ ہو۔ یہاں یہ بھی پیشِ نظر رہے کہ دروغ گوئی اور وعدہ خلافی اور اس طرح کی دوسری فریب کاری کی خصلت کوئی اختیار کرتا ہے تو اس کا اندیشہ ہے کہ یہ عملی نفاق اس شخص کو حقیقی نفاق میں مبتلا کردے۔ قرآن میں ہے: فَاَعْقَبَھُمْ نِفَاقًا فِیْ

قُلُوْبِهِمْ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَوْنَهٗ بِمَا اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ (التوبہ:۷۷)
”پھر نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے ان کے دلوں میں اس دن تک کے لیے نفاق بٹھا دیا جس دن وہ اس سے ملیں گے۔ اس لیے کہ انھوں نے اللہ سے وعدہ خلافی کی اور اس لیے کہ وہ جھوٹ بولتے رہے۔“

﴿۲﴾ وَ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍوؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اَرْبَعٌ مَنْ كُنَّ فِيْهِ كَانَ مُنَافِقًا خَالِصًا وَ مَنْ كَانَتْ فِيْهِ خَصْلَةٌ مِّنْهُنَّ كَانَتْ فِيْهِ خَصْلَةٌ مِّنَ النِّفَاقِ حَتّٰى يَدَعَهَا: اِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ وَ اِذَا حَدَّثَ كَذَبَ وَ اِذَا عَاهَدَ غَدَرَ وَ اِذَا خَاصَمَ فَجَرَ۔
(بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”جس شخص میں یہ چار باتیں پائی جائیں وہ پورا منافق ہے اور جس کسی میں ان میں سے کوئی ایک خصلت موجود ہو تو اس میں نفاق کی ایک خصلت پائی جاتی ہے یہاں تک کہ وہ اسے چھوڑ دے: جب اسے امین اور قابلِ اعتماد ٹھہرایا جائے تو وہ خائن ثابت ہو، جب بات کرے تو کذب بیانی سے کام لے۔ جب عہد کرے تو توڑ ڈالے اور جب جھگڑا کرے تو بے قابو ہو جائے۔“

تشریح: صحیح مسلم میں یہ الفاظ بھی ملتے ہیں: وَ اِنْ صَامَ وَ صَلّٰى وَ زَعَمَ اَنَّهٗ مُسْلِمٌ۔ ”اگرچہ وہ روزہ رکھے، نماز پڑھے اور اس کا دعویٰ کرے کہ وہ مسلم ہے۔“ یعنی نماز، روزہ وغیرہ عبادتوں سے کسی کو دھوکا نہ ہونا چاہیے۔ اگر کسی کے اندر کردار کی خرابی پائی جاتی ہے تو اس کی نماز اور روزہ وغیرہ کو دیکھ کر حقیقت سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔ ظاہر و باطن کا اختلاف، دھوکہ دہی اور فریب کاری نفاق کی اصل حقیقت ہے۔ اس حدیث میں جن خصلتوں کا ذکر کیا گیا ہے، ان سب کے پیچھے اصلاً فریب کاری کی خصلت کام کر رہی ہے۔ فریب کاری کی شکلیں یوں تو بہت سی ہو سکتی ہیں۔ یہاں جن پانچ چیزوں کا ذکر فرمایا گیا ہے، ان کی حیثیت بنیادی ہے۔ معاشرہ میں اکثر ان سے سابقہ پیش آ سکتا ہے۔ خیانت، خودغرضی، عہد شکنی وغیرہ منافقانہ خصائل کا ذکر قرآن مجید میں نہایت تفصیل سے کیا گیا ہے۔

﴿۳﴾ وَ عَنِ ابْنِ عُمَرَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَثَلُ الْمُنَافِقِ كَالشَّاةِ الْعَائِرَةِ بَيْنَ الْغَنَمَيْنِ تَعِيْرُ اِلٰى هٰذِهٖ مَرَّةً وَ اِلٰى هٰذِهٖ مَرَّةً۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ''منافق کی مثال اس پریشان بکری کی سی ہے جو دو گلوں کے درمیان کبھی اس طرف اور کبھی اس طرف ماری ماری پھرتی ہو۔''

تشریح: منافقانہ روش نہایت ذلیل حرکت ہوتی ہے۔ اس کا احساس دلانے کے لیے اس حدیث میں منافق کی مثال اس آوارہ بکری سے دی گئی ہے جو نر کی تلاش میں ادھر ادھر ماری پھرتی ہے۔ منافقین کی بزدل جماعت کی حالت اس سے مختلف نہیں ہوتی۔ منافقین کو صرف اپنے دنیوی اغراض عزیز ہوتے ہیں۔ دنیوی مصالح کے تحت یہ کبھی مسلمانوں سے اپنے توقعات وابستہ کرتے ہیں تو کبھی کفار کے پاس دوڑے جاتے ہیں۔ مردانہ وار طاقت کا مقابلہ خود کریں۔ نفاق کی بیماری ان کے اندر اس کی سکت ہی باقی نہیں رہنے دیتی۔

﴿۴﴾ وَ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَنْ مَّاتَ وَلَمْ یَغْزُ وَلَمْ یُحَدِّثْ بِهٖ نَفْسَهٗ مَاتَ عَلٰی شُعْبَةٍ مِّنْ نِّفَاقٍ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص اس حال میں مرا کہ نہ تو اس نے (خدا کی راہ میں) کبھی جنگ کی اور نہ اس کے دل میں اس کا خطرہ یا خیال گزرا تو اس کی موت نفاق کے ایک شعبہ پر ہوئی۔''

تشریح: منافقین ہمیشہ جنگ سے جی چراتے رہے ہیں۔ جب کہ مومن کی اصل شان یہ ہوتی ہے کہ وہ خدا کی راہ میں اپنی جان قربان کرنے کا تمنائی ہوتا ہے۔ اس کی یہ آرزو کہ کاش وہ خدا کی راہ میں قربان ہو، اس بات کا ثبوت فراہم کرتی ہے کہ اسے خدا اور اس کے رسول سے شدید محبت ہے۔ کوئی دوسری چیز اس محبت پر غالب نہیں آسکتی۔

راہِ خدا میں جان دینے کا موقع میسر نہ بھی آئے لیکن مومن کا دل اس جذبہ سے کبھی خالی نہیں ہوتا کہ اس کی جان خدا کے لیے قربان ہو اور اس کا خون خدا کی راہ میں بہے۔

﴿۵﴾ وَ عَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ کَانَ یَقُوْلُ: اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِکَ مِنَ الشِّقَاقِ وَالنِّفَاقِ وَ سُوْءِ الْاَخْلَاقِ۔ (ابوداؤد، نسائی)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ یہ دعا فرماتے تھے: اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِکَ مِنَ الشِّقَاقِ وَالنِّفَاقِ وَ سُوْءِ الْاَخْلَاقِ (''خدایا، میں اختلاف، نفاق اور برے اخلاق سے محفوظ رہنے کے لیے تیری پناہ لیتا ہوں۔'')

تشریح: یہ ایک جامع دعا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آدمی کو نفاق سے کس قدر حذر ہونا چاہیے۔

شقاق (مخالفت، دشمنی) اور بدخلقی کا نفاق سے گہرا تعلق ہوتا ہے بل کہ یہ درحقیقت نفاق کے لوازم میں سے ہیں۔ منافق بااخلاق اور حقیقی دوست ہو نہیں سکتا۔ نفاق، کردار کی موت ہے۔ منافق انسانی معاشرہ میں سب سے قبیح و بدتر وجود ہوتا ہے۔ ہمارے لیے ضروری ہے کہ نفاق اور اس کی قباحتوں سے پورے طور پر باخبر ہوں اور ان سے محفوظ رہنے کے لیے خدا کی پناہ طلب کرتے رہیں۔

خودغرضی

(۱) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: لَا یَخْطُبِ الرَّجُلُ عَلٰی خِطْبَةِ اَخِیْهِ حَتّٰی یَنْکِحَ اَوْ یَتْرُکَ۔ (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ''کوئی شخص اپنے (مسلمان) بھائی کے پیغامِ نکاح پر پیغام نہ دے یہاں تک کہ وہ نکاح کرلے یا اس سے دست بردار ہوجائے۔''

تشریح: اگر کہیں کسی شخص نے رشتہ کے لیے پیغام بھیجا ہے اور اس سلسلہ میں اس کی بات چیت چل رہی ہے تو کسی دوسرے شخص کے لیے یہ قطعاً ناجائز ہے کہ وہ اس رشتہ کے لیے کسی کو بھیجے۔ ہاں، اگر کسی وجہ سے جو بات چیت شروع ہوئی تھی، ختم ہوجاتی ہے اور رشتہ طے نہیں ہوتا تو اب اس میں کوئی قباحت نہیں رہتی کہ کوئی دوسرا شخص اپنے لیے یا کسی دوسرے کے لیے سلسلہ جنبانی کرے۔

شادی اور نکاح ہی نہیں، خرید و فروخت وغیرہ دوسرے معاملات میں بھی شریعت نے اسی قسم کی پابندی عائد کی ہے۔ یہ تو کم ظرفی اور خودغرضی کی بات ہوگی کہ ایک شخص کسی چیز کو خریدنا چاہتا ہے اور وہ اس کے لیے اس کے مالک سے بات چیت کر رہا ہے اور دوسرا شخص اس چیز کا خریدار بن کر کھڑا ہوجائے۔ جب تک پہلا شخص سودے سے دست کش نہیں ہوجاتا، کسی دوسرے کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اسے خریدنے کی کوشش کرے۔

اسی طرح اگر کسی تانگے یا رکشہ والے سے کوئی شخص کہیں لے چلنے کے لیے بات کر رہا

ہے تو یہ صحیح نہ ہوگا کہ اس کی اس بات چیت کے درمیان کوئی دوسرا شخص آ کر رکشہ یا تانگے والے سے اپنے لیے بات کرنے لگ جائے یا آ کر سوار ہو جائے اور کہے کہ مجھے فلاں مقام تک پہنچاؤ۔ البتہ اگر پہلے شخص کا معاملہ طے نہیں ہوتا اور وہ ہٹ جاتا ہے تو اب دوسرے شخص کے لیے اس کا پورا موقع ہے کہ وہ بات چیت کر کے معاملہ طے کرے۔

غیر ذمّہ دارانہ طرزِ عمل

(۱) عَنْ عَمرِو بْنِ شُعَیْبٍ عَنْ اَبِیْہِ عَنْ جَدِّہٖ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ قَالَ: مَنْ تَطَبَّبَ وَلَمْ یُعْلَمْ مِنْہُ طِبٌّ فَھُوَ ضَامِنٌ۔ (ابوداؤد، نسائی)

ترجمہ: حضرت عمرو بن شعیبؒ اپنے والد سے اور وہ ان کے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ''جو کوئی طبیب بن بیٹھے حالاں کہ اس کا طبیب ہونا معلوم نہ ہو، تو وہ (مریض کی موت یا اس کے مرض کے بڑھ جانے کا) ذمّہ دار ہوگا۔''

تشریح: جس کو فن طب کا علم و تجربہ نہ ہو اور وہ طبیب بن بیٹھے۔ لوگوں کا علاج کرنے لگ جائے تو یہ مریض پر ظلم ہوگا۔

بغیر علم اور تجربہ کے اگر وہ لوگوں کا علاج کرتا ہے تو اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہوگا کہ وہ لوگوں کی جانوں سے کھیل رہا ہے۔ حکومت ایسے شخص کو سخت سے سخت سزا دینے کی مجاز ہے۔ ایسا نقلی طبیب اگر کسی مریض کا علاج کرتا ہے اور مریض مر جائے تو وہ نقلی طبیب ضامن ہوگا۔ دیت اس پر واجب ہوگی۔

یہ حدیث بتاتی ہے کہ آدمی کو زندگی میں اپنی ذمہ داری کا پورا احساس ہونا چاہیے۔ کسی شخص کے لیے یہ کسی حالت میں بھی درست نہیں ہو سکتا کہ وہ کسی معاملہ میں صرف اپنے ذاتی مفاد کو سامنے رکھے اور غیر ذمہ دارانہ طرز اختیار کرے۔

دورخاپن

(۱) عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: تَجِدُوْنَ شَرَّ النَّاسِ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ ذَا الْوَجْھَیْنِ الَّذِیْ یَاْتِیْ ھٰٓؤُلَآءِ بِوَجْہٍ، وَ ھٰٓؤُلَآءِ بِوَجْہٍ۔ (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ”قیامت کے روز تم، سب سے بدتر شخص اس کو پاؤ گے جو دو منہ رکھتا ہے۔ ان لوگوں کے پاس ایک منہ لے کر آتا ہے اور ان لوگوں کے پاس دوسرا منہ لے کر جاتا ہے۔“

تشریح: مسلم کی ایک روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں: اِنَّ مِنْ شَرِّ النَّاسِ ذَا الْوَجْهَيْنِ الَّذِیْ يَأْتِیْ هٰٓؤُلَآءِ بِوَجْهٍ، وَ هٰٓؤُلَآءِ بِوَجْهٍ۔ ”یقیناً بدترین شخص وہ ہے جو دو منہ رکھتا ہو۔ ان لوگوں کے پاس آتا ہو تو ایک منہ لے کر اور ان لوگوں کے پاس جاتا ہے تو دوسرا منہ لے کر۔“

یہ راست بازی اور دیانت داری کے خلاف ہے کہ آدمی حق و ناحق کو فراموش کر دے اور جس کسی کے پاس جائے، بس اسی کی سی بات کرنے لگے۔ یہ ایک طرح کی منافقت اور موقع پرستی ہے جس کو ہمیشہ مذموم سمجھا گیا ہے۔ ایسا آدمی خوشامدی ہوتا ہے اور بہت جلد وہ اپنا اعتبار کھو دیتا ہے۔ کسی کو اس پر بھروسہ نہیں ہوتا۔

بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ اگر دو گروہوں میں یا دو آدمیوں میں کوئی نزاع اور اختلاف پایا جاتا ہے تو وہ دونوں میں سے ہر ایک سے اپنے خصوصی تعلق کا اظہار کریں گے اور جب ایک فریق کے یہاں پہنچیں گے تو دوسرے فریق کو برا کہیں گے۔ اس قماش کے آدمی کو عربی میں ذوالوجہین یعنی دو رُخا کہتے ہیں۔

﴿۲﴾ وَ عَنْ عَمَّارٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَنْ كَانَ لَهٗ وَجْهَانِ فِی الدُّنْيَا كَانَ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ لِسَانَانِ مِنْ نَّارٍ۔ (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت عمارؓ سے روایت ہے کہ رسول خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”جو شخص دنیا میں دو منہ رکھتا ہوگا قیامت کے روز اس کے منہ میں آگ کی دو زبانیں ہوں گی۔“

تشریح: امام غزالیؒ نے دوطرفہ باتیں بنانے کو چغل خوری کی خصلت سے بھی بدتر قرار دیا ہے۔ چغلی میں آدمی صرف ایک کی بات دوسرے کے یہاں نقل کرتا ہے اور یہاں دوطرفہ مخالفانہ باتیں پہنچائی جاتی ہیں یا دو فریقوں میں سے ہر ایک کے یہاں جا کر اس کی ہاں میں ہاں ملانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ہر ایک فریق سے صرف اس کی سی بات کہی جاتی ہے اور اس سے اپنی حمایت اور تائید کا وعدہ کیا جاتا ہے۔ جس شخص کی یہ خصلت ہوگی اسے ذوالوجہین اور ذواللسانین (دو چہرے اور دو زبانوں والا) کہا جائے گا۔ قیامت میں اس کو آگ کی دو زبانیں دی جائیں گی۔ یہ اس کے اپنے کرتوت کے مناسبِ حال سزا ہوگی۔

بدذوقی

بدگمانی

〈۱〉 عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: اِیَّاکُمْ وَالظَّنَّ فَاِنَّ الظَّنَّ اَکْذَبُ الْحَدِیْثِ وَلاَ تَجَسَّسُوْا وَلاَ تَحَسَّسُوْا وَلاَ تَنَاجَشُوْا وَلاَ تَحَاسَدُوْا وَلاَ تَبَاغَضُوْا وَلاَ تَدَابَرُوْا وَ کُوْنُوْا عِبَادَ اللّٰهِ اِخْوَانًا۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”بدگمانی سے بچو، کیوں کہ بدگمانی سب سے جھوٹی بات ہے۔ کسی کی بھلائی برائی پر مطلع ہونے کے طالب نہ بنو، نہ ٹوہ میں پڑو، نہ دوسرے سے بڑھ کر بولی بولو، نہ باہم حسد کرو، نہ آپس میں بغض رکھو، نہ باہم دشمنی یا قطع تعلق کرو اور خدا کے بندے اور آپس میں بھائی بھائی بن کر رہو۔“

تشریح: آپؐ نے تعلیم یہ دی کہ بدگمانی کو بدترین جھوٹ تصور کرتے ہوئے اس سے اجتناب کرو اور اس معاملہ میں حد درجہ ہوشیار رہو۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ صدق وصفا سے متصف ہونے کے لیے صرف زبان ہی کی حفاظت کافی نہیں ہے بل کہ اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اپنے خیالات کو ہر طرح کی آلائشوں سے پاک رکھا جائے۔ اگر ہمارے دل اور ہمارے خیالات کو یہ پاکیزگی میسر نہیں تو اس کا واضح مطلب یہ ہوتا ہے کہ برائی نے ہماری شخصیت تک کو محفوظ نہیں رہنے دیا ہے اور یہ نہایت تشویش کی بات ہوگی۔

اس کے علاوہ سوءظن یا بدگمانیوں سے معاشرے میں منافرت کی جو فضا پیدا ہوتی ہے اسے پاک وخوش گوار بنانا حد درجہ دشوار ہوتا ہے۔ کذب، جس کا تعلق زبان وبیان سے ہو، اس کی تردید کی جاسکتی ہے اور اس سلسلے میں پیدا شدہ غلط فہمیوں کو بہ آسانی رفع کر سکتے ہیں۔ لیکن دلوں میں جو بدگمانیاں بیٹھ جاتی ہیں ان کو دور کرنا آسان نہیں ہوتا۔ بالعموم آدمی کو اس کی خبر کبھی بھی نہیں ہو پاتی کہ کوئی ہم سے بدگمان ہے۔ اس لیے سوءظن اگر جھوٹ ہے تو وہ صرف جھوٹ ہی نہیں ہے بل کہ بدترین قسم کا جھوٹ ہے۔ اس کی قباحتوں کا اندازہ کرنا بھی عام حالات میں مشکل ہوتا

ہے۔قرآن میں ہے:یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا کَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ ز اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ (الحجرات:۱۲)''اے لوگو جو ایمان لائے ہو، بہت گمانوں (بدگمانیوں) سے بچو! کیوں کہ بعض گمان صریح گناہ ہوتے ہیں۔'' اہل ایمان کو ہمیشہ حسنِ ظن سے کام لینا چاہیے۔ بلا وجہ اور بغیر کسی قوی ثبوت کے کسی کے بارے میں بری رائے قائم کرلینا اسلامی اصول کے بالکل منافی اور معاشرے کو تباہی سے ہم کنار کرنے کی کوشش کے مترادف ہے۔

یہ جو فرمایا کہ ٹوہ میں نہ پڑو، اس کا مطلب یہ ہے کہ کرنے کے بہت سے کام ہیں، تم یہ کام اپنے ذمّہ لے کر اپنی پستی اور بدذوقی کا ثبوت نہ دو کہ لوگوں کے عیبوں کو ٹٹولتے پھرو۔ اور ان کے رازوں کو معلوم کرنے کے چکر میں پڑو۔ مومن تو لوگوں کو رسوا کرنے کے بہ جائے ان کی عزت وآبرو کا محافظ ہوتا ہے۔ وہ تو امکان کی حد تک لوگوں کے عیبوں کے سلسلے میں پردہ پوشی سے کام لیتا ہے۔ وہ لوگوں کی تحقیر وتذلیل کے بجائے ان کی اصلاح کی فکر کرتا ہے۔ مومن کو ہمیشہ اعلیٰ ظرفی سے کام لینا چاہیے۔ اس کی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ حتی الامکان اس کا سینہ لوگوں کی طرف سے صاف ہو۔ حدیث میں ہے: اذا ظننتم فلا تحققوا ''جب کسی کے بارے میں تمھیں کوئی برا گمان ہو جائے تو اس کی تحقیق نہ کرو۔'' (احکام القرآن للجصاص) یعنی اس بدگمانی کو دور کرنے کی کوشش کرو نہ کہ اس کی تحقیق کرکے تمھیں اسے پایۂ ثبوت تک پہنچانے کی فکر ہو۔

''نہ دوسرے سے بڑھ کر بولی بولو'' اس کے لیے اصل متن میں لفظ 'لا تناجشوا' آیا ہے۔ اہل لغت نے اس کے کئی معنی بیان کیے ہیں۔ نجش کے معنی ہیں شکار کو برانگیختہ کرنا، شکار کو ایک جگہ سے بھڑکانا تاکہ وہ دوسری جگہ چلا جائے۔ لا تناجشوا کا مطلب عام طور سے یہ لیا گیا ہے کہ کسی مال کی قیمت اس نیت سے مت بڑھاؤ کہ دوسرے خریدار کو رغبت ہو اور وہ اسے زیادہ قیمت پر خرید لے حالاں کہ تمھارا اس مال کو خریدنے کا ارادہ نہیں ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ لوگوں پر برتری حاصل کرنے کی کوشش نہ کرو۔ ایک دوسرے قول کے مطابق اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک کو دوسرے سے نفرت نہ دلاؤ۔

''نہ باہم دشمنی یا قطع تعلق کرو'' اس کے اصل متن میں وَلَا تَدَابَرُوْا۔ آیا ہے۔ اس کا ایک مطلب یہ بھی لیا گیا ہے کہ آپس میں ایک دوسرے کی غیبت نہ کرو۔

''بھائی بھائی بن کر رہو'' مطلب یہ ہے کہ تم نہ کاذب بنو اور نہ حاسد اور نہ مفسد بنو۔ تم تو

خدا کے حقیقی بندے بننا پسند کرو۔ اور اس طرح رہو جس طرح رہنا اس کو پسند ہے۔ اور باہم ایک دوسرے کے بدخواہ بننے کے بہ جائے ایک دوسرے کے بھائی بن جاؤ۔ اگر تم صحیح معنی میں خدا کے فرماں بردار بندے بن جاتے ہو اور تمھارے درمیان اخوت اور بھائی چارے کا رشتہ قائم ہو جاتا ہے تو تمھارے اندر وہ اخلاقی برائیاں ہرگز پیدا نہیں ہوسکتیں جن سے بچنے کی تاکید اس حدیث میں فرمائی گئی ہے۔

یہ حدیث نہایت جامع ہے۔ ایک روایت میں یہ الفاظ بھی ملتے ہیں:

لاَ تَقَاطَعُوا وَلاَ تَدَابَرُوا وَلاَ تَبَاغَضُوا وَلاَ تَحَاسَدُوا وَكُونُوا عِبَادَ اللّٰهِ اِخْوَانًا (مسلم) آپس میں قطع رحمی نہ کرو، نہ غیبت کرو اور نہ باہم ایک دوسرے سے بغض وعداوت رکھو، اور نہ ایک دوسرے سے حسد کرو اور اللہ کے بندے اور بھائی بھائی بن کر رہو۔''

﴿۲﴾ وَ عَنْ عَآئِشَةَؓ قَالَتْ: قَالَ النَّبِيُّ ﷺ: مَآ اَظُنُّ فُلاَنًا وَّ فُلاَنًا يَعْرِفُوْنَ مِنْ دِيْنِنَا شَيْئًا! قَالَ اللَّيْثُ: كَانَا رَجُلَيْنِ مِنَ الْمُنَافِقِيْنَ۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''میں نہیں سمجھتا کہ فلاں فلاں شخص ہمارے دین کی کوئی بات جانتے ہوں۔'' لیث کا بیان ہے کہ یہ دونوں منافق تھے۔''

تشریح: اسلام دین فطرت ہے۔ ایک طرف تعلیم یہ ہے کہ لوگوں سے ہمارے تعلق کی بنیاد حسن ظن اور خود اعتمادی ہو، کسی سے ہم بدگمانی نہ رکھیں۔ دوسری طرف دین میں یہ بھی مطلوب نہیں ہے کہ جو چاہے وہ ہمارے حسنِ ظن سے غلط فائدہ اٹھائے اور ہمیں دھوکے پر دھوکہ دیتا جائے۔ جس کی دین سے بےزاری و بےتعلقی واضح ہو، جس کے طرز عمل نے صاف ظاہر کردیا ہو کہ دین سے اس کا تعلق اور وابستگی کسی علم و ہدایت کی وجہ سے نہیں ہے بل کہ اس کے پیچھے کچھ دوسری ہی چیزیں کام کر رہی ہیں، ایسے شخص کے بارے میں خوش گمانی میں مبتلا رہنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ بل کہ دوسرے لوگ بھی اس کی اصل حیثیت سے واقف ہوجائیں تو بہتر ہے تاکہ وہ کبھی اس کے دام فریب میں نہ آسکیں۔

﴿۳﴾ وَ عَنْهَا قَالَتْ: دَخَلَ عَلَيَّ النَّبِيُّ ﷺ يَوْمًا وَّ قَالَ: يَا عَآئِشَةُ مَآ اَظُنُّ فُلاَنًا وَّ فُلاَنًا يَعْرِفَانِ دِيْنَنَا الَّذِيْ نَحْنُ عَلَيْهِ۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ ایک روز نبی ﷺ میرے پاس تشریف لائے اور فرمایا:

’’فلاں فلاں شخص کے متعلق میرا گمان یہ نہیں ہے کہ وہ دونوں ہمارے دین کو جس پر ہم ہیں، جانتے ہوں۔‘‘

تشریح: اس حدیث اور اس سے قبل کی حدیث سے معلوم ہوا کہ دین کے لیے علم ضروری ہے خدا کی طاعت اور بندگی علم و معرفت کے بغیر ممکن نہیں۔ جس شخص کو یہ خبر ہی نہ ہو کہ دین کیا ہے؟ اس کی روح کیا ہے؟ وہ اپنے پیرووں کو کن افکار و نظریات کا حامل دیکھنا چاہتا ہے؟ اسے کون سے اعمال پسند اور کون سے اعمال پسند نہیں ہیں؟ جس شخص کو یہ کچھ معلوم نہ ہو، اس کے بارے میں یہ کیسے باور کیا جاسکتا ہے کہ دین کو اس شخص نے خوب سمجھ کر شعوری طور پر اختیار کیا ہوگا اور اس کے مومن مخلص ہونے میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔

تجسس

〈۱〉 وَ عَنْ مُعَاوِيَةَ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم يَقُوْلُ: اِنَّكَ اِذَا اتَّبَعْتَ عَوْرَاتِ الْمُسْلِمِيْنَ اَفْسَدْتَّهُمْ اَوْ كِدْتَّ اَنْ تُفْسِدَهُمْ۔ (ابوداؤد، البیہقی فی شعب الایمان)

ترجمہ: حضرت معاویہؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ’’تم اگر لوگوں کے مخفی حالات جاننے کے درپے ہوگے تو انھیں بگاڑ دوگے یا کم از کم ان کو بگاڑ کے قریب پہنچا دوگے۔‘‘

تشریح: ایک روایت میں ’’عَوْرَاتِ الْمُسْلِمِيْنَ‘‘ کے بہ جائے ’’عَوْرَاتِ النَّاسِ‘‘ (لوگوں کے مخفی حالات) کے الفاظ آئے ہیں۔

معلوم ہوا کہ تجسس لوگوں کی اصلاح کا نہیں بل کہ ان کے بگاڑ کا سبب ثابت ہوتا ہے۔ لوگوں کی برائیوں کی تلاش اور ان کے عیوب کی تشہیر ان کو بے باک بنا سکتی ہے۔ ان میں شرم و حیا کا مادہ باقی رہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ان کی عزت اور آبرو کا حد درجہ لحاظ رکھا جائے۔ اگر ہم نے کسی کا راز فاش کر کے سماج میں اسے برہنہ کر دیا تو پھر وہ سوچ سکتا ہے کہ اب ہمارے پاس کیا چیز رہ گئی ہے جس کی حفاظت کے لیے ہم کوشاں ہوں۔ اخلاقی موت سے بڑھ کر کسی دوسری موت کا ہم دنیا میں تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اسی لیے حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) فرماتے ہیں مَنْ رَاٰى عَوْرَةً فَسَتَرَهَا كَانَ كَمَنْ اَحْيٰى مَوْءُوْدَةً (احمد، ترمذی، ابوداؤد عن عقبہ بن عامر) ’’جس کسی

شخص نے کسی کا مخفی عیب دیکھ لیا اور اس پر پردہ ڈال دیا تو یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کسی شخص نے ایک زندہ گاڑی ہوئی بچی کو موت سے بچا لیا۔''

﴿۲﴾ وَ عَنْ جَابِرٍؓ قَالَ: نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَنْ يَّطْرُقَ الرَّجُلُ اَهْلَهٗ لَيْلاً يَتَخَوَّنُهُمْ اَوْ يَطْلُبُ عَثَرَاتِهِمْ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے اس سے منع فرمایا کہ کوئی شخص اپنے گھر رات کو اس غرض سے آئے کہ وہ گھر والوں کی چوری اور خیانت کو پکڑے یا ان کے قصور اور بھید کو ڈھونڈے۔

تشریح: گمانِ بد کرنا اور وہ بھی اپنے گھر والوں سے، نازیبا ہے۔ اس لیے آپؐ نے یہ طرزِ عمل اختیار کرنے سے منع فرمایا ہے۔ گھر میں اگر ایک کا دوسرے پر اعتماد نہ ہو تو زندگی کی ساری خوش گواریاں تلخیوں میں بدل جائیں۔ ایسا انداز اختیار کرنا جس سے عورت کی دل شکنی ہو، خود اپنی گھر کی زندگی کو تباہ کرنے کے مترادف ہے۔

﴿۳﴾ وَ عَنِ الْمِقْدَامِ بْنِ مَعْدِيْكَرِبَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: اِنَّ الْاَمِيْرَ اِذَا ابْتَغَى الرِّيْبَةَ فِي النَّاسِ اَفْسَدَهُمْ۔ (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت مقدام بن معدیکربؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''حاکم جب لوگوں کے شک وشبہ کی بات ڈھونڈتا ہے تو وہ ان کو بگاڑ دیتا ہے۔''

تشریح: اس حدیث میں نبی (ﷺ) نے نظمِ مملکت کے سلسلہ میں ایک بڑے اہم نکتہ کا ذکر فرمایا ہے۔ سلطنت کی سالمیت اور قوم و ملک کی فلاح و بہبود کے لیے ضروری ہے کہ حکمراں طبقہ اور عوام کے درمیان اعتماد اور اطمینان کی فضا پائی جاتی ہو۔ امراء کو اپنے عوام پر جو اعتماد اور بھروسہ ہو، اس کا اظہار ان کی جانب سے کبھی کبھی ہوتے رہنا چاہیے۔ اس کا عوام کے ذہنوں پر اچھا اثر پڑتا ہے۔ لیکن حکمراں طبقہ اگر کم ظرفی اور تنگ نظری سے کام لیتا ہے اور اس کو کسی خاص گروہ یا عوام کی وفاداریاں مشکوک نظر آتی ہیں، پھر وہ ان پر الزامات لگاتا ہے۔ اور انھیں طرح طرح کی اذیتوں میں مبتلا رکھتا ہے تو اسے جان لینا چاہیے کہ اس پالیسی کے ساتھ حکومت کبھی بھی پائیدار نہیں ہوسکتی۔ جب ملک میں اضطراب اور بے اطمینانی کی فضا پیدا ہوگی تو اس کا نتیجہ خود حکمراں طبقہ کے حق میں بھی کبھی بہتر نہیں ہوسکتا۔

اس حدیث سے جہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کے تجسس اور ان کے عیوب کی ٹوہ میں نہیں پڑنا چاہیے، وہیں اس میں اس بات کی طرف بھی اشارہ پایا جاتا ہے کہ اگر لوگوں میں واقعتہً کچھ عیوب ہوں تو حتی الامکان ان سے درگزر سے کام لیا جائے اور ان کی اصلاح کی کوئی بہتر سے بہتر صورت اختیار کی جائے۔

﴿۴﴾ وَ عَنْ اَبِی بَرْزَةَ الْاَسْلَمِیِّ ؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: یَا مَعْشَرَ مَنْ اٰمَنَ بِلِسَانِہٖ وَلَمْ یَدْخُلِ الْاِیْمَانُ قَلْبَہٗ، لاَ تَغْتَابُوا الْمُسْلِمِیْنَ وَلاَ تَتَّبِعُوْا عَوْرَاتِھِمْ فَاِنَّہٗ مَنِ اتَّبَعَ عَوْرَاتِھِمْ یَتَّبِعِ اللّٰہُ عَوْرَتَہٗ وَ مَنْ یَّتَّبِعِ اللّٰہُ عَوْرَتَہٗ یَفْضَحْہُ فِیْ بَیْتِہٖ۔ (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت ابو برزہ اسلمیؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خداؐ نے فرمایا: ’’اے وہ لوگو، جو زبان سے ایمان لائے ہو، ابھی ایمان جن کے دلوں میں داخل نہیں ہوسکا ہے۔ مسلمانوں کی غیبت مت کیا کرو اور ان کے چھپے ہوئے غیبوں کے پیچھے نہ پڑا کرو، کیوں کہ جو کوئی ان کے چھپے عیبوں کے پیچھے پڑے گا تو اللہ بھی اس کے مخفی عیبوں کے پیچھے پڑ جائے گا۔ اور اللہ جس کسی کے چھپے عیبوں کے پیچھے پڑ جائے گا اس کو وہ اس کے اپنے گھر میں رسوا کر دے گا۔‘‘

تشریح: معلوم ہوا کہ مسلمانوں کی غیبت اور ان کے عیوب اور ان کی کم زوریوں کی تلاش اور تشہیر سے دل چسپی لینا ایک منافقانہ طرز عمل ہے۔ یہ طرز عمل وہی شخص اختیار کرسکتا ہے جو ایمان کی لذت سے ناآشنا ہو، وہ صرف زبان سے مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتا ہو، اس کا دل ابھی ایمان کی کیفیت سے بالکل خالی ہو۔

عیب جوئی اور عار دلانا

﴿۱﴾ عَنِ ابْنِ عُمَرَ ؓ قَالَ: صَعِدَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ الْمِنْبَرَ فَنَادٰی بِصَوْتٍ رَفِیْعٍ فَقَالَ: یَا مَعْشَرَ مَنْ اَسْلَمَ بِلِسَانِہٖ وَلَمْ یُفْضِ الْاِیْمَانُ اِلٰی قَلْبِہٖ لاَ تُؤْذُوا الْمُسْلِمِیْنَ وَلاَ تُعَیِّرُوْھُمْ وَلاَ تَتَّبِعُوْا عَوْرَاتِھِمْ فَاِنَّہٗ مَنْ یَّتَّبِعْ عَوْرَةَ اَخِیْہِ الْمُسْلِمِ یَتَّبِعِ اللّٰہُ عَوْرَتَہٗ وَ مَنْ یَّتَّبِعِ اللّٰہُ عَوْرَتَہٗ یَفْضَحْہُ وَلَوْ فِیْ جَوْفِ رَحْلِہٖ۔ (ترمذی)

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسولِ خدا ﷺ منبر پر تشریف لائے اور بلند آواز سے ارشاد فرمایا: ’’اے وہ لوگو جن کا اسلام صرف ان کی اپنی زبان پر ہے اور ایمان ابھی

ان کے دلوں میں نہیں اترا ہے۔ مسلمانوں کو تکلیف نہ پہنچاؤ، انھیں عار نہ دلاؤ اور ان کی عیب جوئی کے درپے نہ رہو، کیوں کہ جو شخص اپنے مسلمان بھائی کی عیب جوئی کے درپے ہوگا اللہ اس کے عیب کے درپے ہوجائے گا اور جس کسی کی عیب جوئی کے درپے خدا ہوگا وہ اسے رسوا کر کے رہے گا اگرچہ وہ اپنے گھر کے اندر ہی کیوں نہ بیٹھ رہے۔''

تشریح: یہ بات ایمان و اسلام کے سراسر منافی ہے کہ کوئی شخص اپنے مسلمان بھائی کو اذیت پہنچائے، اسے عار دلائے اور اس کی عیب جوئی کے درپے ہو۔ شریعت اسلامی کی رو سے یہ بات نہایت ناپسندیدہ ہے کہ آدمی دوسروں میں عیب نکالنے اور خامی تلاش کرنے میں دل چسپی لے۔ کون بشر ہے جس میں کوئی نہ کوئی کم زوری نہ پائی جاتی ہو۔ کسی شریف شخص کے لیے یہ نہایت مذموم بات ہوگی کہ دوسروں کے عیوب کی چھان بین میں اپنا قیمتی وقت صرف کرے۔ بل کہ اسے اگر کسی کا کوئی عیب اور لغزش معلوم بھی ہوجائے تو بھی اسے چشم پوشی سے کام لینا چاہیے۔ اگر کوئی شخص کسی کو رسوا کرنے اور اس کو لوگوں کی نگاہوں سے گرانے کی غرض سے اس کے عیوب کی تلاش میں رہتا ہے تو وہ خود اپنے لیے بہت بڑا خطرہ مول لے رہا ہے۔ ایسا شخص خود اپنے وقار کو باقی نہیں رکھ سکتا۔ خدا اس کی سزا اسے دنیا ہی میں دے گا اور دوسروں کو رسوا کرنے کی فکر رکھنے والا بالآخر خود ذلیل و رسوا ہو کر رہے گا۔ خدا کا معاملہ اس کے ساتھ وہی ہوگا جیسا معاملہ وہ اپنے بھائی کے ساتھ اختیار کرے گا۔

یہاں یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ کھلے ہوئے مجرم کی بات اس سے بالکل مختلف ہے۔ اس کے جرائم سے چشم پوشی نہیں کی جاسکتی۔ بل کہ ایسے مجرم کے خلاف آواز اٹھائی جائے گی۔ جب اسے خود اپنے وقار و عظمت کا پاس ولحاظ نہیں ہے تو دوسرا کون اسے اس نعمت سے بہرہ ور کرسکتا ہے۔

〈۲〉 وَ عَنْ عَآئِشَةَ رضؓ قَالَتْ: قُلْتُ لِلنَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم: حَسْبُکَ مِنْ صَفِيَّةَ كَذَا وَ كَذَا تَعْنِي قَصِيرَةً فَقَالَ: لَقَدْ قُلْتِ كَلِمَةً لَوْ مُزِجَ بِهَا الْبَحْرُ لَمَزَجَتْهُ۔ (احمد، ترمذی، ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ایک موقع پر میں نبی کریم ﷺ سے کہہ بیٹھی کہ آپؐ کو تو بس وہی صفیہ کافی ہیں جو ایسی اور ایسی ہیں۔ (یعنی جو پستہ قد ہیں) آپؐ نے فرمایا: ''تم نے ایسی بات کہی ہے کہ اگر اسے سمندر میں گھول دیا جائے تو اسے بھی متاثر کر کے رہے۔''

تشریح: یعنی بہ غرض تحقیر کسی کے بارے میں اتنی سی بات بھی کہنی جائز نہیں جو حضرت عائشہؓ کی زبان سے نکل گئی۔ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) تنبیہ فرماتے ہیں کہ تم نے یہ بات کہہ کر جس گناہ کا ارتکاب کیا ہے وہ کوئی معمولی گناہ نہیں ہے۔ اسے اگر سمندر میں بھی گھول دیا جائے تو بھی وہ متاثر اور گندا کر کے رہے گا۔ پھر سوچو کہ یہ چیز تمھارے اعمال نیک اور حسن سیرت کے لیے کس درجہ تباہ کن ثابت ہوسکتی ہے۔

نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بیویوں میں نہایت اچھے اور خوش گوار تعلقات تھے۔ لیکن انسان سے غفلت میں غلطی ہو ہی جاتی ہے۔ اس تنبیہ کے بعد حضرت عائشہؓ سے پھر کبھی اس طرح کی غلطی کا صدور نہیں ہوا۔ صحابہ کرامؓ کا یہی حال تھا کہ جس غلطی پر بھی انھیں تنبہ ہوا، اسے انھوں نے ہمیشہ کے لیے ترک کر دیا۔

حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنی محبوب ترین بیوی کی نازیبا بات پر خاموشی اختیار نہیں فرماتے بل کہ تنبیہ فرماتے ہیں۔ محبت، عدل اور انصاف کا اصل تقاضا بھی یہی تھا۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اس طرزِ عمل میں ہمارے لیے بڑا سبق ہے۔

غیبت

(۱) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ اَنَّ رَجُلَیْنِ صَلَّیَا صَلٰوۃَ الظُّھْرِ اَوِ الْعَصْرِ وَ کَانَا صَآئِمَیْنِ، فَلَمَّا قَضَی النَّبِیُّ صلی اللہ علیہ وسلم الصَّلٰوۃَ قَالَ: اَعِیْدُوْا وُضُوْءَ کُمَا وَ صَلٰوتَکُمَا وَ امْضِیَا فِیْ صَوْمِکُمَا وَ اقْضِیَاہُ یَوْمًا اٰخَرَ" قَالَا: لِمَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ؟ قَالَ: اَغْتَبْتُمْ فُلَانًا۔

(بیہقی)

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ دو روزہ دار آدمیوں نے (حضورؐ کے پیچھے) نماز پڑھی۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نماز ادا کر چکے تو ان سے فرمایا: "جاؤ، دوبارہ وضو کرو اور اپنی نماز پھر سے ادا کرو اور اپنا روزہ پورا کر کے دوسرے روز قضا روزہ رکھو۔" انھوں نے عرض کیا: کیوں یا رسول اللہ؟ آپؐ نے فرمایا: "اس لیے کہ تم نے فلاں شخص کی غیبت کی ہے۔"

تشریح: اس حدیث سے بہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ غیبت سے وضو اور نماز اور روزہ کا حسن و نور جاتا رہتا ہے۔ علماء کے نزدیک غیبت سے وضو اور روزہ ٹوٹتا تو نہیں مگر تقویٰ کا تقاضا ہے کہ

اگر کسی سے غیبت کا صدور ہو جائے تو وہ وضو کی تجدید کر لے۔ غیبت ہی نہیں، اگر کسی نے زیادہ ہنسی مذاق اور لایعنی باتیں ہی کی ہوں تو بھی اس کے لیے مستحب یہی ہے کہ وہ وضو کی تجدید کر لے تا کہ اس ظلمت کا کسی قدر ازالہ ہو سکے جو لایعنی اور فضول گوئی کی وجہ سے اس کے قلب پر طاری ہوئی ہے۔ روزے دار کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ غیبت وغیرہ سے اجتناب کرے اور اپنے روزے کی حفاظت کی طرف سے ہرگز غافل نہ رہے۔

﴿۲﴾ وَ عَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍؓ وَ جَابِرٍؓ قَالاَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اَلْغِیْبَةُ اَشَدُّ مِنَ الزِّنَا۔ قَالُوْا: یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، وَ کَیْفَ الْغِیْبَةُ اَشَدُّ مِنَ الزِّنَا؟ قَالَ: اِنَّ الرَّجُلَ لَیَزْنِیْ فَیَتُوْبُ فَیَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَیْهِ، وَ فِیْ رِوَایَةٍ "فَیَتُوْبُ فَیَغْفِرُ اللّٰهُ لَهٗ وَ اِنَّ صَاحِبَ الْغِیْبَةِ لاَ یُغْفَرُ لَهٗ حَتّٰی یَغْفِرَهَا لَهٗ صَاحِبُهٗ۔" وَ فِیْ رِوَایَةِ اَنَسٍؓ قَالَ: صَاحِبُ الزِّنَا یَتُوْبُ، وَ صَاحِبُ الْغِیْبَةِ لَیْسَ لَهٗ تَوْبَةٌ۔ (البیہقی فی شعب الایمان)

ترجمہ: حضرت ابوسعیدؓ اور حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ''غیبت زنا سے بڑھ کر سخت جرم ہے۔'' صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ، غیبت زنا سے سخت جرم کیسے ہے؟ آپؐ نے فرمایا: '' آدمی زنا کرتا ہے پھر توبہ کرتا ہے اور اللہ اس کی توبہ قبول فرماتا ہے۔'' ایک روایت میں ہے کہ '' پھر وہ توبہ کرتا ہے اور اللہ اس کو بخش دیتا ہے لیکن غیبت کرنے والے کو اللہ نہیں بخشتا جب تک کہ اسے وہ شخص معاف نہ کر دے جس کی اس نے غیبت کی ہے۔'' اور حضرت انسؓ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: '' زنا کرنے والا توبہ کرتا ہے اور غیبت کرنے والے کے لیے توبہ نہیں۔''

تشریح: جن تین روایتوں کا ذکر یہاں کیا گیا ہے، ان کو بیہقی نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے۔ غیبت کو زنا سے زیادہ سنگین قرار دیا گیا ہے۔ کیوں کہ غیبت کرنے والے بالعموم اسے ہلکی چیز سمجھتے ہیں اس لیے نہ وہ اس پر شرم سار ہوتے ہیں اور نہ توبہ واستغفار سے کام لیتے ہیں۔ جب کہ زنا میں مبتلا ہونے والے کو لازماً اپنے فعل بد پر ندامت اور شرم ساری ہوتی ہے اور وہ توبہ کرتا ہے اور خدا سے اپنے گناہ کی معافی مانگتا ہے۔

یہ جو فرمایا کہ '' غیبت کرنے والے کے لیے توبہ نہیں'' اس کا مطلب یہ ہے کہ غیبت

کرنے والے کو بالعموم توبہ کی توفیق نہیں ہوتی اس لیے کہ وہ غیبت کی قباحت و شناعت کو محسوس نہیں کرتا۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی ہے کہ غیبت کرنے والے کی توبہ بہ ذات خود کوئی چیز نہیں جب تک کہ وہ شخص اسے معاف نہ کردے جس کی اس نے غیبت کی ہے۔ اس کی توبہ کی مقبولیت اس شخص کے معاف کردینے پر موقوف ہے جس کی غیبت کا ارتکاب اس سے ہوا ہے۔

﴿۳﴾ وَ عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: لَا يُبَلِّغُنِىْ اَحَدٌ مِّنْ اَصْحَابِىْ عَنْ اَحَدٍ شَيْئًا فَاِنِّىْ اُحِبُّ اَنْ اَخْرُجَ اِلَيْكُمْ وَ اَنَا سَلِيْمُ الصَّدْرِ۔ (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ''میرے صحابہ میں سے کوئی مجھے کسی شخص کے بارے میں بری بات نہ پہنچائے کیوں کہ مجھے یہ بات پسند ہے کہ جب میں گھر سے نکل کر تمھارے پاس آؤں تو میرا سینہ صاف ہو۔''

تشریح: عظمت اور بزرگی کی حامل شخصیت کا یہی حال ہوتا ہے۔ مقام عظمت پر فائز شخص کی یہی آرزو اور خواہش ہوگی کہ اپنے اصحاب کی طرف سے اس کے دل میں کوئی کدورت نہ ہوتا کہ دمِ آخر وہ ان سے راضی اور خوش ہو۔ اس کے برخلاف کم ظرف شخص ہمیشہ اس ٹوہ میں رہتا ہے کہ وہ لوگوں کی برائیوں پر مطلع ہو۔ اسے اس میں ایک خاص قسم کا حظ ملتا ہے۔ اسے اس کی بدذوقی اور کم ظرفی کے سوا اور کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ حقیقی مصلح لوگوں کی اصلاح اور ان کے عیبوں کی پردہ پوشی سے دلچسپی رکھے گا۔ اسے لوگوں کے عیبوں کی پردہ دری سے سخت انقباض ہوگا۔

﴿۴﴾ وَ عَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: اَتَدْرُوْنَ مَا الْغِيْبَةُ؟ قَالُوْا: اَللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ۔ قَالَ: ذِكْرُكَ اَخَاكَ بِمَا يَكْرَهُ۔ قِيْلَ: اَفَرَاَيْتَ اِنْ كَانَ فِىْ اَخِىْ مَآ اَقُوْلُ؟ قَالَ: اِنْ كَانَ فِيْهِ مَا تَقُوْلُ فَقَدِ اغْتَبْتَهٗ وَ اِنْ لَّمْ يَكُنْ فِيْهِ فَقَدْ بَهَتَّهٗ۔

(مسلم)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ''کیا تم جانتے ہو کہ غیبت کیا ہے؟'' صحابہؓ نے عرض کیا: اللہ اور اس کے رسول زیادہ جانتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: ''تمھارا اپنے کسی بھائی کا ذکر اس طرح کرنا جو اسے ناگوار ہو۔'' عرض کیا گیا کہ اگر وہ برائی واقعتاً میرے بھائی میں ہو جس کا ذکر میں کروں؟ آپؐ نے فرمایا ''اگر وہ عیب اس میں موجود ہے جو تم نے بیان کیا تو تم نے اس کی غیبت کی۔ اور اگر وہ اس میں نہیں ہے تو تم نے اس پر بہتان لگایا۔''

تشریح: پیٹھ پیچھے کسی کا کوئی عیب بیان کرنا غیبت ہے خواہ اس عیب کا تعلق اس شخص کے ظاہر سے ہو یا باطن سے۔ اگر وہ عیب فی الواقع اس شخص میں نہیں پایا جاتا جو بیان کرنے والا اس کی طرف منسوب کرتا ہے تو یہ غیبت نہیں بل کہ اتہام اور افتراء ہے جو غیبت سے بڑھ کر سنگین قسم کا جرم ہے۔

غیبت ایک ایسی برائی ہے جس کا سماج کے بگاڑ اور معاشرہ کی خوش گوار فضا کو مسموم کرنے میں بڑا دخل ہے۔ لیکن اس کی معاشرتی برائی آج حیرت انگیز حد تک عام ہے۔ بہت تھوڑے خوش قسمت لوگ ہوں گے جو اس برائی سے محفوظ ہوں گے۔

یہاں یہ خیال رہے کہ کسی کے عیب کا اظہار زبان و بیان سے بھی ہوتا ہے اور یہ اظہار اشارہ و کنایہ کے ذریعہ سے بھی ممکن ہے۔ اپنے بھائی کی تحقیر اور اس کی شخصیت کو مجروح کرنا بہر صورت حرام ہے۔ بلا کسی مجبوری اور ناگزیر ضرورت کے کسی کے عیب کو اس کے منہ پر بھی بیان کرنا سخت گناہ ہے۔ اس لیے کہ یہ حیاء اور مروت کے خلاف ہے۔ اسے سنگ دلی اور ایذا رسانی کے سوا کسی دوسرے نام سے موسوم نہیں کیا جا سکتا۔

بعض صورتوں میں کسی کے عیب یا اس کی کسی کم زوری کا اظہار ناگزیر ہوتا ہے۔ اس طرح کی بعض صورتوں کا ہم آگے چل کر ذکر کریں گے۔ ان صورتوں کے علاوہ کسی کے پیٹھ پیچھے اس کا عیب بیان کرنا غیبت ہی کہلائے گا۔

﴿۵﴾ وَ عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَمَّا عُرِجَ بِیْ مَرَرْتُ بِقَوْمٍ لَّهُمْ اَظْفَارٌ مِّنْ نُّحَاسٍ يَّخْمِشُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَ صُدُوْرَهُمْ فَقُلْتُ مَنْ هٰٓؤُلَآءِ يَا جِبْرِيْلُ؟ قَالَ: هٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ يَأْكُلُوْنَ لُحُوْمَ النَّاسِ وَ يَقَعُوْنَ فِیْ اَعْرَاضِهِمْ۔

(ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ”جب مجھے معراج ہوئی تو میرا گزر کچھ ایسے لوگوں پر ہوا جن کے ناخن تانبے کے تھے جن سے وہ اپنے چہروں اور اپنے سینوں کو نوچ کھسوٹ رہے تھے۔ میں نے پوچھا: اے جبریل، یہ کون لوگ ہیں؟ انھوں نے کہا: یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کا گوشت کھایا کرتے تھے اور ان کی آبروؤں کے پیچھے پڑے رہتے تھے۔“

تشریح: ”جو لوگوں کا گوشت کھایا کرتے تھے۔“ یعنی ان کی غیبت کرتے رہتے تھے۔ ”ان کی

عزت و آبرو کے پیچھے پڑے رہتے تھے۔" یعنی ان کے لیے ناشائستہ و نازیبا الفاظ استعمال کرتے تھے۔ اور اس طرح ان کی عزت و آبرو سے کھیلتے تھے۔ انھوں نے لوگوں کی آبرو و عزت پامال کر کے ان کے سینوں یعنی دلوں کو مغموم اور ان کے چہروں کو مجروح کیا۔ لہٰذا ان کے لیے یہی سزا مناسب ہے کہ اب یہ خود اپنے ہاتھوں اپنے سینوں اور اپنے چہروں کو مجروح اور زخمی اور بے رونق کریں۔

﴿۶﴾ وَ عَنْ عَائِشَةَ ؓ قَالَتْ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: لَا تَسُبُّوا الْاَمْوَاتَ فَاِنَّهُمْ قَدْ اَفْضَوْا اِلٰى مَا قَدَّمُوْا۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: "مُردوں کو برا مت کہو کیوں کہ جو کچھ انھوں نے آگے بھیجا وہ اسے پا چکے۔"

تشریح: یعنی کسی کی موت کے بعد اس کی غیبت کرنا اور بھی برا ہے اس لیے کہ جو کچھ اس نے دنیا میں کیا ہے، اب وہ خود اس کے نتائج سے دوچار ہے۔ اب اس کی مذمت ایک گری ہوئی حرکت کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

﴿۷﴾ وَ عَنْهَا قَالَتْ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَآ اَظُنُّ فُلَانًا وَ فُلَانًا يَعْرِفَانِ مِنْ دِيْنِنَا شَيْئًا۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "میں نہیں سمجھتا کہ فلاں اور فلاں شخص ہمارے دین کے بارے میں کچھ بھی واقفیت رکھتے ہوں۔"

تشریح: یعنی وہ دینِ حق سے بالکل بیگانہ و ناآشنا ہیں۔ یہاں انداز بظاہر غیبت کا معلوم ہوتا ہے لیکن یہ غیبت نہیں ہے۔ کیوں کہ کسی کی پیٹھ پیچھے اس کی کسی کمزوری اور نقص کو بیان کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ جس کا مقصد لذّتِ نفس نہ ہو بلکہ لوگوں کو اس کے شر سے محفوظ رکھنا یا انھیں متنبہ کرنا ہو کہ وہ اس کے ظاہری دعویٰ علم و تقویٰ سے کسی دھوکہ میں مبتلا نہ ہوں۔

بعض صورتیں ایسی ہوتی ہیں جن میں کسی شخص یا گروہ کے عیب کا اظہار اس کے پیٹھ پیچھے روا اور درست ہوتا ہے۔ مثلاً کسی ظالم کے ظالمانہ رویہ سے حاکمِ وقت کو مطلع کرنا تاکہ وہ اسے ظلم سے باز رکھنے کی تدبیر اختیار کر سکے۔ اسی طرح نکاح کے سلسلہ میں اگر مشورہ طلب کیا جائے تو مشورہ طلب کرنے والے کو بتا دے کہ جس شخص سے وہ رشتہ قائم کرنے جا رہا ہے وہ اخلاق و کردار کے لحاظ سے کیسا ہے؟ اسی طرح حدیث کے راویوں کے حالات کے اظہار کے

سلسلہ میں ضروری سمجھا گیا ہے کہ اگر ان میں سے کسی کی کچھ کمزوریاں سامنے آتی ہیں تو ان کمزوریوں کو ہرگز نہ چھپائے تاکہ اس کی روایت کی ہوئی حدیث کے بارے میں صحیح رائے قائم کی جاسکے۔ محدثین نے غیر عادل اور غیر ثقہ راویوں پر جرح شرعی تقاضے ہی کے تحت کی ہے۔

الغرض، کسی شرعی، تمدنی اور اخلاقی مقصد کے پیش نظر کسی شخص یا گروہ کے عیوب پر سے پردہ اٹھانا غیبت میں داخل نہیں ہے۔ بل کہ بعض صورتوں میں تو یہ پردہ اٹھانا نہایت ضروری ہوتا ہے۔ امام نوویؒ نے ایسی چھ صورتوں کا ذکر کیا ہے جن کی وجہ سے کسی کی برائی یا عیب کے اظہار کا جواز پیدا ہوجاتا ہے۔

﴿۸﴾ وَ عَنْ اَنَسٍ ؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: کَفَّارَۃٌ مِّنَ الْغِیْبَۃِ اَنْ تَسْتَغْفِرَ لَہٗ۔

(جامع صغیر)

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''غیبت کا کفارہ یہ ہے کہ اس شخص کے حق میں مغفرت کی دعا کی جائے جس کی غیبت کی گئی ہو۔''

تشریح: بعض علماء کا خیال ہے کہ جس کی غیبت کی گئی ہے، اس کے حق میں دعائے مغفرت غیبت کا کفارہ اسی صورت میں ہوگا جب کہ اس شخص کو، جس کی غیبت کی گئی ہے، اس غیبت کی خبر نہ ہو۔ اور اگر اسے غیبت کی خبر پہنچ چکی ہے تو پھر ضروری ہوجاتا ہے کہ غیبت کرنے والا اس سے اپنی غلطی معاف کرالے۔ البتہ اگر اس سے معافی طلب کرنے کا امکان باقی نہ رہا ہو مثلاً اس کا انتقال ہو چکا ہو تو پھر اس صورت میں توبہ اور استغفار پر اکتفا کرے اور خدا سے یہ امید رکھے کہ وہ اس شخص کو جس کی اس نے غیبت کی ہے، اس کے اپنے تئیں راضی کردے گا۔

چغلی

﴿۱﴾ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُمَا قَالَ: مَرَّ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ عَلٰی قَبْرَیْنِ فَقَالَ: اِنَّہُمَا لَیُعَذَّبَانِ وَمَا یُعَذَّبَانِ فِیْ کَبِیْرٍ، اَمَّا ھٰذَا فَکَانَ لَا یَسْتَتِرُ مِنْ بَوْلِہٖ وَ اَمَّا ھٰذَا فَکَانَ یَمْشِیْ بِالنَّمِیْمَۃِ۔ ثُمَّ دَعَا بِعَسِیْبٍ رُطَبٍ فَشَقَّہٗ بِاثْنَیْنِ فَغَرَسَ عَلٰی ھٰذَا وَاحِدًا وَّ عَلٰی ھٰذَا وَاحِدًا ثُمَّ قَالَ: لَعَلَّہٗ یُخَفَّفُ عَنْہُمَا مَالَمْ یَیْبَسَا۔

(بخاری)

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ دو قبروں کے پاس سے گزرے تو فرمایا: ''ان دونوں پر عذاب ہو رہا ہے اور یہ عذاب ان پر بہ ظاہر کسی بہت بڑے گناہ کے سبب سے نہیں ہو رہا ہے۔ یہ قبر والا اپنے پیشاب کے چھینٹوں سے نہیں بچتا تھا اور یہ چغلی کھاتا پھرتا تھا۔'' پھر آپؐ نے ایک تر و تازہ شاخ منگائی اور اس کے دو ٹکڑے کیے۔ ایک ٹکڑا اس پر اور دوسرا اس پر گاڑ دیا اور فرمایا: ''امید ہے کہ دونوں کے عذاب میں تخفیف ہوگی جب تک کہ یہ خشک نہ ہوں۔''

تشریح: ''یہ عذاب کسی بہت بڑے گناہ پر نہیں ہو رہا ہے'' اس کے لیے متن میں **وَمَا يُعَذَّبَانِ فِيْ كَبِيْرٍ** کے الفاظ آئے ہیں۔ بخاری کی ایک دوسری روایت میں **وَمَا يُعَذَّبَانِ فِيْ كَبِيْرٍ بَلٰى اِنَّهٗ كَبِيْرٌ** کے الفاظ مروی ہیں۔ مفہوم یہ ہے کہ عذاب بہ ظاہر کسی بڑے گناہ کی وجہ سے نہیں ہو رہا تھا۔ وہ دنیا میں ان کی طرف سے بے پروا تھے۔ ان کو کوئی بڑا گناہ سمجھتے بھی نہ تھے لیکن حقیقت میں یہ گناہ ہلکے اور معمولی نہ تھے۔

اس کا ایک دوسرا مفہوم یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ گناہ ایسے نہ تھے کہ ان سے بچنا ان کے لیے مشکل اور دشوار ہوتا۔ اگر وہ چاہتے تو بہ آسانی ان سے بچ سکتے تھے۔ بلا شبہ انھوں نے تساہل سے کام لیا۔ ان کا یہ جرم معمولی نہیں۔

شاخیں جب تک تر و تازہ رہتی ہیں وہ خدا کا ذکر اور اس کی تسبیح کرتی رہتی ہیں۔ ان کے اس ذکر کی وجہ سے عذاب میں تخفیف اور کمی کی توقع ہوتی ہے۔ اس ذکر و تسبیح کی حقیقت خواہ ہم نہ سمجھ سکیں لیکن اتنی بات تو عیاں ہے کہ دنیا میں جہاں کہیں اور جس صورت میں بھی نور و رونق اور تازگی، صفائی اور شگفتگی ہے، وہ خدا کی صفات ہی کی نظیر ہے۔ خدا کی تجلّیِ صفات کے بغیر ہم کسی حسن و رعنائی اور خیر کا تصور نہیں کر سکتے۔

﴿۲﴾ وَعَنْ حُذَيْفَةَ رضی اللہ عنہ **قَالَ: سَمِعْتُ النَّبِيَّ** ﷺ **يَقُوْلُ: لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ قَتَّاتٌ۔**

(بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت حذیفہؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے نبی ﷺ کو فرماتے سنا: ''جنت میں چغل خور داخل نہ ہوگا۔''

تشریح: مسلم کی ایک روایت میں قَتَّاتٌ کے بہ جائے نَمَّامٌ کا لفظ آیا ہے۔ دونوں کے ایک ہی

معنیٰ ہوتے ہیں۔ یعنی چغل خور۔ جو شخص چغلی کھا کھا کر معاشرے کو بگاڑنے اور اسے جہنم زار بنانے کی سعی میں لگا رہا ہو، وہ اس جنت کا مستحق کیوں کر ہو سکے گا جہاں بگاڑ اور فساد نہیں اور نہ جہاں حسد و عناد پایا جاتا ہے۔ جہاں ایسی کوئی چیز دیکھنے کو نہ ہوگی جو اخلاقی پستی اور دنائت کی مظہر ہو۔

کسی کی ایسی بات کو دوسرے شخص تک پہنچانا چغلی ہے جس کی وجہ سے وہ شخص اس سے ناراض و بدگمان ہو جائے اور ان کے باہمی تعلقات خراب ہو جائیں۔ جو چیزیں بھی باہمی تعلقات کو بگاڑنے والی اور بغض و عداوت اور منافرت کو ہوا دینے والی ہیں، اسلام ان کو بدترین قسم کی معصیت قرار دیتا ہے۔ اس لیے کہ اس طرح کی چیزیں ان عظیم مقاصد کے خلاف ہیں جن کو تعلیمات نبوی میں بنیادی اہمیت دی گئی ہے۔ جیسے اخوت محبت، حسن معاشرت اور باہمی تعلقات و روابط کی خوش گواری اور درستی وغیرہ۔

⟨۳⟩ وَ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍؓ قَالَ: اِنَّ مُحَمَّدًا ﷺ قَالَ: اَلَآ اُنَبِّئُكُمْ مَا الْعِضْهُ؟ هِيَ النَّمِيْمَةُ الْقَالَةُ بَيْنَ النَّاسِ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ حضرت محمد ﷺ نے فرمایا: ”میں تمھیں بتاتا ہوں کہ بہتانِ قبیح کیا ہے؟ یہ وہ چغلی ہے جو لوگوں کے درمیان عداوت ڈال دے۔“

تشریح: اس حدیث میں ان لوگوں کے لیے بڑی تنبیہ ہے جو اِدھر کی بات اُدھر اور اُدھر کی اِدھر کرتے اور چغلی کھاتے پھرتے ہیں۔ ایسے لوگ درحقیقت سماج دشمن ہوتے ہیں۔ لوگوں کے درمیان فتنہ و فساد کے بیج بونا ان کا محبوب ترین مشغلہ ہوا کرتا ہے۔

کینہ

⟨۱⟩ عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: تُفْتَحُ اَبْوَابُ الْجَنَّةِ يَوْمَ الْاِثْنَيْنِ وَ يَوْمَ الْخَمِيْسِ فَيُغْفَرُ لِكُلِّ عَبْدٍ لَّا يُشْرِكُ بِاللّٰهِ شَيْئًا اِلَّا رَجُلٌ كَانَتْ بَيْنَهٗ وَ بَيْنَ اَخِيْهِ شَحْنَآءُ فَيُقَالُ اُنْظُرُوْا هٰذَيْنِ حَتّٰى يَصْطَلِحَا، اُنْظُرُوْا هٰذَيْنِ حَتّٰى يَصْطَلِحَا۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”جنت کے دروازے دوشنبہ اور پنج شنبہ (جمعرات) کے دن کھولے جاتے ہیں۔ پھر ایسے بندے کی مغفرت

کر دی جاتی ہے جو اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرتا ہو بجز اس شخص کے جس کی اپنے بھائی کے ساتھ کینہ و عداوت ہو اور حکم ہوتا ہے کہ انھیں دیکھتے رہو یہاں تک کہ یہ باہم مل جائیں۔ انھیں دیکھتے رہو یہاں تک کہ یہ باہم میل ملاپ کرلیں۔

تشریح: صحیح مسلم میں ایک دوسری روایت حضرت ابو ہریرہؓ سے یہ مروی ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: يُعْرَضُ اَعْمَالُ النَّاسِ فِيْ كُلِّ جُمُعَةٍ مَرَّتَيْنِ يَوْمَ الْاِثْنَيْنِ وَ يَوْمَ الْخَمِيْسِ فَيُغْفَرُ لِكُلِّ عَبْدٍ مُّؤْمِنٍ اِلَّا عَبْدًا بَيْنَهٗ وَ بَيْنَ اَخِيْهِ شَحْنَآءُ فَيُقَالُ اُتْرُكُوْا هٰذَيْنِ حَتّٰى يَفِيْئَا۔ (مسلم) ہر ہفتہ دو مرتبہ یعنی دوشنبہ اور پنج شنبہ کو لوگوں کے اعمال پیش ہوتے ہیں۔ پھر ہر مومن بندے کی مغفرت کر دی جاتی ہے۔ سوائے اس بندے کے جو اپنے اور اپنے بھائی کے درمیان کینہ و عداوت رکھتا ہو۔ پس حکم ہوتا ہے کہ انھیں چھوڑے رکھو (ان کے معاملہ کو التواء میں رکھو) یہاں تک کہ یہ رجوع کریں اور دشمنی سے باز آجائیں۔''

یہ روایتیں بتاتی ہیں کہ حقیقت برابر یہ جائزہ لیتی رہتی ہے اور ہفتہ میں خاص طور سے دو مرتبہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ کس شخص کی کیا پوزیشن ہے۔ کون جنت اور مغفرت کا مستحق ہے اور کس پر جنت حرام ہے۔ جس کے لیے نہ تو جنت کے دروازے وا ہوں گے اور نہ اس کی مغفرت ہوگی۔ الا یہ کہ وہ اپنی اصلاح کرلے اور اپنا معاملہ درست کرلے۔ عدم ایمان کی صورت میں تو نجات و مغفرت کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن مومن شخص کے لیے بھی اس وقت تک جنت کے دروازے بند رہتے ہیں اور اس کی مغفرت بھی التواء میں رہتی ہے جب تک کہ ایمان کے تقاضے پورے نہ کرلے۔ یا دوسرے لفظوں میں ایسی زندگی اختیار نہ کرلے جو زندگی اہل جنت کی ہوتی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ اہل جنت میں باہم کوئی عداوت اور کینہ نہ ہوگا۔ ان کے قلوب اس طرح کے مناقشات سے پاک ہوں گے۔ اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ جنت ان کے لیے ہے جو اپنے دلوں سے اپنے بھائیوں کے لیے بدخواہی اور عداوت کا کوئی جذبہ نہ رکھتے ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ جن کے دلوں میں اپنے بھائی کے تئیں بغض و عناد ہوتا ہے، ان کے لیے جنت کے دروازے بند ہی رکھے جاتے ہیں۔ حالاں کہ یہ دروازے ہفتہ میں دو بار کھلتے ہیں اور اہل مغفرت کی مغفرت کی جاتی ہے اور ان کو بلند درجات سے نوازا جاتا ہے۔

ان روایتوں سے معلوم ہوا کہ دوشنبہ اور پنج شنبہ کو کثرت سے خدا کی رحمتوں کا نزول ہوتا

ہے جو ان بندوں کی مغفرت اور نجات کا باعث ہوتی ہے جو اس کے مستحق ہوتے ہیں۔ ان موقعوں پر لوگوں کے اعمال کا بھی جائزہ لیا جاتا ہے تاکہ یہ فیصلہ کیا جا سکے کہ وہ خوش قسمت لوگ کون ہیں جن کے حصے میں محرومی کے سوا اور کچھ نہیں آ سکتا۔ اور وہ کون ہیں جن سے امید کی جاسکتی ہے کہ شاید وہ اپنی اصلاح کرلیں اور خدا کی رحمت انھیں اپنے سایۂ عاطفت میں لے لے۔

شماتت

﴿ا﴾ عَنْ وَاثِلَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: لَا تُظْهِرِ الشَّمَاتَةَ لِاَخِيْكَ فَيَرْحَمُهُ اللّٰهُ وَ يَبْتَلِيْكَ۔ (ترمذی)

ترجمہ: حضرت واثلہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم اپنے بھائی کی مصیبت پر خوشی کا اظہار مت کرو کہ اس طرزِ عمل پر خدا اس پر رحم فرمائے اور تم کو اس مصیبت میں مبتلا کردے۔''

تشریح: اپنے کسی بھائی کو مبتلائے مصائب دیکھ کر خوش ہونا شماتت کہلاتا ہے۔ بغض و حسد کی طرح شماتت بھی رزائل اخلاق میں داخل ہے۔ شماتت اعلیٰ ظرفی کے سراسر منافی ہے۔ شماتت اللہ کو اتنا ناپسند ہے اور وہ اس سے اس درجہ ناراض ہوتا ہے کہ بسا اوقات دنیا ہی میں وہ اس کی سزا دے دیتا ہے۔ اور وہ اس طرح کہ مصیبت زدہ کو تو وہ مصیبت سے نکال لیتا اور اس کی مصیبت کو دور فرما دیتا ہے۔ اور جو شخص اس کی مصیبت پر خوشیاں منا رہا تھا، اسے مبتلائے مصیبت کر دیتا ہے۔

حسد

﴿ا﴾ عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَؓ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ قَالَ: اِيَّاكُمْ وَالْحَسَدَ فَاِنَّ الْحَسَدَ يَاْكُلُ الْحَسَنَاتِ كَمَا تَاْكُلُ النَّارُ الْحَطَبَ اَوْ قَالَ الْعُشْبَ۔ (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''حسد سے بچو، کیوں کہ حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ لکڑی کو کھا لیتی ہے۔'' یا فرمایا: ''گھاس کو کھا لیتی ہے۔''

تشریح: یعنی جس طرح آگ لکڑی یا گھاس کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے۔ ٹھیک یہی حال حسد کی

آگ کا ہے۔ کسی کے دل میں جب یہ آگ بھڑکتی ہے تو وہ اس کی دینی و اخلاقی شخصیت کو تباہ کر کے رہتی ہے۔ کسی کے اندر حسد کی بیماری کا پایا جانا اس کے کردار و سیرت کی پامالی و بربادی کا کھلا ثبوت ہے۔ جب کردار نہ رہا تو اس کے نیک اعمال کا کیا وزن باقی رہ سکتا ہے؟ کسی کے نیک اعمال اس کی علامت ہوا کرتے ہیں کہ اسلام آدمی کو جس کردار کا حامل دیکھنا چاہتا ہے اس کی اس سے توقع کی جانی چاہیے۔ لیکن اگر کسی کے اندر حسد جیسی بیماری ہے تو یہی ایک چیز ساری توقعات پر پانی پھیرنے کے لیے کافی ہے۔ انسان کو ایک دوسرے کا حاسد بن کر نہیں بل کہ ہم درد و خیر خواہ بن کر رہنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ انسان کے شخصی ارتقاء کے لیے اس سے بہتر کسی تعلیم کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اس تعلیم کے خلاف جو رویہ بھی انسان اختیار کرے گا وہ اس کے کردار اور اس کی سیرت کے لیے سم قاتل سے کم نہ ہوگا۔

اس کے علاوہ ہم جانتے ہیں کہ حاسد ہر وقت اس شخص کو نیچا دکھانے کی فکر میں لگا رہتا ہے جس سے اسے حسد ہوتا ہے۔ اور کچھ نہیں تو وہ محسود کی غیبتیں ہی کرتا رہتا ہے اور اس طرح اپنے دل کی آگ بجھانا چاہتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کی نیکیاں اس شخص کو دے دی جائیں گی جس کی وہ دنیا میں غیبتیں کرتا پھرتا تھا۔ اس طرح نیکیوں کے ضائع اور برباد ہونے کے لیے ایک حسد کی بیماری ہی کافی ہوسکتی ہے۔

﴿۲﴾ وَ عَنِ الزُّبَيْرِؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: دَبَّ اِلَيْكُمْ دَآءُ الْاُمَمِ قَبْلَكُمُ الْحَسَدُ، وَالْبَغْضَآءُ هِيَ الْحَالِقَةُ، لَا اَقُوْلُ تَحْلِقُ الشَّعْرَ وَ لٰكِنْ تَحْلِقُ الدِّيْنَ۔

(احمد، ترمذی)

ترجمہ: حضرت زبیرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”تمھاری طرف اگلی امتوں کی بیماری چلی آئی۔ وہ بیماری حسد و بغض کی ہے۔ یہ مونڈ دینے والی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہ بال کو مونڈنے والی ہے بل کہ یہ دین کو مونڈ کر رکھ دیتی ہے۔“

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور (ﷺ) کو اس بات کی اطلاع اللہ نے دے دی تھی کہ گرچہ خدا کے فضلِ خاص سے اہل ایمان کے دل باہم ملے ہوئے ہیں اور وہ بھائی، بھائی ہوگئے ہیں اور پرانے جھگڑوں کو انھوں نے بالکل فراموش کر دیا ہے لیکن بغض و حسد کی مہلک بیماری اگلی امتوں کی طرح آئندہ آپ (ﷺ) کی امت کو بھی لاحق ہوگی۔ اس لیے آپ (ﷺ)

نے مسلمانوں کو آگاہ فرمایا کہ اس کی طرف سے ہوشیار رہیں اور اپنے دلوں کو اس لعنت سے بچائے رکھنے کی فکر سے کبھی غافل نہ ہوں۔ وہ بغض وحسد کو معمولی خیال نہ کریں۔ یہ ایسی بیماری ہے جس سے آدمی کا دین وایمان تباہ وبرباد ہو کر رہ جاتا ہے۔

الزام تراشی

﴿۱﴾ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَؓ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: مَنْ حَالَتْ شَفَاعَتُهٗ دُوْنَ حَدٍّ مِّنْ حُدُوْدِ اللّٰهِ فَقَدْ ضَادَّ اللّٰهَ وَ مَنْ خَاصَمَ فِيْ بَاطِلٍ وَ هُوَ يَعْلَمُهٗ، لَمْ يَزَلْ فِيْ سَخَطِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْزِعَ عَنْهُ وَ مَنْ قَالَ فِيْ مُؤْمِنٍ مَّا لَيْسَ فِيْهِ، اَسْكَنَهُ اللّٰهُ رَدْغَةَ الْخَبَالِ حَتّٰى يَخْرُجَ مِمَّا قَالَ۔ (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسولِ خدا ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ”جس شخص نے اللہ کی کسی حد کو روکنے کے لیے سفارش کی تو اس نے خدا کی مخالفت کی اور جس کسی نے جانتے بوجھتے ناحق جھگڑا کیا تو وہ ہمیشہ خدا کے غضب میں رہے گا جب تک کہ وہ اس جھگڑے سے ہاتھ نہ کھینچ لے۔ اور جس کسی نے کسی مومن کے بارے میں وہ بات کہی جو (بری بات کہ) اس میں نہ تھی تو اللہ اس کا بود وباش جہنمیوں کے میل کچیل اور کیچڑ میں کرائے گا یہاں تک کہ جو کچھ اس نے کہا اس سے وہ توبہ کر لے۔“

تشریح: ایک روایت میں یہ الفاظ مزید آئے ہیں: وَ مَنْ اَعَانَ عَلٰى خَصُوْمَةٍ بِظُلْمٍ فَقَدْ بَاءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ (ابوداؤد) ”اور جس کسی نے کسی جھگڑے میں ناحق معاونت کی تو یقیناً غضب خداوندی میں گرفتار ہوا۔“

”اللہ کی حد کو روکنے کے لیے سفارش کی“ یعنی قاضی تک مقدمہ پہنچ جانے کے بعد اگر کوئی اس بات کی سفارش اور کوشش کرتا ہے کہ مجرم پر حد قائم نہ ہو مثلاً چور کا ہاتھ نہ کاٹا جائے یا زانی پر حد شرعی جاری نہ ہو تو ایسا شخص کسی معمولی غلطی کا ارتکاب نہیں کر رہا ہے بل کہ وہ خدا کی مخالفت کر رہا ہے۔

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی مومن پر جھوٹا الزام لگانا گناہ عظیم ہے۔ کوئی شخص آج کسی مومن پر گندگی اور کیچڑ اچھالتا ہے تو کل اسے جہنمیوں کے میل کچیل اور کیچڑ میں بود وباش

اختیار کرنی ہوگی۔ اب اس برے انجام سے نجات حاصل کرنے کی ایک ہی شکل ہے کہ وہ توبہ کرے اور اپنی اس بری حرکت سے باز آجائے اور تلافیِ مافات کرے۔ یعنی دنیا کی زندگی ہی میں اس مومن شخص سے معافی مانگ کر اسے راضی کرلے۔

خیانت

﴿۱﴾ عَنْ اَبِی اُمَامَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: يُطْبَعُ الْمُؤْمِنُ عَلَى الْخِلَالِ كُلِّهَا اِلَّا الْخِيَانَةَ وَالْكَذِبَ۔ (احمد، البیہقی فی شعب الایمان عن سعد بن ابی وقاصؓ)

ترجمہ: حضرت ابوامامہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''مومن کی طبیعت میں ہر عادت وخصلت کا امکان ہے سوائے خیانت اور جھوٹ کے۔''

تشریح: اگر کوئی شخص فی الواقع مومن ہے تو دوسری کمزوریاں اور برائیاں تو اس کے اندر ہوسکتی ہیں لیکن خیانت اور کذب جیسی منافقانہ خصلتیں اس میں نہیں پائی جاسکتیں۔ اتفاقیہ طور سے کسی مومن سے خیانت اور جھوٹ کی برائی بھی سرزد ہوسکتی ہے۔ لیکن یہ ممکن نہیں کہ خیانت اور جھوٹ اور کذب کو وہ اپنا شعار بنالے۔ اگر کسی شخص کے اندر یہ دونوں خصلتیں رچ بس گئی ہیں اور وہ ایمان کا دعوے دار بھی ہے تو سمجھ لینا چاہیے کہ اس دعویٰ کے باوجود ابھی تک ایمان کی حقیقت سے اس کا دل ناآشنا ہی ہے۔

﴿۲﴾ وَ عَنْ ثَوْبَانَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَنْ مَّاتَ وَ هُوَ بَرِیْءٌ مِنَ الْكِبْرِ وَالْغُلُوْلِ وَالدَّيْنِ دَخَلَ الْجَنَّةَ۔ (ترمذی، ابن ماجہ، دارمی)

ترجمہ: حضرت ثوبانؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جس شخص کو اس حالت میں موت آئے کہ وہ غرور وکبر، خیانت وقرض سے پاک ہو تو وہ جنت میں داخل ہوگا۔''

تشریح: خیانت کے لیے حدیث کے متن میں اصل لفظ غلول آیا ہے۔ تقسیم سے پہلے مالِ غنیمت میں چوری اور خیانت کرنے کو غلول کہتے ہیں۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جنت ان ہی لوگوں کے لیے ہے جو اعلیٰ اخلاق وکردار کے حامل ہوں اور بددیانت اور ناقابلِ اعتماد نہ ہوں۔

﴿۳﴾ وَ عَنْ اَبِی هُرَيْرَةَؓ قَالَ: قَالَ النَّبِیُّ ﷺ: اِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ يَقُوْلُ: اَنَا ثَالِثُ

الشَّرِیْکَیْنِ مَالَمْ یَخُنْ اَحَدُھُمَا صَاحِبَہٗ فَاِذَا خَانَہٗ خَرَجْتُ مِنْ بَیْنِھِمَا وَ فِیْ رِوَایَۃٍ: وَجَآءَ الشَّیْطٰنُ۔" (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: "اللہ عزوجل فرماتا ہے کہ جب تک کسی کاروبار کے دو شریک باہم خیانت کے مرتکب نہ ہوں، میں ان کے ساتھ رہتا ہوں لیکن جب ایک شریک دوسرے کے ساتھ خیانت کرتا ہے تو میں ان دونوں کے بیچ سے نکل جاتا ہوں (ایک روایت میں ہے کہ) اور پھر شیطان آجاتا ہے۔"

تشریح: یہ حدیث بتاتی ہے کہ جب تک کسی کاروبار کے شرکاء آپس میں ایک دوسرے کے حقوق کا خیال رکھتے ہیں۔ اور خیانت سے دور رہتے ہیں۔ خدا کی مدد ان کو حاصل رہتی ہے، خدا ان کے کاروبار میں برکت عطا فرماتا ہے۔ لیکن جب ان کی نیتوں میں فرق آجاتا ہے اور کاروبار کے شرکاء میں سے ہر ایک صرف اپنا فائدہ دیکھتا ہے اور دوسرے کے ساتھ خیانت اور بے انصافی سے کام لینے لگتا ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ نفع تنہا اسی کے حصے میں آئے تو ایسی صورت میں خدا کی رحمت ان سے الگ ہوجاتی ہے اور وہ اپنی مدد کا ہاتھ کھینچ لیتا ہے۔ اور شیطان کو اس کا پورا موقع حاصل ہوجاتا ہے کہ وہ ان کے باہمی تعلقات کو خراب کردے اور ان کے کاروبار کو تباہی کے راستے پر ڈال دے۔

(۴) وَ عَنْہُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم: اَدِّ الْاَمَانَۃَ اِلٰی مَنِ ائْتَمَنَکَ وَلَا تَخُنْ مَنْ خَانَکَ۔ (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جس کسی نے تم کو قابلِ اعتماد سمجھا ہے، اس پر اپنے امین ہونے کو متحقق کرو اور جو تمھارے ساتھ خیانت کا معاملہ کرے تم اس کے ساتھ خیانت کا رویہ اختیار نہ کرو۔"

تشریح: یعنی کسی کے ساتھ خیانت کی روش ہرگز اختیار نہ کرو یہاں تک کہ اس شخص کے ساتھ بھی خیانت نہ کرو جو تمھارے ساتھ خیانت کرتا ہے۔

عربی میں زبان میں اَمَانَۃٌ کے معنیٰ ہیں لائق اعتماد ہونا۔ ایسا ہونا کہ لوگوں کو پورا اطمینان ہو کہ یہ شخص ہمارا حق ضائع نہیں کرسکتا۔ قرآن میں ہے: فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُکُمْ بَعْضًا فَلْیُؤَدِّ الَّذِی اؤْتُمِنَ اَمَانَتَہٗ۔ (البقرہ: ۲۸۳)

''پس اگر تم باہم اعتماد کرو (اور اس اعتماد پر ایک دوسرے کو قرض دے دو) تو اس شخص کو جسے قابلِ اعتماد سمجھا گیا ہے، چاہیے کہ اپنے امین ہونے کو متحقق کر دے (اور قرض دینے والے کے اعتماد کو مجروح نہ ہونے دے۔)''

﴿۵﴾ وَ عَنْ سُفْيَانَ بْنِ اُسَيْدِ الْحَضْرَمِيِّ ؓ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: كَبُرَتْ خِيَانَةً اَنْ تُحَدِّثَ اَخَاكَ حَدِيْثًا وَ هُوَ لَكَ بِهٖ مُصَدِّقٌ وَ اَنْتَ بِهٖ كَاذِبٌ۔

(ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت سفیان بن اسید حضرمیؓ سے روایت ہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول خدا ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: ''یہ بہت بڑی خیانت ہے کہ تم اپنے بھائی سے کوئی بات جھوٹی کہو اور وہ تمھیں اس بیان میں سچا سمجھتا ہو۔''

تشریح: یعنی خیانت کا تعلق صرف مال ومتاع ہی سے نہیں ہے خیانت کی صورتیں مختلف ہوسکتی ہیں۔ اس حدیث میں اس کو بھی خیانت بل کہ اسے بہت بڑی خیانت قرار دیا گیا ہے کہ کوئی اپنے بھائی سے جھوٹ کہے اور اس کا بھائی اسے سچ جانے۔ دھوکہ اور خیانت ہر حالت میں گناہ ہے لیکن کسی کے حسن ظن اور اعتماد سے غلط فائدہ اٹھا کر اسے دھوکہ دینا خیانت کی ایسی صورت ہے جس میں گناہ کی شدت حد درجہ بڑھ جاتی ہے اس لیے آپ (ﷺ) نے اسے بہت بڑی خیانت قرار دیا۔ ابوداؤد کی ایک دوسری روایت میں ہے: وَ مَنْ اَشَارَ عَلٰى اَخِيْهِ بِاَمْرٍ يَعْلَمُ اَنَّ الرُّشْدَ فِيْ غَيْرِهٖ فَقَدْ خَانَهٗ ''اور جس کسی شخص نے اپنے بھائی کو کسی کام کا مشورہ دیا جس کے بارے میں وہ جانتا ہے کہ بھلائی اور بہتری اس کے سوا دوسرے کام میں ہے تو یقیناً اس نے خیانت کی۔'' یعنی اس نے بھائی کو غلط اور نقصان دہ مشورہ دے کر خیانت کا ارتکاب کیا۔ معلوم ہوا کہ کسی کو غلط مشورہ دینا بھی خیانت میں داخل ہے۔

﴿۶﴾ وَ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ ؓ قَالَ: حَدَّثَنِيْ عُمَرُ قَالَ: لَمَّا كَانَ يَوْمَ خَيْبَرَ اَقْبَلَ نَفَرٌ مِّنْ صَحَابَةِ النَّبِيِّ ﷺ فَقَالُوْا: فُلَانٌ شَهِيْدٌ وَّ فُلَانٌ شَهِيْدٌ حَتّٰى مَرُّوْا عَلٰى رَجُلٍ فَقَالُوْا: فُلَانٌ شَهِيْدٌ؟ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: كَلَّا، رَاَيْتُهٗ فِي النَّارِ فِيْ بُرْدَةٍ غَلَّهَا اَوْعَبَاءَ ةٍ۔ ثُمَّ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: يَا ابْنَ الْخَطَّابِ، اِذْهَبْ فَنَادِ فِيْ

النَّاسِ اَنَّهٗ لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ اِلَّا الْمُؤْمِنَ، ثَلَاثًا۔ قَالَ فَخَرَجْتُ فَنَادَيْتُ: "اَلَا اِنَّهٗ لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ اِلَّا الْمُؤْمِنُوْنَ، ثَلَاثًا۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ مجھ سے حضرت عمرؓ نے بیان کیا کہ جب خیبر کی جنگ ہوئی تو نبی ﷺ کے صحابہ آ آ کر کہنے لگے کہ فلاں شخص شہید ہو گیا اور فلاں شخص شہید ہو گیا یہاں تک کہ ایک شخص کے پاس سے گزرے تو اس کے بارے میں بھی یہی کہا کہ فلاں شہید ہو گیا۔ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: "ہرگز نہیں، میں نے تو اس کو آتشِ دوزخ میں دیکھا ہے۔ اس کی سزا میں کہ اس نے ایک چادر یا (آپؐ نے فرمایا کہ) ایک عباء چرا لیا تھا۔" اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اے ابن خطاب، جاؤ اور لوگوں میں اعلان کر دو کہ جنت میں صرف مومن داخل ہوں گے۔" یہ بات آپؐ نے تین بار فرمائی۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے باہر نکل کر یہ اعلان کر دیا کہ جنت میں صرف مومن ہی داخل ہوں گے۔ اور یہ تین بار فرمایا۔

تشریح: یعنی جو "المومن" اور حقیقی اہل ایمان ہوں گے۔ یہ حدیث ان لوگوں کے لیے ایک انتباہ ہے جو اس بات کو اکثر بھول جاتے ہیں کہ ایمان درحقیقت ایک مومنانہ کردار کا تقاضا کرتا ہے۔ دنیا ایک شخص کو مومن ہی نہیں، شہید تک کے خطاب سے نواز سکتی ہے لیکن اسلام اسے 'المومن' کا خطاب بھی دینے سے گریز کرتا ہے۔ کیوں کہ وہ خیانت کا مرتکب پایا گیا۔ مومن خیانت کا مرتکب کیوں کر ہوگا۔ وہ کیسا مومن کہ مالِ غنیمت میں سے چادر یا عباء یا اور کوئی چیز چپکے سے لے لے اور اس کا احساس و شعور اسے اس مذموم حرکت سے باز نہ رکھ سکے۔ یہ وہ مومن نہیں، جنت جس کی مشتاق ہوتی ہے۔ مطلوب مومن تو وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو کیفِ آزادی گناہوں اور خیانتوں میں نہیں بل کہ طاعتوں اور وفاداریوں اور فرائض کے ادا کرنے میں محسوس کرتے ہیں۔ جنت ایسے لوگوں کی مشتاق نہ ہوگی تو کن لوگوں کی مشتاق ہوگی۔

غصب

﴿۱﴾ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: لِكُلِّ غَادِرٍ لِوَآءٌ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُعْرَفُ بِهٖ۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا:

''ہر ایک خیانت اور غصب کرنے والے کے لیے قیامت کے روز ایک جھنڈا ہوگا جس کے ذریعہ سے وہ پہچان لیا جائے گا۔''

تشریح: یعنی ایسا شخص قیامت کے روز ذلیل وخوار اور رسوا ہونے سے بچ نہیں سکتا۔ دور ہی سے لوگ جھنڈا دیکھ کر پہچان لیں گے کہ یہ شخص غاصب اور خائن ہے۔

〈۲〉 وَ عَنْ وَائِلِ بْنِ حُجْرٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم: مَنِ اقْتَطَعَ اَرْضًا ظَالِمًا لَقِيَ اللّٰهَ وَ هُوَ غَضْبَانَ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت وائل بن حجرؓ سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو شخص ظالم بن کر کسی کی زمین چھین لے گا وہ اللہ سے اس حال میں ملے گا کہ وہ اس پر نہایت غضب ناک ہوگا۔''

تشریح: خوش قسمت شخص وہ ہے جو قیامت کے روز خدا سے ملاقات کرے تو اس کا خدا اس سے راضی اور خوش ہو۔ لیکن غاصب اور ظالم کے حصہ میں اس دن خدا کے غضب کے سوا اور کچھ نہ آسکے گا۔ جس پر خدا غضب ناک ہو، اس کا انجام کیا ہوگا۔ اسے ہر شخص بہ آسانی سمجھ سکتا ہے۔

〈۳〉 وَ عَنْ اَبِيْ اُمَامَةَ اِيَاسِ بْنِ ثَعْلَبَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم: مَنِ اقْتَطَعَ حَقَّ امْرِءٍ مُّسْلِمٍ بِيَمِيْنِهٖ فَقَدْ اَوْجَبَ اللّٰهُ لَهُ النَّارَ وَ حَرَّمَ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ۔ فَقَالَ لَهٗ رَجُلٌ: وَ اِنْ كَانَ شَيْئًا يَسِيْرًا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ: وَ اِنْ قَضِيْبًا مِّنْ اَرَاكٍ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابوامامہ ایاس بن ثعلبہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو شخص کسی مسلمان کا حق جھوٹی قسم کھا کر چھین لے گا تو ایسے شخص پر خدا نے دوزخ واجب کر دیا ہے اور جنت اس پر حرام کردی ہے۔'' ایک شخص نے عرض کیا، یا رسول اللہ، اگرچہ وہ چیز تھوڑی ہو؟ آپؐ نے فرمایا: ''ہاں، اگرچہ وہ پیلو کی ٹہنی ہو۔''

تشریح: جو شخص کسی مسلم کا حق چھینتا ہے اور اس کے لیے ناجائز حربے تک استعمال کرنے میں اسے کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی۔ یہاں تک کہ وہ اس کے لیے جھوٹی قسمیں بھی کھا لیتا ہے۔ وہ آخرت کی زندگی میں جنت کا نہیں، دوزخ کا مستحق قرار پائے گا اگرچہ اس نے کوئی معمولی چیز ہی کیوں نہ غصب کی ہو۔ پیلو کی ایک شاخ یا ٹہنی اگرچہ معمولی چیز ہے لیکن اسے چھین کر اس نے اپنی جس بدکرداری کا ثبوت دیا وہ کوئی معمولی جرم نہیں ہے، جسے نظر انداز کیا جاسکے۔

زبان کی بے احتیاطی

⟨۱⟩ **عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَنْ يَّضْمَنُ لِیْ مَا بَيْنَ لِحْيَيْهِ وَمَا بَيْنَ رِجْلَيْهِ اَضْمَنُ لَهُ الْجَنَّةَ۔** (بخاری)

ترجمہ: حضرت سہل بن سعدؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ”جو شخص مجھے اپنے دونوں جبڑوں اور اپنے دونوں پیروں کے درمیان کی چیز کی ضمانت دے تو میں اسے جنت کی ضمانت دیتا ہوں۔“

تشریح: یعنی جو شخص اپنی زبان اور عصمت کی حفاظت کی ضمانت دے تو میں اسے جنت کی ضمانت دینے کو تیار ہوں۔ ایسا شخص جو اپنی زبان اور شرم گاہ کی حفاظت کرتا ہے نہ وہ زبان کو استعمال کرنے میں کسی قسم کی بے احتیاطی سے کام لیتا ہے اور نہ بدکاری کے قریب جاتا ہے، وہ جنت کا مستحق قرار پائے گا۔ جنت ان ہی لوگوں کے لیے ہے جو پاک باز اور باعفت ہوتے ہیں۔ اور جن کی زبانیں اس بات کی گواہی دیتی ہیں کہ وہ بے پروا اور غیر ذمہ دار قسم کے لوگ نہیں ہیں۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں، خوب سوچ سمجھ کر پوری ذمہ داری کے ساتھ کہتے ہیں۔

⟨۲⟩ **وَ عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: كَفٰى بِالْمَرْءِ كَذِبًا اَنْ يُّحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ۔** (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ”آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ ہر وہ بات جو سنے، بیان کر دے۔“

تشریح: یعنی آدمی خواہ قصداً جھوٹ نہ بولے لیکن اگر وہ جو کچھ لوگوں سے سنتا ہے، اسے تحقیق کے بغیر بیان کرنے لگتا ہے۔ تو صرف یہی چیز اس کے کاذب ہونے کے لیے کافی ہے۔ اس لیے کہ سنی سنائی باتوں میں معلوم نہیں، کتنی ہی باتیں ایسی ہوں گی جو غلط اور بے بنیاد ہوں گی۔ اب جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اس کی زبان پر جھوٹی بات نہ آئے اور کسی صورت میں بھی جھوٹا ثابت نہ ہو، اس کے لیے لازم ہے کہ وہ تحقیق کے بغیر لوگوں سے سنی سنائی باتوں کو ہرگز نہ پھیلائے۔

⟨۳⟩ **وَ عَنْ بِلَالِ بْنِ حَارِثِ الْمُزْنِيِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: اِنَّ الرَّجُلَ لَيَتَكَلَّمُ بِالْكَلِمَةِ مِنْ رِّضْوَانِ اللّٰهِ، مَا كَانَ يَظُنُّ اَنْ تَبْلُغَ مَا بَلَغَتْ يَكْتُبُ اللّٰهُ لَهُ بِهَا**

رِضْوَانَهٗ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ یَلْقَاهُ وَ اِنَّ الرَّجُلَ لَیَتَكَلَّمُ بِالْكَلِمَةِ مِنْ سَخَطِ اللّٰهِ مَا كَانَ یَظُنُّ اَنْ تَبْلُغَ مَا بَلَغَتْ یَكْتُبُ اللّٰهُ لَهٗ بِهَا سَخَطَهٗ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ یَلْقَاهُ۔

(مؤطاامام مالک)

ترجمہ: حضرت بلال بن حارث مزنیؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ”آدمی اللہ کی خوش نودی کی ایک بات کہہ دیتا ہے، وہ نہیں جانتا کہ اس کا اثر کہاں تک پہنچے گا اور اس کی وجہ سے اس کے لیے اللہ اپنی رضا مندی روزِ قیامت تک کے لیے جب کہ وہ اس سے ملے گا لکھ دیتا ہے اور ایک آدمی خدا کی ناراضی کی ایک بات کہہ دیتا ہے، وہ نہیں جانتا کہ اس کا اثر کہاں تک پہنچے گا اور اس کی وجہ سے اس کے لیے اللہ اپنی ناراضی روز قیامت کے لیے جب کہ وہ اس سے ملاقات کرے گا لکھ دیتا ہے۔“

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آدمی کی زبان اس کے اپنے انجام کی مخبر ہوتی ہے۔ وہ جو کچھ اپنی زبان سے کہتا ہے، اس کے نتائج دوررس ہوتے ہیں۔ کبھی وہ زبان سے ایسی بات کہہ جاتا ہے جو خدا کی خوش نودی کی ہوتی ہے۔ اسے خود اس کی اہمیت اور اس کے اثرات کا اندازہ بھی نہیں ہوتا لیکن جب وہ اپنے خدا سے ملے گا تو یہ حقیقت کھل کر اس کے سامنے آجائے گی کہ خدا کی خوش نودی کی جو بات اس کی زبان سے ادا ہوئی تھی اس کی وجہ سے خدا نے اپنی رضامندی اس کے لیے روز قیامت تک کے لیے واجب فرمادی تھی۔ خدا کی رضامندی عارضی ہرگز نہ تھی۔ چناں چہ وہ خدا سے اسی حال میں مل رہا ہوگا کہ اس کا رب اس سے راضی اور نہایت خوش ہوگا۔

اس کے برعکس ایک شخص اپنی زبان سے خدا کی ناراضی کی بات کہہ جاتا ہے۔ اسے اس کی سنگینی اور اس کے دوررس برے نتائج واثرات کا خیال بھی نہیں ہوتا حالاں کہ اس سے وہ اپنے خدا کو ناراض کر لیتا ہے اور خدا کی یہ ناراضی اور غصہ عارضی نہیں ہوتا جب وہ قیامت کے دن خدا سے ملے گا تو وہ اسے ناراض پائے گا۔ اور یہ حقیقت اس پر ظاہر ہوگی کہ اپنی زبان کی بے احتیاطی سے اس نے اپنے رب کو ناراض کر رکھا ہے۔

ناراض خدا کو راضی کرنے کی ایک ہی صورت ہے کہ دنیا کی زندگی ہی میں بندہ خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگ لے اور سنجیدگی کے ساتھ اپنی اصلاح کی طرف متوجہ ہو۔

〈۴〉 وَ عَنْ اَبِیْ قَتَادَۃَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: اِیَّاکُمْ وَ کَثْرَۃَ الْحَلْفِ فِی الْبَیْعِ فَاِنَّہٗ یُنَفِّقُ ثُمَّ یَمْحَقُ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابوقتادہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ''خرید وفروخت میں زیادہ قسمیں کھانے سے بچو کیوں کہ یہ چیز کاروبار چلا دیتی ہے اور پھر مٹھ مار دیتی ہے۔''

تشریح: زیادہ قسمیں کھانے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آدمی کے دل میں خدا کی عظمت اور اس کی بزرگی کا احساس نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ محض مادی فائدے کے لیے بار بار خدا کو اپنی گفتگوؤں میں کھینچ لاتا ہے۔

حلف بازی سے شروع میں کاروبار چل نکلنے میں آسانی ہوسکتی ہے۔ لیکن بالآخر اس سے کاروبار میں برکت باقی نہیں رہتی۔ چناں چہ بخاری کی ایک روایت ہے: اَلْحِلْفُ مُنَفِّقَۃٌ لِلسِّلْعَۃِ مُمْحِقَۃٌ لِلْبَرَکَۃِ ''قسم، کاروبار کے چلنے کا سبب بنتی ہے لیکن (انجام کار) برکت کا مٹھ مار دیتی ہے۔'' یعنی شروع میں لوگ قسموں کا اعتبار کر کے لین دین کثرت سے کرنے لگتے ہیں لیکن بالآخر یہی چیز کاروبار کی برکت کو ختم کر دیتی ہے۔ قسموں کا زیادہ دنوں تک اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ جس چیز سے کاروبار ترقی کرتا ہے وہ ہے دیانت داری۔ گاہکوں کے ساتھ حسنِ معاملہ اور مناسب در پر مال کو فروخت کرنا۔ لیکن کاروبار کے بہانے اگر دکان دار لوگوں کو دھوکہ دینے ان کی جیبیں کاٹنے اور ان کو لوٹنے لگ جائے تو ایسا دکان دار خدا کی تائید اور مدد سے محروم ہو جاتا ہے۔ ایسا دیکھا گیا ہے کہ ایسے دکان داروں کا مال و اسباب تلف ہو جاتا ہے یا پھر وہ اپنی آمدنی کو ایسے کاموں میں لگا دیتا ہے جس کا کچھ منافع اسے حاصل نہیں ہو پاتا۔

فساد ڈالنا

〈۱〉 عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَؓ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ: اِیَّاکُمْ وَ سُوْٓءَ ذَاتِ الْبَیْنِ فَاِنَّھَا الْحَالِقَۃُ۔

(ترمذی)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''دو آدمیوں کے مابین فساد ڈالنے سے بچو، کیوں کہ یہ چیز (دین کو) مونڈنے اور تباہ کر دینے والی ہے۔''

تشریح: یعنی اگر تم دو آدمیوں کے تعلقات کو بگاڑنے کی کوشش کرو گے تو ان دونوں کے تو باہمی تعلقات ہی خراب ہوں گے لیکن اس حرکت سے تمہارا اپنا دین ہی تباہ ہو جائے گا۔

یہ حدیث بتاتی ہے کہ دین درحقیقت ایک کردار اور سیرت کا نام ہے۔ جب کوئی شخص برا کردار اور بری روش اختیار کرتا ہے تو لازماً اس صورت میں اس کا دین محفوظ نہیں رہتا۔ آدمی کی بری حرکتیں اور اس کے برے کرتوت ہمیشہ یہی بتاتے ہیں کہ وہ آدمی دین سے بے گانہ ہو چکا ہے۔

قطع رحمی

﴿۱﴾ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ جُبَيْرِ بْنِ مُطْعِمٍ عَنْ اَبِيْهِ يَبْلُغُ بِهِ النَّبِيُّ ﷺ قَالَ: لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ قَاطِعٌ۔ (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت محمد بن جبیر بن مطعمؓ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ کا ارشاد ہے: ”ناطے رشتے کو توڑنے والا جنت میں داخل نہ ہوگا۔“

تشریح: یعنی قاطع رحم کے لیے جو ناطے رشتے کو جوڑنے کے بہ جائے توڑتا ہے، جنت کے دروازے بند ہوں گے۔ وہ جنت میں داخل ہونے سے قاصر رہے گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ قطع رحمی سنگین جرم و گناہ ہے۔ جنت ان لوگوں کے لیے نہیں ہے جن کے قلوب سخت اور محبت و مروت سے خالی ہوں۔ جنت تو پیار و محبت کا گھر ہے۔ اس میں ایسے لوگ کیوں کر داخل ہوں گے جو محبت کے دشمن ہوں۔

﴿۲﴾ وَ عَنْ جَابِرٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اِنَّ اِبْلِيْسَ يَضَعُ عَرْشَهٗ عَلَى الْمَآءِ ثُمَّ يَبْعَثُ سَرَايَاهُ فَاَدْنَاهُمْ مِنْهُ مَنْزِلَةً اَعْظَمُهُمْ فِتْنَةً يَجِيْءُ اَحَدُهُمْ، فَيَقُوْلُ: فَعَلْتُ كَذَا وَ كَذَا۔ فَيَقُوْلُ: مَا صَنَعْتَ شَيْئًا۔ ثُمَّ يَجِيْءُ اَحَدُهُمْ، فَيَقُوْلُ: مَا تَرَكْتُهٗ حَتّٰى فَرَّقْتُ بَيْنَهٗ وَ بَيْنَ امْرَاَتِهٖ فَيُدْنِيْهِ مِنْهُ فَيَقُوْلُ: نَعَمْ، اَنْتَ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ”ابلیس اپنا تخت پانی پر رکھتا ہے، پھر اپنا لشکر بھیجتا ہے۔ مرتبے میں اس سے سب سے قریب وہ ہوتا ہے جو ان میں سب سے بڑھ کر فتنہ ڈالنے والا ہو۔ ان میں سے کوئی شیطان آ کر کہتا ہے کہ میں نے فلاں اور فلاں کام انجام دیا۔ ابلیس کہتا ہے کہ تم نے کچھ بھی نہ کیا۔ پھر کوئی آ کر کہتا ہے کہ میں نے فلاں شخص کو نہیں چھوڑا (اس کے پیچھے پڑا رہا) یہاں تک کہ میں نے اس کے اور اس کی بیوی کے درمیان جدائی کرا دی۔ ابلیس اسے اپنے سے قریب کر لیتا ہے اور کہتا ہے کہ ہاں، تم نے بڑا کام کیا۔“

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ابلیس کا مقرب وہی ہے اور وہی اپنی ذہنیت اور مزاج کے اعتبار سے ابلیس کے قریب ہے جو زیادہ سے زیادہ فتنہ وفساد کی بنا ڈال سکے اور لوگوں کے باہمی تعلقات کو بگاڑ سکے۔

شیاطین ابلیس کو اپنے کاموں کی اطلاع دیتے ہیں مثلاً کوئی کہتا ہے کہ میں نے فلاں کو شراب پینے پر آمادہ کیا اور فلاں کو چوری کرنے پر اکسایا۔ ابلیس کی نگاہ میں بڑا کارنامہ یہ ہے کہ لوگوں کے باہمی تعلقات میں خرابی پیدا کر دی جائے اسی لیے وہ اپنے کارندے سے کہتا ہے کہ قابل قدر کارنامہ تم نے انجام دیا کہ زن وشو میں جدائی ڈال دی۔ اصل اور دوررس نتائج کا حامل کام یہی ہے کہ لوگوں کے باہمی تعلقات اور بالخصوص شوہر و بیوی کے تعلق میں رخنہ پیدا کر دیں۔ خاندانوں کو تباہ کیا جائے اور انسانی معاشرہ کو فساد اور بگاڑ کی آماجگاہ بنا دیا جائے۔

اس حدیث میں سماج کے ایسے عناصر کے لیے سخت انتباہ ہے۔ جنھیں لوگوں کے مابین اصلاح کا کام کرنے کے بہ جائے ان کے تعلقات کو بگاڑنے ہی میں حظ ملتا ہے اور اسی کام میں وہ اپنی توانائیاں اور قوتیں صرف کرتے رہتے ہیں۔

علم کی ناقدری

﴿۱﴾ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ ؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَنْ تَعَلَّمَ عِلْمًا مِمَّا یُبْتَغٰی بِهٖ وَجْهُ اللّٰهِ لَا یَتَعَلَّمُهٗ اِلَّا لِیُصِیْبَ بِهٖ عَرَضًا مِّنَ الدُّنْیَا لَمْ یَجِدْ عَرْفَ الْجَنَّةِ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ یَعْنِیْ رِیْحَهَا۔ (ترمذی، احمد، ابوداؤد، ابن ماجہ)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ”جس نے وہ علم سیکھا جس کے ذریعہ سے خدا کی خوش نودی حاصل کی جاتی ہے مگر وہ اسے اس غرض سے سیکھتا ہے کہ اس کے ذریعہ سے دنیا کا ساز وسامان حاصل کر لے تو وہ قیامت کے روز جنت کی خوش بو بھی نہ پا سکے گا۔“

تشریح: چوں کہ اس نے اس علم کی اہانت کی اور اس نے اسے ادنیٰ اور حقیر چیز کی کمائی کا ذریعہ بنایا اور اپنے آپ کو اصل مقصد سے دور رکھا اس لیے وہ خدا کی خوش نودی سے محروم ہی رہے گا۔ جنت چوں کہ خدا کی خوش نودی اور اس کی رضا مندی ہی کا مظہر ہے اس لیے وہ جنت کے قریب بھی نہ پھٹک سکے گا۔ اسے جنت تو کیا، جنت کی خوش بو بھی نصیب نہ ہو سکے گی۔

〈۲〉 وَ عَنۡهُ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ ﷺ: مَنۡ سُئِلَ عَنۡ عِلۡمٍ عَلِمَهٗ ثُمَّ كَتَمَهٗ اُلۡجِمَ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ بِلِجَامٍ مِّنَ النَّارِ۔ (احمد، ترمذی، ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ”جس شخص سے کوئی ایسی بات دریافت کی گئی کہ اس کے علم میں ہے، پھر اس نے اسے چھپایا تو قیامت کے روز اس کو آگ کی لگام پہنائی جائے گی۔“

تشریح: ابن ماجہ میں یہ روایت حضرت انسؓ سے مروی ہے۔

علم کو چھپانا اور لوگوں کو اس سے استفادہ کا موقع فراہم نہ کرنا یہاں تک کہ جو لوگ اس کے علم سے استفادہ کرنا چاہتے ہوں انھیں بھی اس سے محروم کرنا اتنا بڑا ظلم ہے کہ قیامت کے روز علم کے چھپانے والے کے منھ میں آتشِ دوزخ کی لگام لگائی جائے گی کہ جب دنیا میں حق کے اظہار کے لیے تیری زبان نہ کھل سکی تو اب اسے بند ہی رہنا چاہیے۔

لسّانی و بیان آرائی

〈۱〉 عَنۡ عَمۡرِو بۡنِ الۡعَاصِؓ قَالَ: سَمِعۡتُ رَسُوۡلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوۡلُ: لَقَدۡ رَاَيۡتُ اَوۡ اُمِرۡتُ اَنۡ اَتَجَوَّزَ فِي الۡقَوۡلِ فَاِنَّ الۡجَوَازَ هُوَ خَيۡرٌ۔ (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت عمرو بن عاصؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسولِ خدا ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ”میں نے سمجھ لیا ہے یا (یہ فرمایا کہ) مجھے حکم ہوا ہے کہ میں تقریر اور گفتگو میں اختصار سے کام لوں کیوں کہ مختصر تقریر ہی بہتر ہوتی ہے۔“

تشریح: حضرت عمرو بن عاصؓ نے دیکھا کہ ایک شخص کھڑا ہوا اور اس نے بڑی لمبی چوڑی تقریر کی۔ اس موقع پر انھوں نے کہا کہ لو قصد فی قولہ لکان خیرا لہ ”اگر اپنی تقریر میں اختصار اور میانہ روی سے کام لیتا تو اس کے لیے بہتر ہوتا۔“ اور اپنی بات کی تائید میں یہ حدیث بیان کی۔

عام طور سے لوگ بے ضرورت لمبی چوڑی گفتگو یا تقریر کرتے ہیں۔ مہذب ذہن اس کو کبھی پسند نہیں کرسکتا۔ طویل گفتگو ہمیشہ اکتانے والی ہوتی ہے۔ اس سے ایک قسم کی بے کیفی اور بے دلی ہی پیدا ہوتی ہے۔ لوگوں کو ایسے مقرر یا خطیب سے وحشت ہونے لگتی ہے جو لمبی تقریر کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ ایسی صورت میں ان کی باتیں اور تقاریر بھی غیر موثر ہو کر رہ جاتی ہیں۔

جس تقریر میں ایجاز ہو، جو ضرورت کے مطابق اور مختصر ہو، اس تقریر کو لوگ پوری توجہ اور یک سوئی کے ساتھ سن سکتے ہیں۔ اور مختصر و موثر باتیں بالعموم حافظہ میں محفوظ بھی رہتی ہیں۔ اور پھر، آدمی کو ان پر غور و فکر کرنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ موثر تقریر یا گفتگو ہمیشہ بالعموم مختصر ہوا کرتی ہے۔ طول و طویل گفتگو اکثر غافل قلوب کی پیداوار ہوتی ہے۔ جن لوگوں کے قلوب غفلت میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں جن کو خدا کی عظمت اور اس کی بزرگی اور اس کے کمال و جمال کا احساس نہیں ہوتا وہ اکثر طلاقت لسانی کے ذریعہ سے اس خلا کو پُر کرنا چاہتے ہیں جو ان کے یہاں پایا جاتا ہے۔ لیکن اس تدبیر سے ان کی کم زوری تو رفع نہیں ہوتی۔ البتہ ممکن ہے، لوگوں میں ان کی زبان دانی اور طلاقت لسانی کی شہرت ہوجائے۔ لیکن یہ تو کوئی مقصد نہ ہوا۔

﴿۲﴾ وَ عَنْ اَبِیْ اُمَامَۃَ رضی اللہ عنہ عَنِ النَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: اَلْحَیَآءُ وَالْعِیُّ شُعْبَتَانِ مِنَ الْاِیْمَانِ، وَالْبَذَآءُ وَالْبَیَانُ شُعْبَتَانِ مِنَ النِّفَاقِ۔ (ترمذی)

ترجمہ: حضرت ابو امامہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”حیا اور زبان بستگی ایمان کی دو شاخیں ہیں اور فحش گوئی اور لاحاصل بکواس نفاق کی دو شاخیں ہیں۔“

تشریح: اس حدیث میں ایمان اور نفاق کی واضح علامتوں کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ بتایا گیا کہ مومن کبھی بے شرمی اور بے حیائی اختیار نہیں کرتا۔ مومن حیاء، ذوق صحیح اور سلامتی طبع جیسے اوصاف سے متصف ہوتا ہے۔ یہ اوصاف اسے اس بات کا موقع ہی نہیں دیتے کہ وہ بے حیائی کا طریقہ اختیار کرے یا زبان کی تیزی و طراری کے ساتھ گفتگو کرے۔ اسے یہ فکر دامن گیر رہتی ہے کہ اس کی زبان سے کہیں کوئی غلط بات نہ نکل جائے یا مبادا، اس سے بدزبانی اور فحش گوئی کا ارتکاب ہوجائے۔

اس کے علاوہ چوں کہ مومن کی اصل توجہ خدا کی عظمت اور اس کے کمال و جمال کی طرف ہوتی ہے۔ اس وجہ سے بھی تکلم میں عِیّ یا عجز واقع ہوجاتا ہے۔ مومن کا ذوق اس کی اجازت ہی نہیں دیتا کہ وہ غیرِ مقصود میں مشغول ہو۔ اس لیے وہ بس ضروری گفتگو کرتا ہے اور وہ بھی پوری ذمہ داری اور احتیاط کے ساتھ کرتا ہے۔ اس کے لیے انبساط کا اصل سامان زبان آوری میں نہیں بل کہ خدا کی یاد میں ہوتا ہے۔ اور اس کے وقت کا بڑا حصہ اپنی اصلاح اور مخلوق خدا کی خدمت میں گزرتا ہے۔ ایسا شخص فحش کلامی کا مرتکب تو کیا ہوگا۔ وہ اس بات پر بھی قادر نہیں ہوتا

کہ اپنا مدعا بے باکانہ انداز میں ظاہر کرے۔ البتہ جب کسی مومن کو اصابت میں ملکہ حاصل ہو جاتا ہے تو اس وقت ضروری نہیں کہ اس کی احتیاط بہ شکل عیّ و عجز ظاہر ہو۔

اس کے برخلاف منافق بے حیا اور فحش گو ہوتا ہے۔ وہ باتوں میں مبالغہ آرائی اور چرب زبانی کے جوہر دکھانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ لغو اور لایعنی تقاریر اور فحش گوئی میں نہایت دلیر اور بے باک دکھائی دیتا ہے۔

بے جا تعریف

﴿۱﴾ عَنْ اَبِیْ مُوْسیٰ رضی اللہ عنہ قَالَ: سَمِعَ النَّبِیُّ صلی اللہ علیہ وسلم رَجُلاً یُثْنِیْ عَلٰی رَجُلٍ وَ یُطْرِیْهِ فِی الْمِدْحَةِ فَقَالَ: اَهْلَکْتُمْ اَوْ قَطَعْتُمْ ظَهْرَ الرَّجُلِ۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت ابو موسیٰؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو کسی کی تعریف کرتے ہوئے سنا۔ وہ اس کی تعریف میں مبالغہ سے کام لے رہا تھا۔ آپؐ نے فرمایا: ”تم نے ہلاک کر دیا یا اس شخص کی کمر توڑ دی۔“

تشریح: مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کی تعریف کرنی اور وہ بھی مبالغہ کے ساتھ، حقیقت میں اسے ہلاکت اور تباہی کے خطرے میں ڈالنا ہے۔ اس لیے کہ اگر وہ اپنی تعریفیں سن کر غرور و کبر میں مبتلا ہو گیا تو یہ اس کی اخلاقی موت ہوگی۔ اور اخلاقی موت سے بڑھ کر کسی ہلاکت اور تباہی کا ہم تصوّر بھی نہیں کر سکتے۔

﴿۲﴾ وَ عَنْ اَبِیْ بَکْرَةَ عَنْ اَبِیْهِ اَنَّ رَجُلاً ذُکِرَ عِنْدَ النَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وسلم فَاَثْنٰی عَلَیْهِ رَجُلٌ خَیْرًا فَقَالَ النَّبِیُّ صلی اللہ علیہ وسلم: ”وَیْحَکَ قَطَعْتَ عُنُقَ صَاحِبِکَ“ یَقُوْلُهٗ مِرَارًا، ”اِنْ کَانَ اَحَدُکُمْ مَادِحًا لَّا مَحَالَةَ، فَلْیَقُلْ: اَحْسَبُ کَذَا وَ کَذَا“ اِنْ کَانَ یُرٰی اَنَّهٗ کَذَالِکَ وَ حَسِیْبُهُ اللّٰهُ وَلَا یُزَکِّیْ عَلَی اللّٰهِ اَحَدًا۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت ابو بکرہؓ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک شخص کا ذکر ہوا تو ایک دوسرے شخص نے اس کی تعریف کی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”افسوس تجھ پر، تو نے اپنے ساتھی کی گردن کاٹ دی۔“ چند بار یہی کلمات فرمائے اور پھر فرمایا: ”اگر تم میں سے کسی کو تعریف کرنی ہی پڑے تو اس طرح کہے کہ میں ایسا سمجھتا ہوں“ اگر واقعی وہ اسے ایسا ہی سمجھتا ہے

(جیسا اس نے کہا ہے) اور اس کا صحیح جاننے والا تو اللہ ہی ہے اور اس صورت میں بھی خدا کی طرف سے وہ کسی کے بہتر ہونے پر جزم ویقین کے ساتھ حکم نہ لگائے۔"

تشریح: کسی کی تعریف کرنے میں خاص طور سے اس کے سامنے اس کی تعریف اور مدح کرنے میں بڑے اندیشے ہوتے ہیں۔ اسی لیے آپؐ نے فرمایا کہ تو نے اپنے دوست اور ساتھی کے حق میں اچھا نہیں کیا۔ تو نے اسے آزمائش میں ڈال دیا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ اپنی تعریفیں سن کر اپنے کو کامل تصور کرنے لگ جائے۔ اور اپنی موجودہ حالت پر مطمئن اور اپنی اصلاح کی طرف سے غافل ہوجائے۔ اور اس طرح اس پر روحانی اور اخلاقی ترقی کی راہ بند ہوجائے۔

اگر کسی ایسے شخص کی تعریف کرنی ناگزیر ہو جسے وہ قابلِ تعریف سمجھتا ہے جب بھی تعریف کرنے میں مبالغہ سے ہرگز کام نہ لے بل کہ یہ کہے کہ "جہاں تک میں سمجھتا ہوں، وہ ایسا ہے۔" حقیقت حال کی خبر خدا ہی کو ہوسکتی ہے۔ کبھی جزم ویقین کے ساتھ کسی کے بارے میں آخری فیصلہ نہ کردے۔ مثلاً ہم یہ نہ کہیں فلاں شخص تو جنتی یا خدا کا ولی ہے اس طرح کہنے کا حق کسی بندے کو حاصل نہیں ہے۔ کیا معلوم، جسے ہم جنتی یا ولی قرار دے رہے ہیں وہ خدا کی نگاہ میں کیا ہے۔ پھر ہمیں کسی کے بارے میں یہ بھی نہیں معلوم کہ اس کا خاتمہ اسلام پر ہوتا ہے یا کفر پر۔

بہ ہر حال کسی کی تعریف کرنے میں ہمیشہ احتیاط کو ملحوظ رکھنا چاہیے اور غلو سے پرہیز کرنا چاہیے۔ اور جہاں تک ممکن ہو اس کا لحاظ رکھا جائے کہ کسی کی تعریف اس کے منھ پر ہرگز نہ کی جائے۔

﴿۳﴾ وَ عَنِ الْمِقْدَادِ بْنِ الْاَسْوَدِؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اِذَا رَاَیْتُمُ الْمَدَّاحِیْنَ فَاحْثُوْا فِیْ وُجُوْهِهِمُ التُّرَابَ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت مقداد بن اسودؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: "جب تم تعریف کرنے والوں کو دیکھو تو ان کے منہ میں خاک ڈال دو۔"

تشریح: بعض علماء کے نزدیک مداحین (تعریف کرنے والوں) سے مراد یہاں وہ لوگ ہیں، جن کا پیشہ ہی خوشامد، بے جا تعریف اور مدح خوانی ہوتا ہے۔ جو مدح وتعریف اور قصیدہ خوانی میں حق و باطل کو یکسر فراموش کرکے جھوٹ کا طومار باندھتے ہیں۔ اور اس چیز کو حصول منفعت کا ذریعہ بنا رکھا ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کے بارے میں فرمایا جارہا ہے کہ ان کے منھ میں

خاک ڈال دو۔ یعنی ان کی مدح خوانی پر ہرگز خوشی کا اظہار نہ کرو اور نہ ان کو انعام واکرام سے نوازو۔ انھیں بالکل ناکام لوٹاؤ۔

یہاں یہ بات ملحوظ رہے کہ بعض ایسی حدیثیں بھی صحیحین میں موجود ہیں جن سے کسی کے منھ پر اس کی تعریف کرنے کا جواز معلوم ہوتا ہے۔ اس سے علماء نے یہ استنباط کیا ہے کہ اگر آدمی کے فتنہ میں پڑنے کا اندیشہ نہ ہو اور ضرورت محسوس ہو تو اس کے منھ پر تعریف کی جاسکتی ہے۔ اسی طرح اگر کسی شخص کے کسی پسندیدہ اور قابلِ تعریف کام پر اس کی تعریف کی جائے کہ اس سے اس کی حوصلہ افزائی ہوگی اور اس میں نیکی کی راہ میں مزید آگے بڑھنے کا شوق پیدا ہوگا اور اس سے دوسرے لوگوں کو بھی نیک کام کی ترغیب ہوگی تو اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

عہد شکنی اور وعدہ خلافی

〈۱〉 عَنِ ابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: اِنَّ الْغَادِرَ يُنْصَبُ لَهٗ لِوَآءٌ يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ فَيُقَالُ: هٰذِهٖ غَدْرَةُ فُلَانِ بْنِ فُلَانٍ۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''عہد شکنی کرنے والے کے لیے قیامت کے روز ایک جھنڈا بلند کیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ یہ فلاں ابن فلاں کی عہد شکنی ہے۔''

تشریح: مطلب یہ ہے کہ عہد شکنی کے بارے میں قیامت کے روز پورے طور پر یہ اعلان و اظہار کردیا جائے گا کہ وہ شخص عہد شکن اور بے کردار ہے۔ دنیا میں خواہ وہ کتنا ہی باعزت بنا پھرتا ہو قیامت کے روز اس کی رسوائی میں کوئی کسر باقی نہ رہے گی۔ اس روز اس کی ذلت و رسوائی کا پورا سامان بہم ہوگا۔

〈۲〉 وَ عَنْ زَيْدِ بْنِ اَرْقَمَؓ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: اِذَا وَعَدَ الرَّجُلُ اَخَاهُ وَ مِنْ نِّيَّتِهٖ اَنْ يَّفِيَ فَلَمْ يَفِ وَلَمْ يَجِئْ لِلْمِيْعَادِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ۔ (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت زید بن ارقمؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جب کوئی شخص اپنے بھائی سے وعدہ کرے اور اس کی نیت یہ ہو کہ وہ وعدے کو پورا کرے گا مگر (کسی عذر کی وجہ سے) پورا نہ کرسکے اور وقت مقرر پر نہ آسکے تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔''

تشریح: اپنے بھائی سے یہ وعدہ کرے کہ میں فلاں وقت فلاں جگہ آؤں گا اور اس کا ارادہ اور نیت یہی ہو کہ وہ اپنے اس وعدے کو لازماً پورا کرے گا۔

چوں کہ اصل فیصلہ کن چیز نیت ہے، اگر اس کی نیت وعدہ خلافی کی نہیں بل کہ کسی مجبوری کے حائل ہو جانے کی وجہ سے وہ اپنا وعدہ پورا کرنے سے قاصر رہے اور وقت مقررہ پر نہ پہنچ سکے تو وہ ہرگز گنہ گار نہ ہوگا۔

جھوٹی قسم

﴿۱﴾ عَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: مَنِ اقْتَطَعَ حَقَّ امْرِئٍ مُّسْلِمٍ بِيَمِيْنِهٖ فَقَدْ اَوْجَبَ اللّٰهُ لَهُ النَّارَ وَ حَرَّمَ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ۔ فَقَالَ لَهُ رَجُلٌ وَ اِنْ كَانَ شَيْئًا يَّسِيْرًا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ: وَ اِنْ قَضِيْبًا مِّنْ اَرَاكٍ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابوامامہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو شخص قسم کھا کر کسی مسلمان کا حق مارلے تو اللہ نے اس کے لیے جہنم واجب اور جنت حرام کر دی ہے۔'' ایک شخص نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ، اگر چہ وہ ذرا سی چیز ہو؟ آپؐ نے فرمایا: اگر چہ وہ پیلو کی ایک ٹہنی ہی کیوں نہ ہو۔''

تشریح: یہ جو فرمایا کہ کسی مسلمان کا حق مارلے تو مسلمان کی قید اس لیے لگائی کہ مسلم سوسائٹی میں اس طرح کے معاملات اکثر مسلمانوں ہی کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ ورنہ مسلمان ہی کا نہیں بل کہ غیر مسلم کا مال بھی ہڑپ کرنا جائز اور درست نہیں ہوسکتا۔

قسم کھا کر کسی کا حق مارنا اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ نہ تو حق مارنے والے کو خدا کی عظمت کا پاس ولحاظ ہے اور نہ وہ اپنے بھائی کے ساتھ انصاف کرنا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے شخص کا کوئی کردار نہیں۔ اور ہم جانتے ہیں کہ آدمی کا اپنا کردار ہی ہے جو اسے جنت کا مستحق بناتا ہے۔

اس حدیث سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ یہ جاننے کے لیے کہ کوئی آدمی کردار کے لحاظ سے کیا ہے۔ اس کے لیے کسی غیر معمولی واقعہ کا انتظار نہیں کرنا ہوتا بل کہ کسی معمولی چیز سے بھی آدمی کا کردار پرکھا جاسکتا ہے۔ پیلو کی معمولی مسواک کے سلسلہ میں اس نے بھائی کی حق تلفی کی۔ بہ ظاہر اس نے اپنے بھائی کو کوئی بہت بڑا نقصان نہیں پہنچایا لیکن اس نے اپنے اس طرزِ عمل

سے اپنے بارے میں جو خبر دی وہ معمولی ہرگز نہیں ہے۔ اس نے اپنے طرزِ عمل سے یہ ثابت کر دیا کہ وہ بے کردار اور بے ظرف ہے۔

﴿۲﴾ وَ عَنْ اَبِیْ ذَرٍّؓ عَنِ النَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: ثَلٰثَۃٌ لَّا یُکَلِّمُھُمُ اللّٰہُ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ وَلَا یَنْظُرُ اِلَیْھِمْ وَلَا یُزَکِّیْھِمْ وَلَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ۔ قَالَ اَبُوْ ذَرٍّؓ: خَابُوْا وَ خَسِرُوْا، مَنْ ھُمْ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ؟ قَالَ: اَلْمُسْبِلُ وَالْمَنَّانُ وَالْمُنَفِّقُ سِلْعَتَہٗ بِالْحَلْفِ الْکَاذِبِ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’تین آدمی ایسے ہیں کہ قیامت کے روز خدا نہ ان سے ہم کلام ہوگا نہ ان پر عنایت کی نظر فرمائے گا اور نہ ان کا تزکیہ فرمائے گا۔ اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔‘‘ حضرت ابوذرؓ نے عرض کیا کہ یہ لوگ تو نامراد ہوئے اور ٹوٹے میں پڑے۔ یارسول اللہ، یہ کون ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: ’’اپنا تہ بند حد سے نیچے لٹکانے والا اور احسان جتانے والا اور جھوٹی قسمیں کھا کر اپنا سودا چلانے والا۔‘‘

تشریح: تہ بند حد سے نیچے لٹکانا کبر کی علامت ہے۔ اس لیے تہ بند کو حد سے نیچے لٹکانے والے کو نامراد کہا اس حدیث سے معلوم ہوا کہ قیامت کے روز جو اہلِ ایمان کی آرزوؤں اور امیدوں کا دن ہے، اس روز خدا ایسے لوگوں سے بے زار ہوگا، نہ تو انھیں خدا سے ہم کلامی کا شرف حاصل ہوگا، نہ خدا ان پر عنایت کی نظر ڈالے گا اور نہ ان کی شخصیت کو نکھار بخشے گا جو متکبر اور کم ظرف قسم کے لوگ ہیں جنھیں جھوٹی قسمیں کھا کر اپنا سودا چلانے میں بھی کوئی باک نہیں ہوتا۔

﴿۳﴾ عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم مَنْ حَلَفَ عَلٰی یَمِیْنِ صَبْرٍ وَّ ھُوَ فِیْھَا فَاجِرٌ یَّقْتَطِعُ بِھَا مَالَ امْرِیءٍ مُّسْلِمٍ لَقِیَ اللّٰہَ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ وَ ھُوَ عَلَیْہِ غَضْبَانُ۔ (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’جو شخص حاکم کے حکم سے قسم کھائے اور وہ اپنی قسم میں جھوٹا ہو اور مقصد اس کا کسی مسلمان شخص کا مال مار لینا ہو تو وہ قیامت کے روز اللہ سے اس حال میں ملاقات کرے گا کہ اللہ اس پر غضب ناک ہوگا۔‘‘

تشریح: دنیا میں تو کوئی شخص جھوٹی قسمیں کھا کر حاکم کو دھوکا دے سکتا ہے لیکن احکم الحاکمین خدا کو کیسے دھوکا دے سکے گا جس سے بڑھ کر حقیقت حال سے دوسرا کوئی باخبر نہیں ہوسکتا۔ قیامت

کے دن جو خدا سے ملاقات کا دن ہے، ایسا شخص خدا کو اپنے سے راضی اور خوش نہیں پائے گا۔ اس دن خدا کا غضب ہی اس کے حصہ میں آئے گا۔

﴿۴﴾ وَ عَنِ الْاَشْعَثِ بْنِ قَیْسٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: لَا یَقْتَطِعُ اَحَدٌ مَالاً بِیَمِیْنٍ اِلَّا لَقِیَ اللّٰهَ وَ هُوَ اَجْذَمُ۔ (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت اشعث بن قیسؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خداؐ نے فرمایا: ''جو کوئی قسم کھا کر (کسی کا) مال مارلے گا وہ خدا کے روبرو کوڑھی ہو کر پیش ہوگا۔''

تشریح: خدا کے پاک نام کو ناپاک مقصد کے لیے استعمال کرنا ایک ایسا جرم ہے جس کی جتنی بھی سخت سزا دی جائے مبنی بر عدل ہے۔ کوڑھ سے ہر ایک کو فطری طور سے نفرت ہوتی ہے۔ بدکردار شخص کا وجود حقیقت میں سراپا کوڑھ ہوتا ہے۔ ایسے شخص کا وجود قابلِ نفریں ہی ہوسکتا ہے۔ قیامت کے روز یہ حقیقت مبرہن ہو کر رہے گی۔

جھوٹی شہادت

﴿۱﴾ عَنْ خُرَیْمِ بْنِ فَاتِکٍ قَالَ: صَلّٰی رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ صَلٰوةَ الصُّبْحِ فَلَمَّا انْصَرَفَ قَامَ قَائِمًا، فَقَالَ: عُدِلَتْ شَهَادَةُ الزُّوْرِ بِالْاِشْرَاکِ بِاللّٰهِ ثَلٰثَ مَرَّاتٍ ثُمَّ قَرَأَ: فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ ط حُنَفَآءَ لِلّٰهِ غَیْرَ مُشْرِکِیْنَ بِهٖ۔ (ابوداؤد)

ترجمہ: خریم بن فاتکؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک دن صبح کی نماز ادا کی۔ پھر جب آپؐ اس سے فارغ ہوئے تو کھڑے ہوگئے اور ارشاد فرمایا: ''جھوٹی شہادت اللہ کے ساتھ شرک کرنے کے برابر ہے۔'' یہ بات آپؐ نے تین بار فرمائی۔ پھر آپؐ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِo حُنَفَآءَ لِلّٰهِ غَیْرَ مُشْرِکِیْنَ بِهٖ ط (الحج: ۳۰-۳۱) (پس بتوں کی گندگی سے بچو اور بچو جھوٹی بات سے، اس طور پر کہ اللہ ہی کی طرف کے ہو کر رہو، اس کے ساتھ شریک نہ ٹھہراؤ۔)

تشریح: اس حدیث میں نبی (ﷺ) نے جھوٹی گواہی کو شرک باللہ کے مساوی قرار دیا ہے۔ اور تاکیداً آپ ﷺ نے اپنی بات کو تین بار دہرایا۔ اور پھر اپنی بات کی تصدیق میں سورہ الحج

کی آیت کی تلاوت کی جس میں جھوٹ بولنے کا ذکر شرک و بت پرستی کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اور دونوں سے بچنے کی تاکید ایک ہی لفظ (اِجتَنِبُوْا) سے کی گئی ہے۔ اس سے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے استدلال فرمایا کہ جھوٹی گواہی اپنی گندگی اور خدا کی ناراضی کا باعث ہونے کے لحاظ سے شرک جیسا گناہ ہے۔ جھوٹی گواہی تو جھوٹی ہوتی ہی ہے، شرک بھی جھوٹ اور باطل ہوتا ہے دونوں میں نوعیت کے لحاظ سے بڑی یگانگت (Familiarity) پائی جاتی ہے۔

جامع ترمذی کی ایک روایت میں جھوٹی گواہی کو کبائر یعنی بڑے گناہوں میں شمار کیا گیا ہے۔ ایک روز صحابہؓ سے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے تین دفعہ فرمایا: ''کیا میں تمھیں بتاؤں کہ سب سے بڑے گناہ کون کون سے ہیں؟'' پھر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: ''اللہ کے ساتھ شریک کرنا، والدین کی نافرمانی اور معاملات میں جھوٹی گواہی دینا اور جھوٹ بولنا۔''

افسوس کہ آج جھوٹی شہادت کو بالعموم لوگوں نے ایک ''فن'' سمجھ لیا ہے۔ ان کی نگاہ میں یہ سرے سے کوئی سنگین گناہ ہی نہیں ہے۔

﴿۲﴾ وَ عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍؓ عَنِ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: اَكْبَرُ الْكَبَآئِرِ الْاِشْرَاكُ بِاللّٰهِ وَ قَتْلُ النَّفْسِ وَ عُقُوْقُ الْوَالِدَيْنِ وَ قَوْلُ الزُّوْرِ اَوْ قَالَ: شَهَادَةُ الزُّوْرِ۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت انس مالکؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''سب سے بڑے گناہ ہیں: اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا، جان کو (ناحق) قتل کرنا، والدین کی نافرمانی اور جھوٹ بولنا۔'' یا فرمایا: ''جھوٹی گواہی دینا۔''

مجرم کی سفارش

﴿۱﴾ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرؓ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم يَقُوْلُ: مَنْ حَالَتْ شَفَاعَتُهٗ دُوْنَ حَدٍّ مِّنْ حُدُوْدِ اللّٰهِ فَقَدْ ضَادَّ اللّٰهَ وَ مَنْ خَاصَمَ فِيْ بَاطِلٍ وَّ هُوَ يَعْلَمُهٗ لَمْ يَزَلْ فِيْ سَخَطِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْزِعَ۔ وَ مَنْ قَالَ فِيْ مُؤْمِنٍ مَّا لَيْسَ فِيْهِ، اَسْكَنَهُ اللّٰهُ رَدْغَةَ الْخَبَالِ حَتّٰى يَخْرُجَ مِمَّا قَالَ۔ رَوَاهُ اَحْمَدُ، وَ اَبُوْ دَاوٗدُ، وَ فِيْ رِوَايَةٍ لِلْبَيْهَقِيْ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ: "مَنْ اَعَانَ عَلٰى خُصُوْمَةٍ لَا يَدْرِيْ اَحَقٌّ اَمْ بَاطِلٌ فَهُوَ فِيْ سَخَطِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْزِعَ۔ (احمد، ابوداؤد، البیہقی فی شعب الایمان)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ ''جس کسی کی سفارش اللہ کی حدود میں سے کسی حد کے درمیان حائل ہو اس نے اللہ کی مخالفت کی، اور جو شخص جانتے بوجھتے ناحق بات میں جھگڑے وہ ہمیشہ خدا کے غضب میں رہتا ہے جب تک کہ اس سے باز نہ آجائے۔ اور جس کسی نے کسی مومن کے بارے میں ایسی بات کہی جو اس میں پائی نہ جائے تو اللہ اس وقت تک اسے دوزخیوں کے کیچڑ، پیپ اور لہو میں رکھے گا جب تک کہ وہ اپنی کہی ہوئی بات سے نکل نہ آئے۔'' اسے احمد اور ابو داؤد نے روایت کیا ہے۔ بیہقی نے شعب الایمان میں یہ الفاظ بھی نقل کیے ہیں: ''جو شخص کسی ایسے جھگڑے میں تعاون کرے جس کے حق یا ناحق ہونے کا اس کو علم نہیں، وہ اس وقت تک غضب خداوندی میں گرفتار رہے گا جب تک وہ اس سے باز نہ آجائے۔''

تشریح: جو شخص اپنی سفارش کے ذریعہ سے حاکم کو نفاذ حد سے روکے اس نے خدا کی مخالفت کی، اسی طرح وہ شخص بھی جو یہ جاننے کے باوجود کہ وہ جس بات کے لیے جھگڑ رہا ہے وہ ناحق اور غلط ہے، جھگڑنے سے باز نہ آئے، خدا کے غضب کا مستحق ہوتا ہے۔

کسی مومن کو کوئی عیب لگائے اور اس کی طرف کوئی غلط بات منسوب کر کے اس کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرے حالاں کہ وہ مومن اس عیب سے پاک ہے اور جو بات وہ اس سے منسوب کرتا ہے، فی الواقع وہ بات اس مومن کے اندر نہیں پائی جاتی۔ وہ جو کچھ اس کے بارے میں کہتا ہے، اتہام محض ہے۔ اور اتہام کی سزا دوزخیوں کے کیچڑ، پیپ اور لہو میں پڑنا ہے۔

متن میں لفظ خبال آیا ہے۔ خبال اصل میں فساد کو کہتے ہیں۔ خواہ یہ فساد اعمال و افعال میں واقع ہو یا عقل اور جسم میں۔ یہاں اس سے مراد اہل دوزخ کا خون اور پیپ وغیرہ گندگی ہے۔

یہ حدیث بتاتی ہے کہ غلط اور بے جا سفارش شریعت کی نگاہ میں کسی جرمِ عظیم سے کم نہیں ہے۔ حدود الٰہی کے نفاذ کو روکنے کی کوشش درحقیقت خدا کی مخالفت ہے۔ خدا کی مخالفت کرنے والا لازماً غضب الٰہی کا شکار ہوتا ہے۔ اس کے لیے غضب خداوندی سے بچنے کی ایک ہی صورت ہے کہ وہ توبہ کرے، اور بے جا سفارش سے باز آجائے۔ ایک روایت میں ہے کہ حضور ﷺ نے ایک مخزومی عورت کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا جس نے چوری کی تھی۔ صحابہؓ کے کہنے سے جب حضرت اسامہؓ نے حضور ﷺ سے سفارش کے لیے گفتگو کی تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم خدا کی حدود میں

سے ایک حد کے بارے میں سفارش کر رہے ہو؟'' آپ ﷺ کھڑے ہوئے اور خطبہ دیا جس میں آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم سے پہلے کے لوگوں کو اسی چیز نے ہلاک کیا کہ ان میں کوئی شریف (بااثر) چوری کرتا تو اسے چھوڑ دیتے تھے اور اگر کوئی کم زور چوری کا مرتکب ہوتا تو اس پر حد قایم کرتے (اسے سزا دیتے)۔ بہ خدا، اگر فاطمہ بنت محمد ﷺ بھی چوری کرتی تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹ دیتا (وَايْمُ اللّٰهِ، لَوْ اَنَّ فَاطِمَةَ بِنْتَ مُحَمَّدٍ سَرَقَتْ لَقَطَعْتُ يَدَهَا)۔'' (بخاری، مسلم)

مجرم کی سفارش کی طرح باطل کی وکالت کرنی بھی اپنے لیے غضب الٰہی کو دعوت دینا ہے۔ اس جرم کا مرتکب بھی جب تک اپنی روش سے باز نہیں آتا خدا کا غضب اس پر بھڑکتا ہی رہتا ہے۔ کسی بے قصور مومن پر اتہام بھی خدا کی نگاہ میں نہایت سنگین قسم کا جرم ہے۔ ایسا شخص جو کسی بے قصور مسلم و مومن کی عزت سے کھیلتا ہے اور اس کی طرف غلط باتیں منسوب کرتا ہے وہ درحقیقت اپنی حالت دوزخیوں کی سی بنالیتا ہے۔ اس کا یہ طرزِ عمل نہایت ناعاقبت اندیشی کا ہوتا ہے۔ وہ دیکھنے میں خواہ کتنا ہی صاف اور ستھرا دکھائی دے لیکن فی الواقع وہ کیچڑ، پیپ اور خون کی گندگی میں گرا ہوا ہوتا ہے۔ اور اگر وہ توبہ کر کے اپنی اصلاح نہیں کر لیتا تو کوئی بھی چیز اسے اس کے انجام بد سے نہیں بچا سکتی۔

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی ایسے جھگڑے اور خصومت میں حصہ لینا اور اس میں معاونت کرنی جس کے حق و ناحق ہونے کے بارے میں آدمی کو کچھ بھی پتہ نہ ہو، ایک ایسا غیر منصفانہ طرزِ عمل ہے جس کے نتیجہ میں خدا کے غضب کے سوا کوئی دوسری چیز اپنے حصے میں نہیں آسکتی اس لیے آدمی کو خواہ معاملہ کوئی بھی ہو، وہ طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیے جو خدا کی رضا کا موجب ہو، اس کے غضب کا موجب نہ ہو۔

قتل

(۱) عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَؓ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: لَا تَرْجِعُوْا بَعْدِيْ كُفَّارًا يَّضْرِبُ بَعْضُكُمْ رِقَابَ بَعْضٍ۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''میرے بعد کافر نہ ہو جانا کہ تم آپس میں ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو۔''

تشریح: یعنی میرے بعد کہیں ایسا نہ ہو کہ تم لوگ آپس میں لڑنے لگ جاؤ اور نفرت یہاں تک پہنچ جائے کہ ایک دوسرے کی گردن مارنے میں بھی تمھیں کوئی تامل اور جھجک نہ ہو۔ تم اگر آپس میں ایک دوسرے پر تلوار اٹھاؤ گے تو تمھارا یہ طرزِ عمل اسلام کے خلاف ہوگا۔ تمھاری روش کفرو ناشکری کی ہوگی۔ اور یہ تو نہایت ہی سنگین بات ہوگی اگر تم ایک دوسرے کو کافر قرار دے کر باہم ایک دوسرے کے خلاف صف بستہ ہونے لگو۔

﴿۲﴾ وَ عَنْ عَبْدِ اللّٰہِؓ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ: مَنْ حَمَلَ عَلَیْنَا السَّلَاحَ فَلَیْسَ مِنَّا۔

(بخاری)

ترجمہ: حضرت عبداللہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ”جس نے ہم پر ہتھیار اٹھایا، وہ ہم میں سے نہیں ہے۔“

تشریح: یعنی اس کا ہم سے کوئی تعلق نہیں۔ میں اس سے اور اس کی اس حرکت سے سخت بے زار ہوں۔ مسلمانوں پر ہتھیار اٹھانے والوں کو اس کی خبر ہونی چاہیے کہ ان کا یہ رویہ اسلامی معاشرہ کی سلامتی اور اس کے امن کے لیے غارت گر ثابت ہوسکتا ہے۔ اس لیے انھیں اس طرح کے اقدام سے پہلے اس کے افسوس ناک نتائج پر بھی نگاہ رکھنی چاہیے۔

﴿۳﴾ وَ عَنْ اَبِیْ بَکْرَۃَؓ قَالَ: اِنِّیْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ یَقُوْلُ: اِذَا الْتَقَی الْمُسْلِمَانِ بِسَیْفِهِمَا فَالْقَاتِلُ وَالْمَقْتُوْلُ فِی النَّارِ۔ قُلْتُ: یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ هٰذَا الْقَاتِلُ، فَمَا بَالُ الْمَقْتُوْلِ؟ قَالَ: اِنَّہٗ کَانَ حَرِیْصًا عَلٰی قَتْلِ صَاحِبِہٖ۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت ابوبکرہؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ”جب دو مسلمان اپنی تلواریں لے کر ایک دوسرے کے مقابل ہوں تو قاتل اور مقتول دونوں ہی جہنم میں ہوں گے۔“ میں نے عرض کیا کہ ایک تو خیر قاتل ہے لیکن مقتول کیوں (دوزخ میں جائے گا)؟ فرمایا: ”اس لیے کہ وہ بھی اپنے ساتھی کے قتل کا حریص تھا۔“

تشریح: یعنی مقتول گرچہ اپنے مقصد میں کام یاب نہیں ہوسکا۔ لیکن ارادہ اور خواہش تو اس کی بھی یہی تھی کہ وہ اپنے بھائی کو موت کے گھاٹ اتار دے۔ خدا کے یہاں اصلاً آدمی کے ارادے اور اس کی نیت اور اس کے اصل جذبہ کو دیکھا جاتا ہے اور پھر اسی کے مطابق اس کے حق میں فیصلہ کیا جاتا ہے۔

﴿۴﴾ وَ عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ قَالَ: قَالَ النَّبِیُّ صلی اللہ علیہ وسلم: اَوَّلُ مَا یُقْضٰی بَیْنَ النَّاسِ فِی الدِّمَآءِ۔ (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت عبداللہ (بن مسعودؓ) سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''(قیامت کے روز) سب سے پہلے لوگوں کے ان مقدمات کا فیصلہ کیا جائے گا جو قتل سے متعلق ہوں گے۔''

تشریح: خون کا معاملہ چوں کہ نہایت سنگین ہے اس لیے فیصلے کے لیے سب سے پہلے خون کے مقدمات ہی پیش ہوں گے۔ ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے قیامت کے روز نماز کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ درحقیقت ان دونوں حدیثوں میں کوئی تضاد نہیں پایا جاتا ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ حقوق اللہ کے ادا کرنے کے سلسلہ میں سب سے پہلے جس چیز کے بارے میں سوال ہوگا وہ نماز ہے۔ اس لیے کہ حقوق اللہ میں سب سے بنیادی اور اہم نماز ہی ہے۔ حقوق العباد یعنی بندگانِ خدا کے جو حقوق ہم پر عائد ہوتے ہیں ان میں سب سے مقدم یہ ہے کہ ہم ان کے خیر خواہ ہوں۔ اب اگر کوئی کسی شخص کو ظلماً قتل کرتا ہے تو اس کے بارے میں اس کے سوا اور کیا کہا جائے کہ وہ اتنا بڑا ظالم ہے کہ بندگانِ خدا کے دوسرے حقوق تو وہ کیا ادا کرتا، اسے تو دوسرے کا وجود بھی گوارا نہ ہوا۔ انسان کے سارے حقوق اس کے وجود و بقا سے تعلق رکھتے ہیں۔ قتلِ ناحق سے آدمی کے سارے ہی حقوق کی نفی ہو جاتی ہے۔ علاوہ اس کے، انسان کے سارے معاملات اور اس کے اعمال کا تعلق اس کی زندگی سے ہوتا ہے۔ زندگی کا خاتمہ کر دینے سے اعمال کے سارے سلسلے منقطع ہو جاتے ہیں قتل کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آدمی کی ساری دوڑ دھوپ اور اس کی سرگرمیوں کا خاتمہ کر دیا جائے۔ اس لیے قتلِ ناحق ایک سنگین جرم ثابت ہوتا ہے کہ حقوق العباد کے سلسلہ میں سب سے پہلے اس کے بارے میں باز پرس ہونی چاہیے۔

﴿۵﴾ وَ عَنِ الْبَرَآءِ بْنِ عَازِبٍ اَنَّ النَّبِیَّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: لَزَوَالُ الدُّنْیَا اَھْوَنُ عَلَی اللّٰہِ مِنْ قَتْلِ رَجُلٍ مُّسْلِمٍ۔ (ابن ماجہ)

ترجمہ: حضرت براء بن عازبؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ساری دنیا کی تباہی اللہ کے نزدیک ایک مسلم شخص کے قتل کے بالمقابل ہلکی ہے۔''

تشریح: پوری کائنات خدا کی وحدت اور اس کی حاکمیت و ربوبیت پر گواہ ہے۔ درحقیقت کائنات کی تخلیق اس لیے ہوئی ہے کہ لوگ خدا کی ربوبیت پر ایمان لا کر اس کی اطاعت و بندگی

اختیار کریں۔ یہ چیز اگر پیش نظر رہے تو اس بات کے سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں پیش آسکتی کہ کسی بندۂ مومن و مسلم کا قتل حقیقت میں تخلیق کائنات کی اصل غرض و غایت کے خلاف ایک اقدام ہے۔ یہ ایک ایسا جرم ہے جس کی قباحت اور سنگینی کا اظہار اس سے بہتر صورت میں ممکن نہیں جس صورت میں اس کا اظہار اس حدیث میں فرمایا گیا۔

﴿۶﴾ وَ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَؓ قَالَ: قَالَ النَّبِیُّ ﷺ: وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ، لَیَاتِیَنَّ عَلَی النَّاسِ زَمَانٌ لاَ یَدْرِی الْقَاتِلُ فِیْ اَیِّ شَیْءٍ قَتَلَ وَلاَ یَدْرِی الْمَقْتُوْلُ فِیْ اَیِّ شَیْءٍ قُتِلَ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے، لوگوں پر ایک ایسا زمانہ آئے گا کہ نہ قاتل کو معلوم ہوگا کہ اس نے کیوں قتل کیا اور نہ مقتول کو خبر ہوگی کہ وہ کیوں قتل کیا گیا۔''

تشریح: یعنی ایسا فساد اور بگاڑ رونما ہوگا کہ اندھادھند قتل کے واقعات پیش آئیں گے۔ خون ناحق ایک عام بات ہوجائے گی۔ انسانوں کا خون اتنا ارزاں ہوجائے گا کہ قتل و خوں ریزی کے واقعات پر کسی کو کوئی حیرت نہ ہوگی۔

﴿۷﴾ وَ عَنْ اَبِیْ مُوْسیٰؓ قَالَ: قَالَ النَّبِیُّ ﷺ اِنَّ بَیْنَ یَدِیِ السَّاعَةِ اَیَّامًا یُّرْفَعُ فِیْهَا الْعِلْمُ وَ یَنْزِلُ الْجَهْلُ وَ یَكْثُرُ فِیْهَا الْهَرْجُ وَالْهَرْجُ: اَلْقَتْلُ۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت ابوموسیٰؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''قیامت سے کچھ ایام پہلے علم اٹھالیا جائے گا اور جہل پھیل جائے گا اور ہرج کی کثرت ہوجائے گی۔'' اور ہرج سے مراد قتل ہے۔

تشریح: یعنی بدترین قسم کے لوگ زمین پر رہ جائیں گے۔ آسمان کے نیچے جن کی حیثیت بدنما داغ سے زیادہ نہ ہوگی۔ جہل و ظلم کا دور دورہ ہوگا۔ پھر قیامت کے برپا ہونے میں کوئی زیادہ تاخیر نہ ہوگی۔

﴿۸﴾ وَ عَنِ ابْنِ عُمَرَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: لَنْ یَّزَالَ الْمُؤْمِنُ فِیْ فُسْحَةٍ مِّنْ دِیْنِهٖ مَالَمْ یُصِبْ دَمًا حَرَامًا۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ”جب تک کہ کوئی مومن خونِ حرام (قتل ناحق) کا مرتکب نہ ہو، وہ ہمیشہ اپنے دین کی وسعت و کشادگی میں رہتا ہے۔“

تشریح: دینِ حق تو اترا ہی اس لیے ہے کہ لوگوں کے لیے کشادگی کا سامان کیا جائے اور ان کو ان جکڑ بندیوں اور تنگیوں سے نجات دلائی جائے جن میں چالاک قسم کے لوگ بالعموم عوام کو مبتلا رکھتے ہیں۔ دینِ حق کا پیرو درحقیقت خدا کے کشادہ دامنِ عاطفت میں ہوتا ہے۔ اس پر خدا کی خاص عنایتیں اور رحمتیں ہوتی ہیں۔ وہ اچھی امیدوں اور اچھی توقعات کے سہارے زندگی گزارتا ہے۔ لیکن جیسے کوئی شخص غلط اقدام کرتا ہے اور خاص طور سے جب وہ قتل ناحق کا مرتکب ہوتا ہے تو پھر اس مذموم ترین فعل کے نتیجہ میں اس پر تنگی مسلط ہو جاتی ہے۔ ہر طرف سے وہ خطروں اور اندیشوں میں گرفتار دکھائی دیتا ہے۔ اس طرح وہ اس سزا کا مستحق قرار پاتا ہے جو شریعت نے قتل کے لیے مقرر کی ہے۔ وہ اپنی پوزیشن اتنی خراب کر لیتا ہے کہ وہ ان لوگوں کے زمرہ میں شامل نظر آتا ہے جو رحمتِ حق سے محروم اور مایوس ہوتے ہیں۔

چوری

〈۱〉 عَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِؓ قَالَ: بَايَعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فِیْ رَهْطٍ فَقَالَ: اُبَايِعُكُمْ عَلٰی اَنْ لَّا تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ شَيْئًا وَّلَا تَسْرِقُوْا وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ وَلَا تَاْتُوْا بِبُهْتَانٍ تَفْتَرُوْنَهٗ بَيْنَ اَيْدِيْكُمْ وَ اَرْجُلِكُمْ وَلَا تَعْصُوْنِیْ فِیْ مَعْرُوْفٍ فَمَنْ وَفٰی مِنْكُمْ فَاَجْرُهٗ عَلَی اللّٰهِ وَ مَنْ اَصَابَ مِنْ ذٰلِكَ شَيْئًا فَاُخِذَ بِهٖ فِی الدُّنْيَا فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ وَ طَهُوْرٌ وَّ مَنْ سَتَرَهُ اللّٰهُ فَذٰلِكَ اِلَی اللّٰهِ اِنْ شَآءَ عَذَّبَهٗ وَ اِنْ شَآءَ غَفَرَ لَهٗ۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت عبادہ بن صامتؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے ایک جماعت کے ساتھ رسول اللہ ﷺ سے بیعت کی۔ آپؐ نے فرمایا: ”میں تم سے اس پر بیعت لیتا ہوں کہ تم اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو گے اور نہ چوری کرو گے اور نہ اپنی اولاد کو قتل کرو گے اور نہ کوئی بہتان باندھو گے جسے اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے درمیان گھڑ لو۔ اور نہ معروف میں میری نافرمانی کرو گے۔ تم میں سے جس کسی نے اپنا وعدہ پورا کیا تو اس کا اجر و ثواب اللہ کے ذمہ ہے۔ اور جو

شخص ان میں سے کسی چیز کا مرتکب ہوا اور دنیا میں اسے سزا دے دی گئی تو وہ اس کے لیے کفارہ اور پاکی کا ذریعہ ہے۔ اور جس کسی کی عیب پوشی اللہ نے کی تو معاملہ اللہ کے حوالہ ہے۔ اگر چاہے تو اسے عذاب دے اور اگر چاہے تو اسے بخش دے۔"

تشریح: بے سروپا اور بے بنیاد تہمت لگانے کو اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے درمیان بہتان باندھنا کہا ہے۔

جو بیعت آپؐ نے لی وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی تعلیم کے مطابق کی۔ قرآن میں ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ عَلٰٓى اَنْ لَّا يُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْئًا وَّلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِيْنَ وَلَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَاْتِيْنَ بِبُهْتَانٍ يَّفْتَرِيْنَهٗ بَيْنَ اَيْدِيْهِنَّ وَ اَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِيْنَكَ فِيْ مَعْرُوْفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○ (الممتحنۃ: ۱۲)

"اے نبی، جب مومن عورتیں تمھارے پاس آکر تم سے اس بات پر بیعت کریں کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہیں کریں گی اور نہ چوری کریں گی، نہ زنا کریں گی، نہ اپنی اولاد کو قتل کریں گی۔ اور نہ اپنے ہاتھوں اور اپنے پیروں کے درمیان کوئی بہتان باندھیں گی اور نہ معروف میں تمھاری نافرمانی کریں گی، تو تم ان سے بیعت لے لو اور ان کے لیے اللہ سے دعائے مغفرت کرو، یقیناً اللہ بہت مغفرت فرمانے والا، نہایت رحم والا ہے۔"

گناہ کی جو سزا دنیا میں کسی کو دی گئی اس سے اس کا گناہ معاف ہوجائے گا اور اسے پاکیزگی نصیب ہوگی۔

جس کسی کا جرم دنیا میں چھپا رہ گیا اور اسے دنیا میں اپنے جرم کی سزا نہیں ملی تو کسی کو یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ آخرت میں اسے لازماً سزا ملے گی ہی، یہ خدا کے اختیار میں ہے۔ وہ سزا بھی دے سکتا ہے اور اس کے گناہ کو معاف بھی کرسکتا ہے۔ اس کا پورا امکان ہے کہ جس شخص نے سچے دل سے توبہ کر کے دنیا میں اپنی اصلاح کر لی ہو اور خدا کا فرماں بردار بن کر دنیا سے رخصت ہوا ہو، خدا آخرت میں بھی اس کی عیب پوشی فرمائے اور اسے کوئی سزا نہ دے۔ لیکن جو شخص خدا کی عیب پوشی کے باوجود برا کا برا ہی بنا رہا، وہ خواہ دنیا میں سزا پانے سے بچ جائے لیکن آخرت میں اسے خدا کی پکڑ سے بچانے والی کوئی چیز نہ ہوگی۔

〈۲〉 وَ عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ اَنَّ النَّبِیَّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: لَا يَزْنِی الزَّانِیْ حِيْنَ يَزْنِیْ وَ هُوَ

مُؤْمِنٌ وَّلاَ يَسْرِقُ السَّارِقُ حِيْنَ يَسْرِقُ وَ هُوَ مُؤْمِنٌ وَّلاَ يَشْرَبُ الْخَمْرَ حِيْنَ يَشْرَبُهَا وَ هُوَ مُؤْمِنٌ وَّالتَّوْبَةُ مَعْرُوْضَةٌ بَعْدَ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”زنا کرنے والا جس وقت زنا کرتا ہے، وہ مومن نہیں ہوتا اور چور جس وقت چوری کرتا ہے، وہ مومن نہیں ہوتا اور شرابی جب شراب پیتا ہے تو وہ مومن نہیں ہوتا اور توبہ قبول ہوگی اس کے بعد۔“

تشریح: یعنی وہ مومنانہ خلق سے دور یا بے گانہ ہوجاتا ہے۔ اخلاقی لحاظ سے جب کوئی شخص وہ طرزِ عمل اختیار کرتا ہے جو اس کے ایمان کے تقاضوں کے منافی ہو تو اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے کہ وہ شخص ایسا مومن نہیں رہا جس کا ایمان نہاں خانۂ دل میں چھپ کر نہیں رہتا بل کہ جس کی پوری زندگی اس کے ایمان کے زیر اثر رہتی ہے اور ہر چھوٹے بڑے امر میں جس کے ایمان کے نمایاں اثرات دیکھے جاسکتے ہوں۔

اس حدیث کا یہ مطلب نہیں ہے کہ زنا، چوری اور شراب نوشی ہی ایسے گناہ ہیں جن کے ارتکاب سے آدمی مومنانہ اخلاق سے دور ہوجاتا ہے بل کہ دوسرے گناہوں کا ارتکاب بھی اسی بات کا ثبوت ہوتا ہے کہ آدمی مومنانہ وصف سے بے بہرہ ہے۔ ان تین بڑے گناہوں سے درحقیقت تمام ہی گناہوں کی، جو انسان کرسکتا ہے نمایندگی ہوتی ہے۔ زنا ان تمام گناہوں کی نمایندگی کرتا ہے جن کا تعلق خواہشات نفس سے ہوتا ہے۔ حرص وطمع کی وجہ سے آدمی جن گناہوں کا مرتکب ہوتا ہے۔ ان گناہوں کی نمایندگی چوری سے ہوتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح شراب نوشی سے ان گناہوں کی نمایندگی ہوتی ہے جو آدمی کو خدا کی یاد سے روکتے اور اس سے اسے غافل کر دیتے ہیں۔

〈۳〉 وَ عَنْ عَدِيِّ بْنِ عُمَيْرَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم: مَنِ اسْتَعْمَلْنَا مِنْكُمْ عَلٰى عَمَلٍ فَكَتَمَنَا مِخْيَطًا فَمَا فَوْقَهٗ كَانَ غُلُوْلاً يَّأْتِىْ بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت عدی بن عمیرہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جس کسی کو ہم عامل مقرر کریں اور کچھ کام لیں اور وہ ہم سے ایک سوئی یا اس سے بڑھ کر کوئی حقیر چیز چھپا رکھے تو یہ بھی چوری میں داخل ہے، وہ قیامت کے روز اس کو لیے ہوئے حاضر ہوگا۔“

تشریح: معلوم ہوا کہ سربراہ یا امیر کی اجازت کے بغیر سوئی کے برابر بھی کوئی چیز اپنے تصرف

میں لانا بھی چوری میں شامل ہے۔ قیامت کے روز ایسی چوری بھی آدمی کی رسوائی کا سبب بنے گی۔

〈۴〉 وَ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَنْ دُعِیَ فَلَمْ يُجِبْ فَقَدْ عَصَى اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ مَنْ دَخَلَ عَلٰى غَيْرِ دَعْوَةٍ دَخَلَ سَارِقًا وَ خَرَجَ مُغِيْرًا۔

(ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے: ''جس کسی کو دعوت دی جائے اور وہ اس دعوت کو قبول نہ کرے تو اس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی۔ اور جو شخص بغیر بلائے دعوت میں شریک ہو گیا تو وہ چور بن کر شریکِ دعوت ہوا اور لوٹ مار کر نکلا۔''

تشریح: بغیر کسی خاص مجبوری اور عذر کے کسی کی دعوت کو قبول نہ کرنا اسلامی مزاج کے خلاف بات ہے۔ اسلام ایک ایسے سماج کی تعمیر چاہتا ہے جس کے افراد کے مابین یگانگت اور محبت کی فضا پائی جاتی ہو اپنے بھائی کی دعوت کو رد کرنا کوئی ایسا طرزِ عمل نہیں ہے جس سے دلوں کی دوریاں کم ہوں اور اسلامی معاشرہ کے استحکام میں مدد مل سکے۔

بغیر بلائے کسی کے یہاں دعوت میں شریک ہونا نہایت گھناؤنی حرکت ہے۔ یہ بدترین قسم کی چوری اور ڈاکہ زنی ہے۔

کسی کی نقل اتارنا

وَ عَنْ عَائِشَةَؓ قَالَتْ: قَالَ النَّبِیُّ ﷺ: مَآ اُحِبُّ اَنِّیْ حَكَيْتُ اَحَدًا وَ اَنَّ لِیْ كَذَا وَ كَذَا۔

(ترمذی)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''میں اسے ہرگز پسند نہیں کرتا کہ کسی شخص کی نقل اتاروں اگرچہ میرے لیے ایسا اور ایسا ہی کیوں نہ ہو۔''

تشریح: کسی شخص کی نقل اتارنا خواہ یہ نقل قولی ہو یا فعلی، فعل حرام اور غیبت میں داخل ہے۔ آپ کا یہ ارشاد کہ کوئی خواہ کتنا ہی مجھے نوازے، مجھے یہ ہرگز گوارا نہیں ہوسکتا کہ میں کسی کے عیبوں کا اظہار کروں اس سے معلوم ہوا کہ خفیف حرکت کسی کے لیے ہرگز زیبا نہیں ہے۔ اس طرح کی حرکت آدمی کے وقار کے منافی ہے۔ اس سے اگر کسی کی پردہ دری ہوتی ہو پھر تو یہ ستم بالائے ستم

ہوگا۔ اس طرح کی حرکات سے آدمی کی خود اپنی شخصیت اس درجہ مجروح ہوتی ہے کہ اس کی تلافی کسی سیم وزر اور دنیوی منفعت کے ذریعہ سے نہیں ہوسکتی۔

تحقیق کے بغیر بات پھیلانی

(۱) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَؓ اَنَّ النَّبِیَّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: کَفٰی بِالْمَرْءِ اِثْمًا اَنْ یُّحَدِّثَ بِکُلِّ مَا سَمِعَ۔ (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”آدمی کو گناہ کے لیے یہی کافی ہے کہ جو کچھ سنے اسے بیان کرتا پھرے۔“

تشریح: تحقیق کے بغیر کسی بات کو لوگوں سے بیان کرنا اور اسے پھیلانی بھی جھوٹ کی اشاعت ہے۔ اور جھوٹ کے گناہ ہونے میں کسے شبہ ہوسکتا ہے۔ اسی لیے حدیث میں کہا گیا: ”آدمی کو جھوٹ کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ جو کچھ سنے، اسے بیان کرتا پھرے۔“

بعض اوقات تحقیق کے بغیر بات پھیلانے کا انجام نہایت افسوس ناک صورت میں سامنے آتا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ کتنے ہی فتنہ وفساد محض افواہوں کی وجہ سے برپا ہوجاتے ہیں۔ کتنی ہی معصوم جانوں کی ہلاکت کے پیچھے محض افواہیں کام کررہی ہوتی ہیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ بے بنیاد افواہوں اور غلط خبروں کے سبب سے فضا میں کشیدگی پیدا ہوجاتی ہے جس کا انجام خوں ریزی اور تباہی وبربادی کے سوا کچھ اور نہیں ہوتا۔

بدنگاہی

(۱) عَنْ بُرَیْدَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ: یَا عَلِیُّ، لَا تُتْبِعِ النَّظْرَةَ النَّظْرَةَ، فَاِنَّمَا لَکَ الْاُوْلٰی وَ لَیْسَتْ لَکَ الْاٰخِرَةُ۔ (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت بریدہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اے علی، (کسی اجنبی عورت پر) دوبارہ نظر نہ ڈالنا، پہلی نگاہ تو تمھاری ہے، دوسری تمھاری نہیں ہے۔“

تشریح: یعنی پہلی نگاہ معاف ہے۔ کیوں کہ اس میں تمھارے قصد اور ارادے کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ لیکن دوبارہ نگاہ ڈالنا، تمھارے لیے درست نہیں ہے۔ یہ دوسری نگاہ تمھاری نہیں شیطان کی

ہوگی۔ اس کے پیچھے نفسانی خواہش شامل ہو جائے گی۔ کسی پرائی عورت کے حسن و جمال پر نگاہ ڈالنا اور اس سے حظ حاصل کرنا نہایت نازک معاملہ ہے۔ وہ عورت تمھارے لیے نہیں اپنے شوہر کے لیے ہے۔ پرائی چیز سے حظ حاصل کرنا نہ صرف یہ کہ ایک قسم کی چوری اور خیانت ہے بل کہ اس کی سزا بالعموم آدمی کو دنیا ہی میں مل جاتی ہے۔ اس حرکتِ بے جا سے دل کی پاکیزگی باقی نہیں رہتی۔ اور اس کا قوی امکان پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ کسی فتنے میں مبتلا ہو کر اپنی عزت و عافیت دونوں گنوا بیٹھے۔

﴿۲﴾ وَ عَنْ جَرِيْرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِؓ قَالَ: سَاَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ عَنْ نَظَرِ الْفُجَآءَ ةِ فَقَالَ: اِصْرِفْ بَصَرَكَ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت جریر بن عبداللہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے (اجنبی عورت پر) اچانک نگاہ پڑ جانے کے بارے میں دریافت کیا، تو آپؐ نے فرمایا: ’’تم اپنی نگاہ پھیر لو۔‘‘

تشریح: یعنی نگاہ جمائے نہ رہو بل کہ فوراً اس کی طرف سے اپنی نگاہ ہٹا لو۔

رشوت

﴿۱﴾ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍوؓ قَالَ: لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ الرَّاشِيْ وَالْمُرْتَشِيْ۔

(ابوداؤد، ابن ماجہ، ترمذی)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمروؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے رشوت دینے والے اور رشوت لینے والے، دونوں پر لعنت کی ہے۔‘‘

تشریح: بیہقی نے شعب الایمان میں یہ روایت حضرت ثوبانؓ سے نقل کی ہے اور اس میں لفظ رائش بھی آیا ہے۔ یعنی آپ ﷺ نے اس شخص پر بھی لعنت فرمائی ہے جو رشوت دینے اور لینے والے کے درمیان واسطہ یا ذریعہ بنتا ہو۔

جس کسی پر خدا کے رسول ﷺ نے لعنت کی ہو، اس کی بدنصیبی میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔ ایسے شخص پر خدا کی پھٹکار پڑے گی اور وہ خدا کی رحمتوں سے محروم ہوگا۔ الا یہ کہ وہ تائب ہو کر اپنی اصلاح کر لے۔

﴿۲﴾ وَ عَنْ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِؓ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: مَا مِنْ قَوْمٍ

يَّظْهَرُ فِيهِمُ الزِّنَا اِلَّآ اُخِذُوْا بِالسَّنَةِ وَمَا مِنْ قَوْمٍ يَّظْهَرُ فِيهِمُ الرَّشَا اِلَّآ اُخِذُوْا بِالرُّعْبِ۔ (احمد)

ترجمہ: حضرت عمرو بن عاصؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ''جس کسی قوم میں زنا کی کثرت ہوجاتی ہے، لازماً وہ قحط سالی میں گرفتار ہوجاتی ہے۔ اور جس کسی قوم میں رشوت عام ہوجاتی ہے لازماً اس پر رُعب (خوف و دہشت) طاری ہوجاتی ہے۔''

تشریح: زنا اور رشوت خوری قانونی جرم کے علاوہ اخلاقی لحاظ سے ایسے گھناؤنے قسم کے گناہ اور بدترین فعل ہیں کہ آخرت کی سزا کے علاوہ دنیا میں بھی ان کے وبال مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتے ہیں۔ چناں چہ اس حدیث میں رشوت کی ایک نحوست یہ بیان فرمائی گئی ہے کہ اس کے عام ہونے کی صورت میں قوم پر خوف اور دہشت مسلط ہوکر رہتی ہے۔ رشوت دینے اور لینے والی قوم میں ایسے بزدلانہ خصائص پیدا ہوجاتے ہیں کہ اس میں شجاعت، جرأت، بلند حوصلگی، مردانگی وغیرہ اخلاقی اوصاف باقی نہیں رہتے۔ پھر یہ قوم اپنے لوگوں سے بھی خائف رہتی ہے اور غیروں کی ہیبت بھی اس پر چھا جاتی ہے۔ رشوت خور حکام اپنے فرائض منصبی ادا کرنے میں ہمیشہ کوتاہ واقع ہوتے ہیں۔ ان کے اس مجرمانہ طرزِ عمل کی وجہ سے شیوۂ مردانگی کی توقع ان سے نہیں کی جاسکتی۔ ضمیر اور انصاف پسندی کی دولت سے محروم شخص کے اندر وہ توانائی اور قوت کہاں سے آسکتی ہے جس کی وجہ سے اسے اپنی عظمت و وقار اور کردار کا پاس و لحاظ ہوسکتا۔ ایسے لوگ خود ذلت کی زندگی گزارتے ہیں اور اپنی قوم کو بھی ذلت میں مبتلا رکھتے ہیں۔ اسے فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ جو قوم ایثار و قربانی کے جذبہ سے عاری ہوچکی ہو اس کے لیے خوف، پستی اور ذلت مقدر ہے۔

حق تلفی

﴿۱﴾ عَنْ عَلِيٍّؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم: اِيَّاكَ وَ دَعْوَةَ الْمَظْلُوْمِ فَاِنَّمَا يَسْأَلُ اللّٰهَ تَعَالٰى حَقَّهٗ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَمْنَعُ ذَا حَقٍّ حَقَّهٗ۔ (بیہقی فی شعب الایمان)

ترجمہ: حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''مظلوم کی فریاد اور

پکار سے بچتے رہو، کیوں کہ وہ اللہ تعالیٰ سے صرف اپنا حق مانگتا ہے اور اللہ کسی حق دار کو اس کے اپنے حق سے باز نہیں رکھتا۔"

تشریح: ظلم و ستم کسی طرح جائز نہیں اسی لیے فرمایا کہ کسی پر ظلم نہ کرو کہ وہ خدا سے فریاد کرنے پر مجبور ہو جائے۔ اور تمھارے حق میں بد دعا کرے۔

خدا کسی کا حق نہیں روکتا۔ مظلوم کی فریاد بے معنی اور بے محل نہیں ہوتی۔ اس لیے خدا کے غضب اور اس کی گرفت سے بچو اور ظلم اور کسی کی حق تلفی سے ہمیشہ اپنے آپ کو دور رکھو۔

چیرہ دستی

⟨۱⟩ عَنْ وَائِلِ بْنِ حُجْرٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَنِ اقْتَطَعَ اَرْضًا ظَالِمًا لَقِيَ اللّٰهَ وَ هُوَ غَضْبَانُ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت وائل بن حجرؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: "جو شخص کسی کی زمین ظالم بن کر چھین لے گا وہ (قیامت کے روز) اللہ سے اس حال میں ملے گا کہ اللہ اس پر سخت غضب ناک ہوگا۔"

تشریح: یعنی کوئی یہ نہ سمجھے کہ ظالمانہ طور پر اگر وہ کسی شخص کی زمین یا اور کوئی چیز غصب کر لیتا ہے تو وہ اپنے حق میں اچھا کرتا ہے۔ کسی کی چیز خواہ اس کے قبضے میں آگئی ہو لیکن اس نے اپنی اس حرکت سے خدا اور اس کی رحمتوں سے اپنے آپ کو محروم کر لیا۔ اگر آج نہیں تو قیامت کے روز اسے بہ خوبی معلوم ہو جائے گا کہ حقیقت میں اس نے کیا کھویا ہے اور کیا پایا ہے۔ منزل پر پہنچنے کے بعد وہ دیکھے گا کہ خدا کی نوازشوں اور اس کی رحمتوں کے بہ جائے اسے خدا کے غضب ہی سے سابقہ پیش آرہا ہے۔ کاش! انسان برے انجام سے دوچار ہونے سے پہلے اس حقیقت کو جان سکتا اور اس کی زندگی ہر طرح کی بے راہ روی اور ظالمانہ روش سے یکسر پاک ہو سکتی۔

⟨۲⟩ وَ عَنْ سَعِيْدِ بْنِ زَيْدٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَنْ اَخَذَ شِبْرًا مِّنَ الْاَرْضِ ظُلْمًا فَاِنَّهٗ يُطَوَّقُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مِنْ سَبْعِ اَرْضِيْنَ۔ (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت سعید بن زیدؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: "جس کسی شخص نے ظالمانہ طور پر کسی کی زمین ہتھیالی، قیامت کے روز اس کے گلے میں ساتوں زمینوں کا طوق پہنا دیا جائے گا۔"

تشریح: زور زبردستی سے کسی کی کوئی چیز غصب کرنا ایسا سماجی اور اخلاقی جرم ہے کہ شریعت نے اس جرم کے مرتکب کو سخت سے سخت سزا کا مستوجب قرار دیا ہے۔ کسی کی ملکیت کو ہڑپ کر لینا اور غاصبانہ طور سے اس پر قابض ہو جانا کتنا سنگین جرم ہے۔ اس کا اندازہ اس حدیث سے بہ خوبی کیا جا سکتا ہے۔

جس شخص نے زمین کے ایک قطعہ کے لیے ظلم اختیار کیا، ساتوں زمینیں اس کے گلے کا طوق بنادی جائیں گی۔ مطلب یہ ہے کہ زمین کی لالچ میں اس نے ظلم و سرکشی کی روش اختیار کی، قیامت میں وہی حرص ایک مصیبت اور اس کے لیے وبال جان ثابت ہوگی۔ شرح السنۃ میں ''گلے میں زمینوں کا طوق ڈالے جانے'' کا مفہوم یہ بیان کیا گیا ہے کہ زمین غصب کرنے والے شخص کو خدا زمین میں دھنسائے گا اور زمین اس کی گردن کو اس طرح جکڑے گی گویا اس کی گردن کو طوق سے جکڑ دیا گیا ہو۔

گراوٹ اور پستی

عصبیت

〈۱〉 عَنْ عُبَادَةَ بْنِ کَثِیْرَۃِ الشَّامِیِّ مِنْ اَھْلِ فَلَسْطِیْنَ عَنِ امْرَأَۃٍ مِّنْھُمْ یُقَالُ لَھَا فَسِیْلَۃُ اَنَّھَا قَالَتْ: سَمِعْتُ اَبِیْ یَقُوْلُ: سَاَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم: اَمِنَ الْعَصَبِیَّۃِ اَنْ یُّحِبَّ الرَّجُلُ قَوْمَہٗ؟ قَالَ: لَا، وَلٰکِنْ مِّنَ الْعَصَبِیَّۃِ اَنْ یَّنْصُرَ الرَّجُلُ قَوْمَہٗ عَلَی الظُّلْمِ۔ (احمد، ابن ماجہ)

ترجمہ: عبادہ بن کثیر شامی فلسطین کے باشندے اپنے قبیلہ کی خاتون سے جس کا نام فسیلہ ہے، سے روایت کرتے ہیں کہ اس کا بیان ہے کہ میں نے اپنے باپ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ کیا یہ بھی عصبیت ہے کہ کوئی شخص اپنی قوم سے محبت کرے؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا: ''نہیں، بل کہ عصبیت یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی قوم کی مدد اس صورت میں بھی کرے جب کہ وہ ظلم کر رہی ہو۔''

تشریح: معلوم ہوا کہ اپنی قوم یا گروہ سے محبت یا اس کے حقوق و مفادات کے حصول و تحفظ کی ایسی کوشش جس سے دوسروں کے جائز حقوق و مفادات مجروح نہ ہوں، عصبیت نہیں ہے۔ البتہ اپنی قوم کی ایسی حمایت و پاس داری جس میں دوسروں سے ناحق بغض و نفرت کے جذبات نمایاں ہوں یا اپنی قوم کی کسی ایسی جدوجہد میں معاونت کرنا جو صریحاً ظلم و تعدی پر مبنی ہو، اسے جاہلی عصبیت کے سوا کچھ اور نہیں کہا جا سکتا۔ اسلام اس طرح کی عصبیتوں کو مٹانے کے لیے ہی آیا ہے۔ اس لیے کہ جاہلانہ عصبیت کے ساتھ کسی اعلیٰ نظریہ و فکر اور کسی اعلیٰ تہذیب و تمدن کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اسلام آفاقی و عالم گیر نظریہ و فکر کا حامل ہے۔ وہ کبھی بھی کسی تنگ خیالی اور فرقہ پرستی سے مصالحت کا روادار نہیں ہو سکتا۔

〈۲〉 وَ عَنِ الْمَعْرُوْرِ بْنِ سُوَیْدٍ قَالَ: مَرَرْنَا بِاَبِیْ ذَرٍّ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ بِالرَّبَذَۃِ وَ عَلَیْہِ بُرْدٌ وَّ عَلٰی غُلَامِہٖ، مِثْلُہٗ فَقُلْنَا: یَآ اَبَا ذَرٍّ، لَوْ جَمَعْتَ بَیْنَھُمَا کَانَتْ حُلَّۃً فَقَالَ: اِنَّہٗ کَانَ بَیْنِیْ وَ بَیْنَ رَجُلٍ مِّنْ اِخْوَانِیْ کَلَامٌ وَّ کَانَتْ اُمُّہٗ اَعْجَمِیَّۃً فَعَیَّرْتُہٗ بِاُمِّہٖ فَشَکَانِیْ اِلَی النَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وسلم فَلَقِیْتُ النَّبِیَّ صلی اللہ علیہ وسلم فَقَالَ: یَآ اَبَا ذَرٍّ،

اِنَّکَ امْرُءٌ فِیْکَ جَاهِلِیَّةٌ۔ فَقُلْتُ: یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، مَنْ سَبَّ الرِّجَالَ سَبُّوْا اَبَاهُ وَ اُمَّهُ، قَالَ: یَا اَبَا ذَرٍّ، اِنَّکَ امْرُءٌ فِیْکَ جَاهِلِیَّةٌ۔ هُمْ اِخْوَانُکُمْ جَعَلَهُمُ اللّٰهُ تَحْتَ اَیْدِیْکُمْ فَاَطْعِمُوْهُمْ مِمَّا تَاْکُلُوْنَ وَ اَلْبِسُوْهُمْ مِمَّا تَلْبَسُوْنَ وَلَا تُکَلِّفُوْهُمْ مَا یَغْلِبُهُمْ فَاِنْ کَلَّفْتُمُوْهُمْ فَاَعِیْنُوْهُمْ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت معرور بن سویدؒ سے روایت ہے کہ ہم ابوذر رضی اللہ عنہ کے پاس ربذہ میں گئے۔ وہ ایک چادر اوڑھے ہوئے تھے اور ان کے غلام نے بھی اسی طرح کی چادر اوڑھ رکھی تھی۔ ہم نے کہا کہ اے ابوذر، اگر تم یہ دونوں چادریں لے لیتے تو ایک پوشش ہو جاتی۔ اس پر انھوں نے کہا کہ مجھ میں اور میرے ایک بھائی میں کچھ تیز باتیں ہوگئیں۔ اس کی ماں عجمی تھی، میں نے اسے اس کی ماں کی عار دلائی۔ اس شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے میری شکایت کر دی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے میری ملاقات ہوئی تو آپؐ نے فرمایا: "اے ابوذر تجھ میں جاہلیت موجود ہے۔" میں نے عرض کیا، یارسول اللہ، جو کوئی شخص لوگوں کو گالی دے گا تو وہ اس کے باپ، ماں کو گالی دیں گے۔ آپؐ نے فرمایا: "اے ابوذر، تجھ میں جاہلیت موجود ہے۔ وہ تمھارے بھائی ہیں۔ خدا نے ان کو تمھارا زیرِ دست بنایا ہے۔ تو تم ان کو وہی کھلاؤ جو خود کھاتے ہو اور وہی پہناؤ جو خود پہنتے ہو۔ اور ان سے ان کی سکت سے بڑھ کر کام نہ لو اور اگر ایسا کوئی کام ان سے لو تو پھر اس میں ان کا ہاتھ بٹاؤ۔"

تشریح: ربذہ ایک مقام کا نام ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شخص جس کو حضرت ابوذرؓ بھائی کہہ رہے ہیں وہ غلام تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے زیر دستوں اور غلاموں کو بھائی کہا ہے۔ اس لیے حضرت ابوذر بھی اسے بھائی کہہ رہے ہیں۔

آپؐ کے اس ارشاد کا کہ اے ابوذر تجھ میں جاہلیت موجود ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ابھی تجھ میں زمانۂ جاہلیت کا اثر کچھ نہ کچھ باقی ہے۔ اپنے نسب پر فخر کرنا اور دوسروں کے ماں باپ کو بالخصوص اگر وہ عجمی ہوں، حقیر سمجھنا، یہ زمانۂ جاہلیت کی چیز ہے۔ اس کا اسلام سے کچھ بھی تعلق نہیں ہو سکتا۔

مسلم ہی کی ایک روایت میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب کہا کہ "ابوذر، تجھ میں جاہلیت موجود ہے" تو حضرت ابوذرؓ نے عرض کیا: عَلٰی حَالِ سَاعَتِیْ مِنَ الْکِبَرِ: اس بڑھاپے کی حالت کو پہنچنے کے بعد بھی (مجھ میں جاہلیت باقی ہے!) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نعم (ہاں)،

کوئی کسی کو برا کہے تو زیادہ سے زیادہ برا کہنے والے کو جواباً برا کہا جا سکتا ہے نہ کہ اس کے ماں باپ تک کی خبر لینے لگو۔ غلام جو تمھاری ملک اور تمھارے زیر دست ہیں، ان کے ساتھ تمھارا سلوک بہتر سے بہتر ہونا چاہیے۔ تمھیں ان کے ساتھ ہمدردی ہونی چاہیے۔ وہ کوئی غیر

نہیں، تمھارے بھائی ہیں۔ ان سے کام ان کی طاقت کے مطابق لو۔ اور اگر کوئی ایسا کام لینا پڑ جائے جو ان کی سکت سے باہر ہو تو اس کام میں ان کا ہاتھ بٹاؤ تا کہ وہ پریشانی میں نہ پڑیں۔

بے حیائی

﴿۱﴾ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم: کُلُّ اُمَّتِیْ مُعَافًی اِلَّا الْمُجَاهِرُوْنَ وَ اِنَّ مِنَ الْمَجَانَةِ اَنْ یَّعْمَلَ الرَّجُلُ بِاللَّیْلِ عَمَلاً ثُمَّ یُصْبِحُ وَ قَدْ سَتَرَهُ اللّٰهُ فَیَقُوْلُ: یَا فُلَانُ، عَمِلْتُ الْبَارِحَةَ کَذَا وَ کَذَا وَ قَدْ بَاتَ یَسْتُرُهٗ رَبُّهٗ وَ یُصْبِحُ وَ یَکْشِفُ سِتْرَ اللّٰهِ عَنْهُ۔ (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میری پوری امت عافیت میں ہے بجز ان لوگوں کے جو اپنے عیوب اور گناہ کو ظاہر کرتے ہیں۔ اور یہ بات کتنی بے حسی و بے پروائی کی ہے کہ کوئی شخص رات میں کوئی برا کام کرے اور صبح ہونے پر جب کہ اللہ نے اسے چھپا لیا تھا وہ لوگوں سے کہتا پھرے کہ اے فلاں، میں نے رات کو ایسا ایسا برا کام کیا حالاں کہ اس کے رب نے رات میں اس کی پردہ پوشی کی تھی اور اس نے صبح ہوتے ہی اللہ کے پردہ کو چاک کر دیا۔''

تشریح: یعنی لوگوں کے لیے اس کا امکان ہے کہ خدا ان کی دنیا ہی میں نہیں، آخرت میں بھی پردہ پوشی فرمائے۔ ان کو توبہ کی توفیق عطا ہو اور ان کی اصلاح ہو سکے۔ اور رسوائی سے محفوظ رہیں۔ لیکن جو لوگ اتنے زیادہ بے حیا اور بے باک ہوں کہ انھیں اپنی رسوائی کی کوئی فکر ہی نہ ہو۔ کھلم کھلا اور نہایت ڈھٹائی کے ساتھ گناہ کرتے رہیں اور انھیں کوئی شرم دامن گیر نہ ہو، وہ اپنے گناہوں اور بری حرکات کو اس طرح بیان کرتے پھریں گویا انھوں نے کوئی بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ ایسے لوگ دنیا میں بھی ذلیل و رسوا ہوتے ہیں اور آخرت میں بھی ان سے سخت باز پرس ہوگی۔ وہ خدا کی گرفت سے اپنے آپ کو بچا نہیں سکتے۔ دنیا میں لوگ انھیں اچھے الفاظ سے کبھی یاد نہیں کر سکتے۔ علماء کے نزدیک بھی ایسے فاسق معلنین یعنی کھلم کھلا فسق و فجور میں مبتلا شخص کی غیبت کوئی غیبت نہیں ہے۔ آخرت میں بھی رسوائی ہی ان کے حصے میں آئے گی۔

﴿۲﴾ وَ عَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم اِنَّ اَعْظَمَ الْاَمَانَةِ عِنْدَ اللّٰهِ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ، وَ فِیْ رِوَایَةٍ "وَ اِنَّ مِنْ اَشَرِّ النَّاسِ عِنْدَ اللّٰهِ مَنْزِلَةً یَّوْمَ الْقِیٰمَةِ" الرَّجُلُ یُفْضِیْ اِلٰی امْرَاَتِهٖ وَ تُفْضِیْ اِلَیْهِ ثُمَّ یَنْشُرُ سِرَّهَا۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابوسعیدؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قیامت کے روز اللہ

کے نزدیک سب سے بڑی امانت اور ایک روایت میں ہے کہ 'قیامت کے روز درجہ کے لحاظ سے اللہ کے نزدیک سب سے برا شخص وہ ہوگا، جو اپنی بیوی سے ہم بستر ہو اور اس کی بیوی اس کی ہم آغوش ہو اور پھر وہ اس کے راز کو بیان کرتا پھرے۔''

تشریح: شوہر اور بیوی کے درمیان راز و نیاز وغیرہ اور جنسی امور کی جو باتیں ہوتی ہیں، ان کی حیثیت ایک بڑی امانت کی ہے۔ ہر شوہر کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس امانت کی حفاظت کرے۔ اگر کوئی شوہر اس امانت کا پاس و لحاظ نہیں رکھتا بل کہ اس کے اور اس کی بیوی کے درمیان جو کچھ راز و نیاز اور جنسی امور کی باتیں ہوتی ہیں، وہ ان کو لوگوں میں بیان کرتا پھرتا ہے۔ اس سے قیامت کے روز سخت باز پرس ہوگی۔ خاوند بیوی کے درمیان جو جنسی معاملات اور ذاتی امور سے متعلق باتیں ہوتی ہیں، ان کو دوسروں کے سامنے بیان کرنا صرف اخلاقی نقطۂ نظر سے ہی نہیں بلکہ شرعاً بھی سخت معیوب ہے۔

جاہلیت کی دعوت

﴿۱﴾ عَنْ جُنْدُبِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ الْبَجَلِيِّ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم مَنْ قُتِلَ تَحْتَ رَايَةٍ عُمِّيَّةٍ يَدْعُوْا عَصَبِيَّةً اَوْ يَنْصُرُ عَصَبِيَّةً فَقِتْلَةٌ جَاهِلِيَّةٌ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت جندب بن عبداللہ بجلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو شخص اندھے جھنڈے کے تلے مارا جائے اس حال میں کہ وہ عصبیت کی دعوت دیتا ہو یا عصبیت کی حمایت کرتا ہو تو وہ جاہلیت میں مارا گیا۔''

تشریح: جو شخص حق و ناحق کچھ نہ سمجھتا ہو، جس کے لیے جاہلی پچ اور اپنی قوم اور اپنا گروہ ہی سب کچھ ہو، اپنی قوم اور اپنے فرقہ کی پاس داری اور بے جا حمایت میں نہ وہ عدل و انصاف کا پاس و لحاظ رکھتا ہو اور نہ اس کی نگاہ میں اخلاق و شرافت کوئی چیز ہو، جس کے نزدیک جائز اور درست وہ ہے جس کو اس کی قوم جائز قرار دیتی ہو خواہ وہ ظلم و ستم ہی کیوں نہ ہو۔ اور ناروا وہ ہو جس کو اس کی قوم ناروا ٹھہرائے خواہ عدل و انصاف اور کرم گستری ہی کیوں نہ ہو۔ وہ اسی جاہلی عصبیت کا داعی ہو اور اسی جاہلیت کا حامی بن کر کھڑا ہو۔ ظاہر ہے، ایسے شخص کو ظلمت و تاریکی کا ہی علم بردار کہا جا سکتا ہے۔ اب اگر اپنے اندھے جھنڈے (Blind Flag) کے تلے عصبیت کے لیے لڑتا ہوا مارا جاتا ہے تو اس کی موت حق و صداقت کی راہ میں نہیں بل کہ جاہلیت پر ہوگی۔

﴿۲﴾ وَ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم يَقُوْلُ: مَنْ خَلَعَ

يَدًا مِّنْ طَاعَةٍ لَقِيَ اللّٰهَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ لاَ حُجَّةَ لَهٗ وَ مَنْ مَّاتَ وَ لَيْسَ فِيْ عُنُقِهٖ بَيْعَةٌ مَاتَ مِيْتَةً جَاهِلِيَّةً۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول خدا ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: ''جو شخص اپنا ہاتھ اطاعت سے کھینچ لے وہ قیامت کے روز اللہ سے اس حال میں ملے گا کہ اس کے پاس کوئی دلیل و حجت نہ ہوگی۔ اور جس شخص کی موت اس حال میں آئے کہ اس نے بیعت نہ کی ہو، اس کی موت جاہلیت کی موت ہوگی۔''

تشریح: اسلام میں اجتماعی نظم کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ نظم اجتماعی کے بغیر اسلامی نظام کا کوئی تصوّر نہیں کیا جاسکتا۔ قیام امن اور اسلام کی ساری برکات اور امت مسلمہ کی قوت کا راز اسلامی نظام حکومت کے استحکام سے وابستہ ہے۔ اب اگر کوئی شخص اسلامی مملکت کے سربراہ کی اطاعت سے گریز اختیار کرتا ہے تو درحقیقت وہ اس عمارت کو ڈھانے کے درپے ہے جس کی تعمیر اور استحکام، دونوں ہی اسلام میں مطلوب ہیں۔ ایسا شخص اپنی اس مجرمانہ حرکت کے حق میں خدا کے سامنے کوئی عذر پیش نہ کر سکے گا۔ خدا کے یہاں اس کی حیثیت ایک مجرم ہی کی ہوسکتی ہے۔ اور وہاں کوئی بھی نہ ہوگا جو اسے اس کے جرم کی سزا سے چھٹکارا دلا سکے۔

اسلامی زندگی اختیار کرنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آدمی نظم اجتماعی کو قبول کرے اور اس سے فرار اختیار نہ کرے۔ امت مسلمہ پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ اگر اس کا کوئی امیر نہ ہو تو وہ پہلی فرصت میں اپنا کوئی امیر منتخب کرے۔ اور اس کی قیادت میں اپنی اجتماعیت کو استوار کرے۔ اس کے سارے معاملات اور بالخصوص اجتماعی امور امیر کی قیادت اور رہ نمائی میں طے پائیں۔ خدا دنیا میں امت کو غالب دیکھنا چاہتا ہے۔ دنیا میں غلبہ و استحکام کے لیے اجتماعی نظام کا قیام ناگزیر ہے۔ علاوہ ازیں، اس اعلیٰ و برتر مقصد سے مراد ہے جور و استبداد کا خاتمہ اور دین حق کا قیام۔

بدعہدی وفریب کاری

〈۱〉 عَنِ ابْنِ عُمَرَؓ قَالَ: سَمِعْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَقُوْلُ: لِكُلِّ غَادِرٍ لِوَآءٌ يُنْصَبُ لِغَدْرَتِهٖ۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ میں نے نبی ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: ''ہر ایک غدار کے لیے ایک جھنڈا نصب ہوگا جو اس کی بے وفائی و بدعہدی کا نشان ہوگا۔''

〈۲〉 وَ عَنِ ابْنِ عُمَرَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اِذَا جَمَعَ اللّٰهُ الْاَوَّلِيْنَ وَالْاٰخِرِيْنَ

يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرْفَعُ لِكُلِّ غَادِرٍ لِوَآءٌ فَقِيْلَ هٰذِهٖ غَدْرَةُ فُلَانِ بْنِ فُلَانٍ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جب اللہ قیامت کے روز سب اگلوں اور پچھلوں کو جمع کرے گا تو ہر ایک عہد شکن کا ایک جھنڈا بلند کیا جائے گا، پھر کہا جائے گا کہ یہ فلاں ابن فلاں کی بدعہدی ہے۔“

تشریح: عرب کا دستور رہا تھا کہ کسی چیز کو شہرت دینے کے لیے بازار میں جھنڈا کھڑا کرتے تھے۔ قیامت کے روز دغاباز اور بدعہد کی تشہیر اور علی رؤس الاشہاد اس کی تفضیح کے لیے جھنڈا بلند کیا جائے گا تاکہ برسرِ عام اس کی رسوائی ہو اور وہ کھلی آنکھوں سے اپنی عزت کو خاک میں ملتے دیکھ لے۔ لوگ جان لیں کہ فلاں شخص نہایت ہی ذلیل ہے۔ دنیا کی زندگی میں دغابازی اور بدعہدی اس کا پیشہ رہا ہے۔

〈۳〉 وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم: لِكُلِّ غَادِرٍ لِوَآءٌ يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرْفَعُ لَهٗ بِقَدْرِ غَدْرِهٖ. اَلَا، وَلَا غَادِرَ اَعْظَمُ غَدْرًا مِّنْ اَمِيْرِ عَامَّةٍ. (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابوسعیدؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ”ہر ایک عہد شکن کے لیے قیامت کے روز ایک جھنڈا ہوگا جو اس کی عہد شکنی کے بہ قدر بلند کیا جائے گا اور جان لو کہ اس سے بڑا عہد شکن کوئی نہیں جو عام لوگوں کا حاکم اور امیر ہو کر بدعہدی کرے۔“

تشریح: مطلب یہ ہے کہ قیامت کے روز آدمی کی بدعہدی اور فریب دہی اس کے لیے صرف رسوائی کا باعث ثابت ہوگی۔ جو آج جتنا بڑا بدعہد ہے، قیامت کے دن اسے اتنا ہی زیادہ ذلت کا سامنا کرنا پڑے گا۔

یہ حدیث یہ بھی بتاتی ہے کہ دنیا میں سب سے بڑی بدعہدی اس حاکم اور قائد کی بدعہدی ہے۔ حاکم کی ذمہ داری ہے کہ وہ خود انصاف پر قائم رہے اور لوگوں کو انصاف پر قائم رکھنے کے لیے کوشاں ہو۔ اب اگر وہ اس ذمہ داری کو فراموش کر کے لوگوں کے جان و مال پر ستم روا رکھتا اور ان کے حقوق کو پامال کرتا ہے تو اس سے بڑا عہد شکن دوسرا نہیں ہوسکتا۔ کسی عام آدمی کی بدعہدی کی اس کی بدعہدی سے کوئی نسبت نہیں۔ حاکم کی بدعہدی سے چند ایک کو نہیں، عظیم مخلوق کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اس لیے سارے لوگوں سے بڑھ کر ذلت اسی کے حصہ میں آئے گی۔ امیر یا حاکم کا خائن یا بدعہد ہونا ظلمِ عظیم ہے۔ لوگوں کے ساتھ اس کی عہد شکنی یہ ہے کہ وہ ان کی جائز توقعات پورے نہ کرے۔ اور عوام کی حاکم کے ساتھ بدعہدی یہ ہے کہ وہ بیعت کو ناحق توڑ دیں۔ اور بغیر کسی شرعی عذر کے حاکم کے ساتھ تعاون نہ کریں اور اس کی اطاعت سے انکار کر دیں۔

〈۴〉 وَ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رضی اللہ عنہ عَنِ النَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: قَالَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ: ثَلاثَةٌ اَنَا خَصْمُهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ: رَجُلٌ اَعْطٰی بِیْ ثُمَّ غَدَرَ، وَ رَجُلٌ بَاعَ حُرًّا فَاَکَلَ ثَمَنَهٗ، وَ رَجُلٌ اِسْتَأْجَرَ اَجِیْرًا فَاسْتَوْفٰی مِنْهُ وَلَمْ یُعْطِهٖ اَجْرَهٗ۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ’’اللہ عزوجل فرماتا ہے کہ تین اشخاص ایسے ہیں کہ قیامت کے روز میں ان کا دشمن ہوں گا۔ ایک وہ شخص جو میرا نام لے کر عہد کرے اور پھر عہد شکنی کرے۔ اور ایک شخص وہ ہے جو کسی آزاد آدمی کو بیچ دے اور اس کی قیمت کھا جائے۔ اور ایک وہ شخص جس نے کسی مزدور کو اجرت پر رکھا۔ پھر اس سے کام پورا لیا اور اسے اس کی مزدوری نہ دی۔‘‘

تشریح: یہ حدیث بتاتی ہے کہ خدا تین قسم کے اشخاص کا دشمن ہوگا۔ جس کسی کا دشمن خدا ہو، اس کی تباہی و بربادی میں کیا شبہ باقی رہ سکتا ہے۔ ایک شخص وہ ہے جو عہد شکن ہو جس شخص کو خدا کی عظمت کا پاس و لحاظ نہ ہو اور جو شخص اتنا زیادہ بے غیرت ہو کہ آزاد شخص کو فروخت کر دے اور اس کی قیمت خود کھائے اور اس کی قیمت کھاتے ہوئے اسے کچھ بھی باک نہ ہو اور اس بات کو اس کا ضمیر گوارا کرے کہ کسی کو غلامی میں ڈال کر خود اپنے لیے سامان عیش کرے۔ اس طرح کے لوگوں پر اگر اس کا غضب نہ بھڑکے گا تو پھر کس پر بھڑکے گا۔

تیسرا شخص وہ ہے جو کام پورا لے لیکن مزدوری نہ دے۔ یہ کھلی ہوئی بے انصافی اور ظلم ہے کہ مزدور سے کام تو پورا لیا جائے لیکن مزدوری سے اسے محروم رکھا جائے۔ جو شخص حق و انصاف کے خلاف کوئی قدم اٹھاتا ہے وہ کسی معمولی گناہ کا مرتکب نہیں ہوتا بل کہ وہ اپنی روش سے درحقیقت اپنے خدا کو اپنا دشمن بناتا ہے، خواہ اسے اس بات کا احساس ہو یا نہ ہو۔

〈۵〉 وَ عَنِ ابْنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہ وَ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم مَنْ غَشَّنَا فَلَیْسَ مِنَّا۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’جو شخص ہمیں فریب دے وہ ہم سے نہیں ہے۔‘‘

تشریح: ایک بار نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) بازار تشریف لے گئے۔ وہاں گیہوں کے ایک ڈھیر میں ہاتھ ڈالا تو اسے اندر سے گیلا پایا۔ دوکان دار سے اس کی وجہ دریافت کی تو اس نے عذر کیا کہ پانی سے

بھیگ گیا ہے۔ آپ (ﷺ) نے فرمایا کہ ایسی بات تھی تو بھیگے ہوئے گیہوں کو اوپر کیوں نہ رکھا (کہ لوگوں کو دھوکا نہ ہوتا؟) اسی موقع پر آپ (ﷺ) نے تنبیہ فرمائی کہ ''جو شخص ہمیں فریب دے گا وہ ہم میں سے نہیں ہے۔'' یعنی وہ ہمارے لائے ہوئے طریقہ کے خلاف چل رہا ہے۔ اگر وہ چاہتا ہے کہ دنیا و آخرت میں اس کا شمار ہمارے ہدایت یافتہ گروہ میں ہو تو اسے دھوکا اور فریب کاری کے کاموں سے کامل اجتناب کرنا چاہیے۔

تضحیک و تمسخر

(۱) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ الْعَبْدَ لَیَقُوْلُ الْکَلِمَةَ لَا یَقُوْلُهَآ اِلَّا لِیُضْحِکَ بِهِ النَّاسَ، یَهْوِیْ بِهَا اَبْعَدَ مَا بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ، وَ اِنَّهٗ لَیَزِلُّ عَنْ لِّسَانِهٖ اَشَدَّ مِمَّا یَزِلُّ عَنْ قَدَمِهٖ۔ (البیہقی فی شعب الایمان)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کبھی بندہ ایک بات کہتا ہے اور صرف لوگوں کو ہنسانے کے لیے کہتا ہے اس کی وجہ سے وہ آسمان و زمین کے درمیانی فاصلہ سے بھی بڑھ کر فاصلہ سے گر جاتا ہے۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ اپنے قدم کے سبب پھسلنے سے کہیں زیادہ سخت بات بندے کے لیے یہ ہے کہ وہ زبان کے سبب لغزش کھا جائے۔''

تشریح: ہنسنے ہنسانے کو اپنا پیشہ بنانا کسی طرح درست نہیں ہے۔ اور اگر اس کے لیے کوئی کذب بیانی سے کام لیتا ہے، پھر تو وہ اپنی ذات پر ایسا ستم کرتا ہے جس کا انجام خسران و ندامت کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتا۔ بذلہ سنجی اور ہنسی مذاق کی کثرت سے آدمی کی وقعت گھٹ جاتی ہے۔ اس سے اس کا وقار مجروح ہو کر رہ جاتا ہے۔ چناں چہ حدیث میں ہے۔ اِیَّاکَ وَ کَثْرَةَ الضِّحْکِ فَاِنَّهٗ یُمِیْتُ الْقَلْبَ وَ یَذْهَبُ بِنُوْرِ الْوَجْهِ (البیہقی فی شعب الایمان) ''زیادہ ہنسنے سے پرہیز کرو کیوں کہ زیادہ ہنسنا دل کو مردہ اور چہرہ کے نور کو زائل کر دیتا ہے۔''

یہ نہایت ہی بدبختی کی بات ہے کہ آدمی لوگوں کو ہنسانے کی غرض سے اپنی عاقبت خراب کر لے اور مقام بلند سے گر جائے یہاں تک کہ دوزخ میں جا پڑے۔ آدمی خواہ کتنی ہی بلندی پر کیوں نہ ہو، ہنسی اور تمسخر کے سبب انتہائی پستی میں گر کر رہتا ہے۔ انسان کو خدا نے اہم ذمہ داری کے مقام پر کھڑا کیا ہے۔ پھر اس کے لیے یہ کیوں کر جائز ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے اوقات کو غیر سنجیدہ اور غلط کاموں میں صرف کرے۔

پاؤں کے پھسلنے سے آدمی کو اتنا ضرر نہیں پہنچتا جتنا زبان کی لغزش سے پہنچ سکتا ہے۔ پاؤں کی لغزش سے اس کے جسم کو چوٹ آسکتی ہے، لیکن زبان کی لغزش سے آدمی کی آخرت تک تباہ و برباد ہوسکتی ہے۔

﴿۲﴾ وَ عَنْ بَهْزِ بْنِ حَكِيمٍ عَنْ اَبِيهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَيْلٌ لِّمَنْ يُّحَدِّثُ فَيَكْذِبُ لِيُضْحِكَ بِهِ الْقَوْمَ، وَيْلٌ لَّهٗ، وَيْلٌ لَّهٗ۔

(احمد، ترمذی، ابوداؤد، دارمی)

ترجمہ: حضرت بہز بن حکیمؒ اپنے والد اور وہ بہزؒ کے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”خرابی ہے اس کے لیے جو گفتگو کرے اور جھوٹ بولے تاکہ لوگوں کو ہنسائے۔ خرابی ہے اس کے لیے، خرابی ہے اس کے لیے۔“

تشریح: زجروعید کی شدت کے اظہار کے لیے حضور (ﷺ) نے ”خرابی ہے اس کے لیے!“ مکرر ارشاد فرمایا: اہلِ عرب لفظ ”ویل“ اس شخص کے لیے استعمال کرتے ہیں جو نہایت ناپسندیدہ امر کا ارتکاب کرتا ہے۔ اس سے مقصود اظہارِ تاسف اور اس کو متنبہ کرنا ہوتا ہے۔

تحقیر

﴿۱﴾ عَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: لَا تَحَاسَدُوْا وَلَا تَنَاجَشُوْا وَلَا تَبَاغَضُوْا وَلَا تَدَابَرُوْا وَلَا يَبِعْ بَعْضُكُمْ عَلٰى بَيْعِ بَعْضٍ وَ كُوْنُوْا عِبَادَ اللّٰهِ اِخْوَانًا اَلْمُسْلِمُ اَخُو الْمُسْلِمِ، لَا يَظْلِمُهٗ وَلَا يَخْذُلُهٗ وَلَا يَحْقِرُهٗ۔ اَلتَّقْوٰى هٰهُنَا وَ يُشِيْرُ اِلٰى صَدْرِهٖ ثَلَاثَ مِرَارٍ۔ بِحَسْبِ امْرِءٍ مِّنَ الشَّرِّ اَنْ يَّحْقِرَ اَخَاهُ الْمُسْلِمَ، كُلُّ الْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ حَرَامٌ: دَمُهٗ وَ مَالُهٗ وَ عِرْضُهٗ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”باہم ایک دوسرے سے حسد نہ کرو، نہ ایک دوسرے کی تفتیش اور کرید میں پڑو، نہ آپس میں بغض رکھو، نہ باہم دشمنی یا قطع تعلق کرو اور نہ تم میں سے کوئی دوسرے کی بیع پر بیع کرے۔ اللہ کے بندے اور آپس میں بھائی بھائی بن کر رہو۔ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے۔ نہ وہ اس پر ظلم کرے، نہ اسے ذلیل کرے اور نہ اسے حقیر سمجھے۔ تقویٰ یہاں ہے۔“ آپؐ نے اپنے سینہ کی طرف اشارہ فرمایا، ایسا آپؐ نے

تین بار کیا" آدمی کے لیے یہی برائی کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر خیال کرے۔ مسلمان کی ہر ایک چیز دوسرے مسلمان پر حرام ہے۔ اس کا خون، اس کا مال اور اس کی آبرو۔"

تشریح: یہ حدیث اپنے مفہوم میں نہایت واضح ہے۔ مسلمانوں کے باہمی تعلقات بھائیوں کی طرح ہونے چاہئیں۔ مسلمان باہم ایک دوسرے کی عزت و آبرو کا پاس و لحاظ رکھیں۔ ان کی پوری کوشش یہ ہو کہ ان سے کسی بھائی کو کسی طرح کا نقصان ہرگز نہ پہنچے۔

تقویٰ کا اصل تعلق دل سے ہے۔ محض ظاہری اعمال کو نہیں بل کہ آدمی کو اپنے دل کی درستی کی بھی فکر ہونی چاہیے۔

یہ نہایت افسوس ناک بات ہوگی کہ کوئی شخص بھلا بننے کے بجائے اپنے لیے برا بننا پسند کرے۔ حضور (ﷺ) فرماتے ہیں کہ کسی شخص کے برا ہونے کے لیے اتنا ہی بہت ہے کہ وہ اپنے بھائی کو حقیر تصوّر کرے۔ خواہ اس کے اندر کوئی اور برائی نہ ہو۔ اس کے برا ہونے کے لیے یہی عیب کافی ہے کہ وہ اپنے بھائی کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔

〈۲〉 وَ عَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: رُبَّ اَشْعَثَ مَدْفُوْعٍ بِالْاَبْوَابِ لَوْ اَقْسَمَ عَلَى اللّٰهِ لَاَبَرَّهٗ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: "کتنے ہی پریشاں بال، غبار آلود، دروازوں پر دھکیلے ہوئے لوگ ایسے ہیں کہ اگر وہ خدا پر اعتماد کرتے ہوئے کسی بات پر قسم کھالیں تو خدا اسے پورا کردے۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ خاک سارانِ جہاں کو کبھی بھی حقارت کی نگاہ سے نہیں دیکھنا چاہیے۔ ان میں اللہ کے مقبول بندے بھی ہو سکتے ہیں جن کی ظاہری خستہ حالی کو دیکھ کر لوگ انھیں دھکے دے دیتے ہیں۔ حالاں کہ ان کی مقبولیت کا یہ حال ہے کہ اگر وہ کسی بات پر قسم کھا بیٹھیں تو خدا لازماً ان کی قسم کو پورا کردے گا، ان کو ہرگز مایوس و رسوا نہ ہونے دے گا۔

〈۳〉 وَ عَنْ عِيَاضِ بْنِ حِمَارٍ الْمُجَاشِعِيِّؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: اِنَّ اللّٰهَ اَوْحٰى اِلَيَّ اَنْ تَوَاضَعُوْا حَتّٰى لَا يَفْخَرَ اَحَدٌ عَلٰى اَحَدٍ وَّلَا يَبْغِيْ اَحَدٌ عَلٰى اَحَدٍ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت عیاض بن حمار مجاشعیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''اللہ نے میری طرف وحی کی ہے کہ تواضع اختیار کرو یہاں تک کہ کوئی شخص کسی کے مقابلہ میں فخر نہ کرے اور نہ کوئی کسی پر ظلم اور زیادتی کرے۔''

تشریح: یعنی مجھے اس بات کی وحی کی ہے کہ لوگ تواضع وانکسار کا طریقہ اختیار کریں۔ غرور و استکبار سے اپنے آپ کو دور رکھیں۔ کوئی کسی کے مقابلہ میں نہ تو فخر جتائے اور نہ کسی پر ظلم کا روادار ہو۔ بندے کی قامت کو جو لباس زیب دیتا ہے وہ تواضع کا لباس ہے۔ دوسرے لباس کبر، استکبار وغیرہ استعمال کر کے بندہ اپنا فطری جمال کھو دیتا ہے۔

آبروریزی

﴿۱﴾ عَنْ جَابِرٍؓ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ قَالَ: مَا مِنْ اِمْرَأٍ مُّسْلِمٍ یَخْذُلُ اِمْرَأً مُّسْلِمًا فِیْ مَوْضِعٍ یُنْتَهَکُ فِیْهِ حُرْمَتُهٗ وَ یُنْتَقَصُ فِیْهِ مِنْ عِرْضِهٖ اِلَّا خَذَلَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی فِیْ مَوْطِنٍ یُّحِبُّ فِیْهِ نُصْرَتَهٗ۔ وَمَا مِنْ اِمْرَأٍ مُّسْلِمٍ یَّنْصُرُ مُسْلِمًا فِیْ مَوْضِعٍ یُّنْتَقَصُ فِیْهِ مِنْ عِرْضِهٖ وَ یُنْتَهَکُ فِیْهِ مِنْ حُرْمَتِهٖ اِلَّا نَصَرَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی فِیْ مَوْطِنٍ یُّحِبُّ فِیْهِ نُصْرَتَهٗ۔ (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جو مسلمان شخص کسی مسلمان شخص کی اس موقع پر مدد نہ کرے جہاں اس کی بے حرمتی کی جاتی ہو اور اس کی آبرو کو نقصان پہنچایا جاتا ہو تو اللہ اس کی اس موقع پر مدد نہیں فرماتا جہاں وہ اس کی مدد کا خواہاں ہوتا ہے، اور جو مسلمان شخص کسی مسلمان شخص کی اس موقع پر مدد کرے جہاں اس کی بے حرمتی کی جاتی ہو اور اس کی آبرو کو نقصان پہنچایا جاتا ہو تو اللہ تعالیٰ اس کی اس موقع پر مدد فرمائے گا جہاں وہ چاہتا ہے کہ اسے اس کی مدد حاصل ہو۔''

تشریح: یعنی جیسا معاملہ کوئی بھائی کے ساتھ روا رکھتا ہے اس کے ساتھ خدا کا معاملہ بھی اسی طرح کا ہوگا۔ اگر کوئی اپنے بھائی کی طرف سے ایسے موقع پر مدافعت کرتا ہے جہاں اس کی بے حرمتی اور آبروریزی ہو رہی ہو تو خدا بھی (دنیا و آخرت میں) ایسے موقع پر مدد فرمائے گا جہاں وہ مدد و نصرت کا سب سے زیادہ ضرورت مند ہوگا۔ لیکن اگر وہ اپنے مسلمان بھائی کی عزت و آبرو کی کوئی فکر نہیں رکھتا۔ بھائی کی آبرو پر حملے ہو رہے ہوں لیکن وہ اپنے بھائی کی مدد کے لیے کھڑا نہیں

ہوتا اور اس کی طرف سے کوئی مدافعت کی کوشش نہیں کرتا۔ تو پھر اس کو بھی خدا سے اس کی امید نہیں رکھنی چاہیے کہ وہ کبھی اس کی ایسے موقع پر مدد فرمائے گا۔ جو شخص اپنے بھائی کے کام نہیں آتا وہ حقیقت میں خود کو اس کا غیر مستحق بناتا ہے کہ خدا مشکل میں اس کی مدد کو پہنچے۔

〈۲〉 وَ عَنْ اَبِی الدَّرْدَآءِ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم يَقُوْلُ: مَا مِنْ مُّسْلِمٍ يَرُدُّ عَنْ عِرْضِ اَخِيْهِ اِلَّا كَانَ حَقًّا عَلَى اللّٰهِ اَنْ يَّرُدَّ عَنْهُ نَارَ جَهَنَّمَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ۔ ثُمَّ تَلَا هٰذِهِ الْاٰيَةَ: وَ كَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ (شرح السنہ)

ترجمہ: حضرت ابو درداءؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: ”جو مسلمان اپنے بھائی کی آبرو کی حفاظت کے لیے مدافعت کرتا ہے تو لازماً اللہ پر یہ حق ہو جاتا ہے کہ قیامت کے روز وہ آتش دوزخ سے اس کی حفاظت فرمائے اور آتشِ دوزخ کو اس سے دور رکھے۔“ پھر آپؐ نے تلاوت فرمائی: وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ ”(اہل ایمان کی نصرت تو ہم پر ایک حق ہے۔“ (الروم:۴۷)

تشریح: آتشِ دوزخ میں جلنا عذاب کے علاوہ بڑی رسوائی اور ذلت کی چیز بھی ہے۔ جو شخص دنیا میں اپنے بھائی کو بے آبرو ہونے سے بچاتا اور اس کے لیے پوری کوشش صرف کرتا ہے، خدا بھی ایسے نیک اور شریف النفس انسان کو آخرت کی رسوائی اور عذاب سے محفوظ رکھے گا۔ لوگوں کو آبرو بخشنے والا کبھی بے آبرو اور ذلیل نہیں ہوسکتا۔ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جو شخص دوسروں کی آبروریزی کے درپے ہوتا ہے وہ بالآخر خود ذلیل وخوار ہو کر رہتا ہے۔

〈۳〉 وَ عَنْ سَعِيْدِ بْنِ زَيْدٍ عَنِ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: اِنَّ مِنْ اَرْبَى الرِّبٰوا الْاِسْتِطَالَةُ فِيْ عِرْضِ الْمُسْلِمِ بِغَيْرِ حَقٍّ۔ (ابوداؤد، البیہقی فی شعب الایمان)

ترجمہ: حضرت سعید بن زیدؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”سب سے بڑھ کر سود یہ ہے کہ مسلمان کی ناحق آبروریزی کے لیے زبان درازی کی جائے۔“

تشریح: خرید وفروخت اور قرض کے سلسلہ میں واجب حق اور اصل رقم سے زیادہ وصول کرنے کو سود کہا جاتا ہے۔ اسلام کی نگاہ میں سود کے ذریعہ سے اپنی دولت میں اضافہ کرنا قطعاً حرام اور انسانیت سوز اور خدا کے غضب کو بھڑکانے والا جرم وگناہ ہے۔ کسی انسان کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنے مقروض سے اپنی دی ہوئی رقم سے زیادہ کا طالب ہو۔ ٹھیک اسی طرح کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ

وہ ناحق کسی مسلمان کی آبروریزی کے درپے ہو اور اس کے لیے زبان درازی سے کام لے۔ یہ زبان درازی حقیقت کے لحاظ سے بدترین قسم کا سود ہے۔ عام سود میں آدمی کو معاشی نقصان پہنچتا ہے جب کہ یہ سود ایسا ہے جس میں سے آدمی کی عزت اور اس کی آبرو مجروح ہوتی ہے۔ معاشی نقصان کے مقابلہ میں عزت و آبرو کا نقصان زیادہ سخت اور حد درجہ اذیت بخش ہوتا ہے۔ اس لیے اگر کسی کی ناحق آبروریزی کے لیے اختیار کی جانے والی زبان درازی خدا کے رسول (ﷺ) نے سب سے بڑا اور بدترین قسم کا سود قرار دیا ہے تو یہ صورتِ حال کی صحیح ترین تعبیر ہے۔

اذیت و ضرر رسانی

﴿۱﴾ عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عُمَرؓ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ: اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِہٖ وَ یَدِہٖ وَالْمُھَاجِرُ مَنْ ھَجَرَ مَا نَھَی اللّٰہُ عَنْہُ۔ (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور جس کے ہاتھ (کی ایذا) سے تمام مسلمان محفوظ رہیں۔ اور مہاجر وہ ہے جو ان باتوں کو چھوڑ دے جن سے خدا نے منع فرمایا ہے۔''

تشریح: ترمذی اور نسائی میں مزید یہ الفاظ ملتے ہیں: وَالْمُؤمِنُ مَنْ اَمِنَہُ النَّاسُ عَلٰی دِمَائِھِمْ وَ اَمْوَالِھِمْ ''مومن وہ ہے جس کو لوگ اپنی جان و مال کے بارے میں امانت دار سمجھیں۔''

اپنے معنی کے لحاظ سے یہ حدیث نہایت اہم ہے۔ اس کے علاوہ ادبی محاسن سے بھی یہ حدیث معمور ہے۔ لفظ 'مسلم' کا مادّہ (Root) وہی ہے جو لفظ 'سلم' کا مادّہ ہے۔ اس لیے مسلمان کو امن و سلامتی ہی کا پیکر ہونا چاہیے۔ نہ یہ کہ اس سے یہ خطرہ ہو کہ کہیں وہ اپنے بھائیوں کی عافیت پر ڈاکہ ڈالنے لگ جائے۔ مسلم صحیح معنی میں وہی شخص ہے جس سے کسی کو کسی بھی طرح کا نقصان اور ضرر اور اذیت پہنچنے کا اندیشہ نہ ہو۔ اس حدیث میں زبان اور ہاتھ کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ ایذا رسائی کے آلات میں بالعموم زبان اور ہاتھ ہی سے کام لیا جاتا ہے۔ ورنہ اذیت خواہ کسی بھی صورت میں پہنچائی جائے وہ ممنوع اور ناروا ہی ہوگی۔

لفظ مومن اور لفظ اَمِنَ، کا مادہ بھی ایک ہی ہے۔ اس لیے مومن کو ایسا ہونا ہی چاہیے کہ اس پر اعتماد اور بھروسہ کیا جاسکے۔

اسلام کی تعلیمات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا اپنے لیے بندہ سے اس کے سوا اور کچھ نہیں چاہتا کہ وہ اپنی بندگی، پرستش اور اطاعت وسرافگندگی کو خدا کے لیے خاص کرلے۔ وہ خدا ہی کی تحمید وتقدیس اور تسبیح کرے۔ اسی کے آگے سرنیاز خم کرے۔ اس کے دل میں اپنے رب کے لیے انتہائی تذلل، محبت اور فدائیت کا جذبہ پایا جاتا ہو۔ نماز، روزہ اور حج وغیرہ عبادات خدا ہی کے لیے فرض کی گئی ہیں۔ اس کے سوا دین کے سارے احکام میں واضح طور پر جو چیز پیش نظر رکھی گئی ہے، وہ بنی نوع انسان ہی کی ضرورتیں ہیں۔ وہ اپنے بندوں پر بے حد مہربان ہے۔ وہ اپنے بندوں سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے دین کا بڑا حصہ اپنے بندوں کی بھلائی اور فلاح کے لیے وقف کر دیا ہے۔ گرچہ للٰہیت اور خدا طلبی کا جذبہ ہر جگہ مطلوب ہے۔ اسلام میں حقوق العباد کا ادا کرنا عین دین وایمان ہے۔ کسی مسلم کے لیے یہ صحیح نہ ہوگا کہ وہ اپنے بھائیوں سے کوئی دلچسپی نہ رکھے کہ نہ وہ ان کے درد وغم کو اپنا درد وغم سمجھے اور نہ ان کی راحت ومسرت سے اسے کوئی سروکار ہو۔ یہ خدا پرستی کے جذبہ کے بھی منافی ہے۔ اس لیے کہ جس خدا کی عظمت اور بزرگی کو ہم تسلیم کرتے ہیں جب خود اسے اپنی مخلوق سے محبت ہے تو ہمارے لیے یہ کیوں کر جائز ہوسکتا ہے کہ ہم کو بندگان خدا کے رنج وراحت کا کچھ پاس ولحاظ نہ ہو۔

خدا کی خوش نودی اور اس کے دین کی خاطر ترک وطن اور ترک مال وجائیداد کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے لیکن اگر ہم نے ان برائیوں کو نہیں چھوڑا اور ہم ان چیزوں کے ترک کرنے پر آمادہ نہ ہوئے جو اللہ کو پسند نہیں ہیں تو حقیقت میں ہم ہجرت کی اصل روح اور اس کی اسپرٹ سے ناآشنا ہی رہے۔

﴿۲﴾ وَ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ ؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: اَتَدْرُوْنَ مَنِ الْمُفْلِسُ؟ قَالُوْا: اَلْمُفْلِسُ فِیْنَا مَنْ لَّا دِرْهَمَ لَهٗ وَلَا مَتَاعَ، فَقَالَ: اِنَّ الْمُفْلِسَ مِنْ اُمَّتِیْ یَاْتِیْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ بِصَلٰوةٍ وَّ صِیَامٍ وَّ زَکٰوةٍ وَّ یَاْتِیْ قَدْ شَتَمَ هٰذَا وَ قَذَفَ هٰذَا وَ اَکَلَ مَالَ هٰذَا وَسَفَکَ دَمَ هٰذَا وَ ضَرَبَ هٰذَا فَیُعْطٰی هٰذَا مِنْ حَسَنَاتِهٖ وَ هٰذَا مِنْ حَسَنَاتِهٖ فَاِنْ فَنِیَتْ حَسَنَاتُهٗ قَبْلَ اَنْ یُّقْضٰی مَا عَلَیْهِ، اُخِذَ مِنْ خَطَایَاهُمْ فَطُرِحَتْ عَلَیْهِ ثُمَّ طُرِحَ فِی النَّارِ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کیا تم جانتے ہو کہ مفلس کون ہے؟'' لوگوں نے عرض کیا کہ ہم میں مفلس وہ ہے جس کے پاس نہ درہم ہو اور نہ مال واسباب۔ آپؐ نے فرمایا: ''میری امت میں اصلی مفلس وہ ہے جو قیامت کے روز اس حال میں حاضر ہو کہ اس کے پاس نماز، روزہ اور زکوٰۃ سب ہو مگر وہ کسی کو گالی دے کر آیا ہو، کسی کو بہتان لگا کر، کسی کا مال کھا کر، کسی کا خون بہا کر اور کسی کو پیٹ کر آیا ہو۔ پھر اس کی ایک ایک نیکی مظلوموں میں بانٹ دی جائے اس سے قبل کہ جو بدلہ اسے چکانا ہے وہ چکایا جائے۔ اگر اس کی نیکیاں ختم ہو جائیں تو مظلوموں کی خطائیں اس کے حساب میں ڈال دی جائیں اور پھر وہ آتش دوزخ میں پھینک دیا جائے۔''

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اصلی مفلس وہ نہیں ہے جس کے پاس یہاں مال ومتاع نہ ہو بلکہ اصلی مفلس وہ شخص ہے جو آخرت میں مفلس قرار پائے۔ اس نے اگر دنیا میں نیکیاں کی بھی ہوں تو وہ اس کے مظالم کی وجہ سے اس سے چھین کر ان مظلوموں میں بانٹ دی جائیں جن پر اس نے ظلم کیے تھے اور پھر بھی اگر حساب بے باق نہ ہو تو مظلوموں کے گناہ اور ان کی خطائیں اس کے حساب میں ڈال دی جائیں اور اس کے پاس کچھ بھی نہ ہو جو اسے آتش دوزخ سے بچا سکے۔

لعنت وملامت

⟨۱⟩ عَنْ عَآئِشَةَؓ قَالَتْ: مَرَّ النَّبِیُّ ﷺ بِاَبِیْ بَکْرٍ وَ ھُوَ یَلْعَنُ بَعْضَ رَقِیْقِهٖ فَالْتَفَتَ اِلَیْهِ فَقَالَ: لَعَّانِیْنَ وَ صِدِّیْقِیْنَ! کَلَّا، وَ رَبِّ الْکَعْبَةِ۔ فَاَعْتَقَ اَبُوْبَکْرٍ یَوْمَئِذٍ بَعْضَ رَقِیْقِهٖ ثُمَّ جَآءَ اِلَی النَّبِیِّ ﷺ فَقَالَ لَآ اَعُوْدُ۔ (البیہقی فی شعب الایمان)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ حضرت ابوبکرؓ کے پاس سے گزرے۔ اس وقت حضرت ابوبکرؓ اپنے کسی غلام پر لعنت کر رہے تھے۔ آپؐ ان کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: ''لعنت کرنے والے اور صدیقین! رب کعبہ کی قسم، ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا۔'' یہ سن کر حضرت ابوبکرؓ نے (اپنی تقصیر کے کفّارہ کے طور پر) اس روز اپنے بعض غلاموں کو آزاد کر دیا اور پھر (معذرت خواہی کے لیے) نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ میں آئندہ کبھی ایسا ہرگز نہیں کروں گا۔''

تشریح: ''لعنت کرنے والے اور صدیقین'' یعنی یہ کیا دیکھ رہا ہوں؟ جو صدیقیت کے مقام پر فائز ہو۔ کیا اس کی زبان پر لعنت کے کلمات کبھی آسکتے ہیں؟ یہ ہرگز نہیں ہوسکتا کہ دونوں باتیں جمع ہوں کوئی صدیقی بھی ہو اور لعنت کرنے والا بھی ہو۔ مطلب یہ ہے کہ اے ابوبکرؓ! تم تو صدیق ہو، پھر یہ کیا کر رہے ہو کہ اپنے غلام پر لعنت کر رہے ہو؟ صدیق کو تو ایسا نہیں ہونا چاہیے۔

یہ حدیث بتاتی ہے کہ آں حضرت (ﷺ) کی نگاہ میں حضرت ابوبکرؓ کو صدیقیت کا مقام حاصل تھا جو نبوّت کے بعد سب سے اعلیٰ اور بلند مقام ہے۔

حضرت صدیق اکبرؓ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرتے ہیں کہ آپ (ﷺ) آیندہ مجھے کسی کو لعن طعن کرتے ہوئے نہیں دیکھیں گے۔

﴿۲﴾ وَ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: لَا یَنْبَغِیْ لِصِدِّیْقٍ اَنْ یَّكُوْنَ لَعَّانًا۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''صدیق کو زیب نہیں دیتا کہ وہ بہت زیادہ لعنت کرنے والا ہو۔''

تشریح: متن میں لفظ لعّان آیا ہے جس کے معنیٰ ہیں بہت لعنت کرنے والا۔ جس کی عادت ہی لعنت کرنے کی ہو۔ صدیق بھی مبالغہ کا صیغہ ہے۔ اس کے معنی ہوتے ہیں بہت ہی سچا۔ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص صدق اور راستی کے وصف سے متصف ہو اور جس کو نبوّت سے قریبی نسبت حاصل ہو چکی ہو اس کے شایانِ شان یہ بات نہیں ہوسکتی کہ وہ دوسروں پر لعنت کرتا پھرے۔ لعنت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم کسی کو خدا کی رحمت اور بارگاہ خداوندی سے محروم اور دور قرار دے رہے ہیں جب کہ انبیاء علیہم السّلام اور ان کے سچے پیروؤں کی سرگرمیوں کا مقصد کچھ اور ہی ہوتا ہے۔ وہ تو مخلوقِ خدا کو خدا کی رحمت سے قریب کرنے کے لیے اپنی ساری کوششیں صرف کر دیتے ہیں۔

﴿۳﴾ وَ عَنْ اَبِی الدَّرْدَآءِؓ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ یَقُوْلُ: اِنَّ اللَّعَّانِیْنَ لَا یَكُوْنُوْنَ شُهَدَآءَ وَلَا شُفَعَآءَ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابودرداءؓ کا بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: ''بہت زیادہ لعنت کرنے والے قیامت کے روز نہ گواہ ہوں گے اور نہ شفاعت کر سکیں گے۔''

تشریح: یعنی ایسے لوگ جن کا وتیرہ ہی لعن طعن کرنا ہے انھیں قیامت کے روز یہ اعزاز حاصل نہ ہوگا کہ وہ کسی کی شفاعت کرسکیں یا انھیں اس روز گواہ بننے کی سعادت حاصل ہوسکے۔ حالاں کہ امت مسلمہ کو خدا نے شہداء علی الناس کے امتیازی خطاب سے نوازا ہے۔ لیکن جن لوگوں کا شیوہ لعن طعن کرنا ہے، وہ اس شرف و مجد سے اس روز محروم ہوں گے۔

﴿۴﴾ وَ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ: قِیْلَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، ادْعُ عَلَی الْمُشْرِكِیْنَ۔ قَالَ: اِنِّیْ لَمْ اُبْعَثْ لَعَّانًا، وَ اِنَّمَا بُعِثْتُ رَحْمَةً۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ عرض کیا گیا کہ اے اللہ کے رسولؐ، مشرکوں پر بددعا کیجیے۔ آپؐ نے فرمایا: ”میں لعنت کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا گیا ہوں۔ بل کہ میں تو محض رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں۔“

تشریح: یعنی میری بعثت کی اصل غرض و غایت تو یہ ہے کہ میں خدا کی نازل کردہ ہدایت اور اخلاقی قوت کے ذریعہ سے لوگوں کو خدا کی رحمت سے ہم کنار کروں۔ پھر میں کسی پر لعنت کیسے کرسکتا ہوں، میں تو نافرمانوں کے لیے بھی حتی الوسع ہدایت کی دعا ہی کروں گا۔

قرآن مجید میں ہے: وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ۔ (الانبیاء۲۱:۱۰۷)

﴿۵﴾ وَ عَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: اِذَا قَالَ الرَّجُلُ: ”هَلَكَ النَّاسُ“ فَهُوَ اَهْلَكُهُمْ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جب کوئی شخص یہ کہے کہ لوگ ہلاک ہوئے تو وہ خود سب سے بڑھ کر ہلاک ہونے والا ہے۔“

تشریح: یعنی جو شخص یہ کہتا ہے کہ لوگ ہلاک ہوئے اور اس کے اس کہنے کے پیچھے کوئی ہم دردی و غم خواری کا جذبہ نہیں پایا جاتا اور نہ اس کی یہ کوئی تمنا ہی ہوتی ہے کہ لوگ تباہی و ہلاکت کے راستہ کے بجائے فلاح اور بھلائی کے راستہ پر گام زن ہوں بل کہ یہ بات وہ اپنی عیب جوئی کی خوئے بد کی وجہ سے اور لوگوں کی تحقیر کی غرض سے کہتا ہے اور اس کا اصل محرک محض غرورِ نفس ہوتا ہے۔ تو ایسی صورت میں وہ اپنے لیے سب سے بڑھ کر ہلاکت کا سامان کررہا ہوتا ہے۔ گرچہ اسے اس کی مطلق خبر نہیں ہوتی۔

عربی متن میں اَهْلَكُهُمْ کے بہ جائے اگر اَهْلَكَهُمْ پڑھا جائے جیسا کہ بعض روایتوں میں نقل ہوا ہے، تو اس صورت میں ترجمہ یہ ہوگا کہ اس طرح کہنے والا انھیں (یعنی لوگوں کو) ہلاک

کر دیتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ اس طرح کہہ کر کہ ''لوگ ہلاک و برباد ہو گئے'' لوگوں میں یاس و ناامیدی کی فضا پیدا کرتا ہے۔ اور انھیں بے شوق اور بے حوصلہ بناتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگ اپنی ہدایت اور فلاح کی طرف سے مایوس ہو کر معصیت اور برائیوں میں اور زیادہ مبتلا ہو جائیں گے اور فکر آخرت سے بالکل کنارہ کش ہو جائیں گے۔ لہٰذا جو شخص بھی لوگوں کے بارے میں اس طرح کی حوصلہ شکن اور مایوسانہ باتیں کہتا ہے وہ لوگوں کا دوست اور خیر خواہ نہیں ہو سکتا بلکہ وہ ان کو ہلاکت میں ڈالنے کا سب سے بڑا موجب خود بن رہا ہوتا ہے۔

﴿۶﴾ وَ عَنْ ثَابِتِ بْنِ الضَّحَّاکِ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ: لَعْنُ الْمُؤْمِنِ کَقَتْلِهٖ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت ثابت بن ضحاکؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''کسی مومن پر لعنت کرنا ایسا ہی ہے جیسے اس کو قتل کر دینا۔''

تشریح: یعنی کسی مومن شخص پر لعنت کرنا ایک طرح سے اسے موت کے گھاٹ اتارنا ہے۔ کسی پر لعنت کرنے کا مطلب یہ ہوتا ہے لعنت کرنے والا اسے خدا کی رحمتوں اور قربتوں سے دور، بارگاہ رب العزت سے اسے محروم ٹھیراتا ہے۔ کسی مومن کے لیے اس سے بڑھ کر دوسری موت کیا ہو سکتی ہے کہ وہ خدا کی نگاہ سے گر جائے اور اس کی رحمت کے بجائے اس کے قہر و غضب کا مستحق قرار پائے۔ اہل کفر تو بغیر قتل کے ہی مرے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ زندگی کے حقیقی مفہوم سے نا آشنا زندگی گزارتے ہیں۔ اس کے برعکس مومن کو حقیقی زندگی حاصل ہوتی ہے۔ وہ خدا اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان رکھتا ہے۔ خدا سے اس کا زندہ تعلق ہوتا ہے۔ وہ اس کی قربتوں کا حق دار ہوتا ہے۔ اب اگر کوئی اس پر لعنت کرتا ہے تو اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہوگا کہ وہ اسے اس زندگی سے محروم کر رہا ہے جو تعلق باللہ اور خدا کی خاصی رحمت کے سبب سے دنیا میں صرف مومن کو حاصل ہوتی ہے۔

﴿۷﴾ وَ عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ خَطَبَنَا النَّبِیُّ ﷺ فَقَالَ: تَصَدَّقْنَ یَا مَعْشَرَ النِّسَآءِ فَاِنَّکُنَّ اَکْثَرُ اَهْلِ جَهَنَّمَ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ۔ فَقَامَتِ امْرَأَةٌ لَیْسَتْ مِنْ عِلْیَةِ النِّسَآءِ، فَقَالَتْ: لِمَ نَحْنُ اَکْثَرُ اَهْلِ جَهَنَّمَ؟ فَقَالَ: لِاَنَّکُنَّ تُکْثِرْنَ اللَّعْنَ وَ تَکْفُرْنَ الْعَشِیْرَ۔

(احمد)

ترجمہ: حضرت ابن مسعودؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے ہمیں خطاب فرمایا، اس میں

عورتوں سے آپؐ نے فرمایا: ”اے عورتو، تم صدقہ کرو، کیوں کہ قیامت کے روز اہلِ جہنم میں تمھاری اکثریت ہوگی۔“ اس پر ایک عورت جو اونچے مرتبہ کی نہ تھی۔ (عام عورتوں میں سے تھی) کھڑی ہوگئی اور اس نے عرض کیا کہ اہل جہنم میں ہم عورتوں کی اکثریت کس وجہ سے ہوگی؟ آپؐ نے فرمایا: ”اس لیے کہ عورتیں زیادہ لعن وطعن کرتی ہیں اور اپنے شوہروں کی ناشکری کرتی ہیں۔“

تشریح: یعنی اس لیے کہ عورتوں میں یہ کم زوری بالعموم دیکھنے میں آتی ہے کہ دوسروں پر نکتہ چینی اور عیب جوئی ان کی دل چسپی کا خاص مشغلہ ہوتا ہے۔ پھر وہ عام طور پر اپنے شوہروں کی بھی ناشکری کرتی رہتی ہیں۔ ذرا بھی ان کے مزاج کے خلاف کوئی بات ہوئی کہ وہ شوہر کے تمام احسانات کو یکسر فراموش کر بیٹھتی ہیں کہ میں بڑی بدنصیب تھی جو تمھارے ہاتھ پڑی۔

بدکلامی

〈۱〉 عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ مَسْعُوْدٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم: سِبَابُ الْمُسْلِمِ فُسُوْقٌ وَّ قِتَالُہٗ کُفْرٌ۔ (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”مسلمان سے بدزبانی سے پیش آنا فسق اور اس سے جنگ کرنی کفر ہے۔“

تشریح: یعنی کسی مسلمان سے بدزبانی سے پیش آنا اور اسے گالی دینا فاسقوں کا کام ہے۔ یہ کسی مومن شخص کو زیب نہیں دیتا کہ وہ اپنے بھائی کو گالیوں سے نوازے۔ مسلمان سے لڑنا اور ناحق اس کا خون بہانا بھی انتہائی سنگین جرم ہے۔ یہ کام مومن کا نہیں، کفار کا ہے کہ کسی مسلمان کے قتل پر آمادہ ہوجائے۔

〈۲〉 وَ عَنْ اَبِیْ ذَرٍّؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم: مَنْ دَعَا رَجُلاً بِالْکُفْرِ اَوْ قَالَ: عُدُوَّ اللّٰہِ، وَ لَیْسَ کَذَالِکَ اِلَّا حَارَ عَلَیْہِ۔ (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جو شخص کسی کو کافر کہہ کر پکارے یا اسے دشمنِ خدا کہے اور وہ شخص واقعتاً ایسا نہ ہو تو اس کا کہا ہوا خود اسی پر لوٹ پڑتا ہے۔“

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جو شخص کسی کو کافر کہہ کر پکارتا ہے یا اسے دشمنِ خدا کے نام سے یاد کرتا ہے وہ اپنے لیے بہت بڑا خطرہ مول لے رہا ہے۔ اس لیے کہ فی الواقع اگر وہ شخص

کافر اور دشمن خدا نہیں ہے تو اسے اس طرح کا برا لقب دینے والا خود خدا کی نگاہ میں کافر اور دشمنِ حق قرار پائے گا۔

﴿۳﴾ وَ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: مِنَ الْكَبَآئِرِ شَتْمُ الرَّجُلِ وَالِدَيْهِ. قَالُوْا: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! وَ هَلْ يَشْتِمُ الرَّجُلُ وَالِدَيْهِ؟ قَالَ: نَعَمْ، يَسُبُّ الرَّجُلُ اَبَا الرَّجُلِ فَيَسُبُّ اَبَاهُ وَ يَسُبُّ اُمَّهٗ فَيَسُبُّ اُمَّهٗ. (مسلم)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ''اپنے والدین کو گالی دینا کبیرہ گناہوں میں سے ہے۔'' لوگوں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ، کیا کوئی شخص اپنے والدین کو بھی گالی دیتا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''ہاں، ایک شخص دوسرے کے باپ کو گالی دیتا ہے جواب میں وہ اس کے باپ کو گالی دیتا ہے۔ اور یہ اس کی ماں کو گالی دیتا ہے تو وہ جواب میں اس کی ماں کو گالی دیتا ہے۔''

تشریح: یعنی جس نے گالی دینے میں پہل کی اس نے دوسرے کے لیے اس کا موقع فراہم کر دیا کہ وہ اس کے والدین کو گالیاں دے۔ گویا دوسرے نے نہیں بل کہ اس نے خود اپنے ماں باپ کو گالی دی۔ حقیقت یہ ہے کہ جو شخص بھی کسی کام کا سبب بنتا ہے وہی اس کا ذمہ دار قرار پائے گا۔ جس فعل کا انجام خود اپنے حق میں برا ہو، اس سے اجتناب لازم ہے۔ کسی ایسے شخص کے ہاتھ ہتھیار اور اسلحہ فروخت کرنے کی اجازت کیسے دی جاسکتی ہے جو ڈاکے ڈالتا ہے۔

﴿۴﴾ وَ عَنْ عَآئِشَةَؓ قَالَتْ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اِنَّ شَرَّ النَّاسِ عِنْدَ اللّٰهِ مَنْزِلَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ مَنْ تَرَكَهُ النَّاسُ اِتِّقَآءَ شَرِّهٖ. وَ فِيْ رِوَايَةٍ "اِتِّقَآءَ فُحْشِهٖ." (بخاری)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ کا ارشاد ہے: ''قیامت کے روز درجہ کے اعتبار سے بدترین انسان وہ ہوگا جس کو لوگ اس کی برائی کی وجہ سے چھوڑ دیں۔'' ایک روایت میں ہے کہ ''جس کی فحش کلامی کے ڈر سے لوگ اس سے دور دور رہیں۔''

تشریح: یہ ایک طویل حدیث کا اہم حصہ ہے۔ یہ کون پسند کرسکتا ہے کہ قیامت کے روز جب کہ لوگوں کی قسمتوں کا آخری فیصلہ ہوگا، اس روز خلقِ خدا میں وہ بدترین انسان قرار پائے۔ اس حدیث میں ان لوگوں کے لیے سخت انتباہ ہے جن کے شر سے مخلوق خدا پناہ مانگتی اور ان سے

علیحدگی اختیار کرلیتی ہو۔ اسی طرح ایسے لوگوں کے لیے بھی اس میں انتباہ ہے جن کی فحش گوئی اور بدزبانی سے عاجز آکر لوگ ان سے دور ہی رہنا پسند کرتے ہوں۔

﴿۵﴾ وَ عَنْ اَبِی الدَّرْدَآءِؓ عَنِ النَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: اِنَّ اَثْقَلَ شَیْءٍ یُّوْضَعُ فِیْ مِیْزَانِ الْمُؤْمِنِ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ خُلُقٌ حَسَنٌ وَّ اِنَّ اللّٰهَ یُبْغِضُ الْفَاحِشَ الْبَذِیَّ۔ (ترمذی، ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت ابودرداءؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قیامت کے روز مومن کی میزان میں رکھی جانے والی سب سے زیادہ وزنی چیز حسنِ اخلاق ہوگا۔ اور اللہ کو اس شخص سے نفرت اور دشمنی ہے جو بے حیائی کی باتیں زبان سے نکالتا اور بیہودہ گو ہو۔''

تشریح: انسان کے مطلوبہ اوصاف میں اصل اور بنیادی وصف حسنِ اخلاق ہے۔ باقی چیزیں درحقیقت اسی سے تعلق رکھتی ہیں۔ حسنِ اخلاق کی آفاقیت اور اس کی وسعتوں کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مثال کے ذریعہ سے یہ واضح فرمایا ہے کہ حسنِ اخلاق سے عاری انسان کی کیا حالت ہوتی ہے۔ اور ایسے شخص کی بدبختیاں اور محرومیاں حساس طبیعتوں کو کس قدر لرزا دینے والی ہوسکتی ہیں۔

حسنِ اخلاق سے محروم شخص صرف بدزبان اور بیہودہ گو ہی نہیں ہوتا، اس کی کارستانیوں کی تفصیل بہت طویل ہوسکتی ہے۔ اس کی گھناونی حرکتیں صرف ان دو برائیوں تک محدود نہیں رہتیں جن کا ذکر اس حدیث میں کیا گیا ہے۔ یہاں جیسا کہ عرض کیا گیا بہ طور مثال حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی دو۲ ایسی برائیوں کا ذکر کیا ہے جن کی قباحتوں کے سمجھنے میں کسی بھی شخص کو دشواری پیش نہیں آسکتی۔

﴿۶﴾ وَ عَنْ اَبِیْ اُمَامَةَؓ عَنِ النَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: اَلْحَیَآءُ وَالْعِیُّ شُعْبَتَانِ مِنَ الْاِیْمَانِ وَالْبَذَآءُ وَالْبَیَانُ شُعْبَتَانِ مِنَ النِّفَاقِ۔ (ترمذی)

ترجمہ: حضرت ابوامامہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''شرم و کم سخنی اور جھجک ایمان کے دو شعبے ہیں اور بدزبانی و بیہودہ گوئی اور چرب زبانی ولفّاظی نفاق کے دو شعبے ہیں۔''

تشریح: مومن میں حیا بھی ہوتی ہے اور خدا کا ڈر بھی ہوتا ہے اسے اپنے ایک ایک جملے کے بارے میں یہ اندیشہ لگا رہتا ہے کہ کہیں خدا کے یہاں اس پر اس کی گرفت نہ ہوجائے۔ اس کی

گفتگو میں تصنع نام کو نہیں ہوتا۔ اس کی بات چیت میں سادگی اور بے تکلفی کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ اس کے کلام میں تیزی وطراری نہیں ہوتی۔ وہ جو کچھ کہتا ہے، ذمّہ داری کے ساتھ کہتا ہے۔ لیکن منافق کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ نہ اس میں حیا ہوتی ہے، نہ کوئی جھجک۔ اگر اسے موقع مل جائے تو نہایت بے باکی کے ساتھ بڑھ چڑھ کر بولنے میں اسے کوئی باک نہ ہوگا۔

ترکِ ملاقات

﴿۱﴾ عَنْ اَبِیْ اَیُّوْبَ الْاَنْصَارِیِّ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: لَا یَحِلُّ لِرَجُلٍ اَنْ یَّھْجُرَ اَخَاہُ فَوْقَ ثَلٰثَ لَیَالٍ یَلْتَقِیَانِ فَیُعْرِضُ ھٰذَا وَ یُعْرِضُ ھٰذَا وَ خَیْرُھُمَا الَّذِیْ یَبْدَأُ بِالسَّلَامِ۔ (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت ابوایوب انصاریؓ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: ''کسی شخص کے لیے جائز نہیں کہ وہ تین روز سے زیادہ اپنے بھائی سے ملنا جلنا چھوڑ رکھے۔ اور صورت یہ ہو کہ وہ کبھی ایک دوسرے کے سامنے آ بھی جائیں تو ایک اپنا منہ دوسری طرف پھیر لے اور دوسرا بھی اپنا منہ کسی اور طرف کر لے۔ اور ان دونوں میں بہتر شخص وہ ہے جو سلام میں پہل کرے۔''

تشریح: انسان کی طبیعت میں غیرت وغضب اور حمیت کا جو مادہ پایا جاتا ہے وہ بہ ہر صورت اپنا اثر دکھاتا ہے۔ اسی لیے تین روز کی رعایت رکھی گئی ہے۔ تاکہ انسان اپنے جذبات پر قابو پا سکے یا کم سے کم بھائی سے ناراضی اور خفگی کے جذبات ہلکے پڑ جائیں اور صلح صفائی کی صورت پیدا ہو سکے۔ البتہ اگر ملاقات میں کسی بڑے مفسدہ اور خرابی کا اندیشہ پایا جاتا ہو یا یہ کنارہ کشی عظیم دینی مصالح کی وجہ سے ہو تو اہلِ علم کے نزدیک ترک ملاقات کی مدّت طویل بھی ہو سکتی ہے اور کوئی شرعی قباحت اس میں مانع نہ ہوگی۔

آپؐ فرماتے ہیں کہ دونوں میں بہتر وہ ہے جو سلام میں پہل کرے۔ ایک دوسری حدیث میں ہے: اَلْبَادِیُٔ بِالسَّلَامِ بَرِیٌٔ مِنَ الْکِبْرِ (بیہقی فی شعب الایمان) ''سلام میں پہل کرنے والا غرور اور کبر سے پاک ہوتا ہے۔'' جس نے سلام میں پہل کی اور اس طرح خفگی دور کرنے کے لیے صلح وصفائی کی کوشش کی اس نے اپنے اس عمل سے کشادہ دلی کا ثبوت دیا۔ جو دل کشادہ اور فراخ ہو اس دل میں کبر وغرور کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔

﴿۲﴾ وَ عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ قَالَ: لَا یَحِلُّ لِمُسْلِمٍ اَنْ یَّھْجُرَ

اَخَاهُ فَوْقَ ثَلٰثٍ، فَمَنْ هَجَرَ فَوْقَ ثَلٰثٍ فَمَاتَ دَخَلَ النَّارَ۔ (احمد، ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کسی مسلم کے لیے یہ بات جائز نہیں کہ وہ اپنے بھائی کو تین روز سے زیادہ چھوڑے رکھے۔ لہٰذا جس کسی نے تین روز سے زیادہ (اپنے بھائی کو) چھوڑے رکھا اور اس عرصہ میں مر گیا تو وہ دوزخ میں داخل ہوا۔''

تشریح: ترک تعلق کی پالیسی اختیار کرنی عام معنی میں صرف بداخلاقی نہیں ہے بل کہ یہ اسلامی اجتماعیت کی روح کے سراسر منافی بھی ہے۔ اس لیے اس جرم کو نہایت سنگین قرار دیا گیا ہے۔ اپنے بھائی سے ترک تعلق کر کے آدمی معاشرہ میں ایک ایسی غلط مثال قائم کرتا ہے جو اجتماعیت کی بنیاد کو ڈھانے والی ہوتی ہے۔ حالاں کہ ہم کو اپنی زندگی میں ایسی عملی مثالیں پیش کرنی چاہئیں جن سے اجتماعیت کو استحکام حاصل ہو سکے۔

پھر ترک تعلق کے سبب سے آدمی اپنے بھائی کے وہ حقوق ادا کرنے سے قاصر رہتا ہے جو اس پر عائد ہوتے ہیں اور اس طرح خود اسے بھی اپنے بھائی سے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔

کائنات کا نظام جس قانون کے تحت چل رہا ہے اس میں کسی طرح کی تنگ نظری اور تنگ دامانی نہیں پائی جاتی۔ اگر خدا کی رحمت وسیع نہ ہو تو ہمارا وجود ہی قائم نہیں رہ سکتا۔ اب یہ بہت بڑا ظلم ہوگا کہ جس قانون کے سبب سے ہمارا وجود باقی ہے ہم اسی قانون کی خلاف ورزی کرنے لگ جائیں۔ ہم اسی شاخ کو کاٹنے لگیں جس پر ہم خود بیٹھے ہوئے ہوں۔ ہم اپنے خدا سے جس فیاضی اور عفو و درگزر کی توقع رکھتے ہیں اس کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ ہم لوگوں کی ان توقعات کو مجروح نہ ہونے دیں جو توقعات انھیں فطری طور پر ہم سے ہوتی ہیں۔

جھگڑالو ذہنیت

﴿۱﴾ عَنْ عَآئِشَةَؓ تَرْفَعُهُ قَالَ: اَبْغَضُ الرِّجَالِ اِلَى اللّٰهِ الْاَلَدُّ الْخَصِمُ۔ (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے مرفوعاً روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ''اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ مبغوض شخص وہ ہے جو ضدی قسم کا جھگڑالو ہو۔''

تشریح: ایسا شخص کسی بھی سماج اور معاشرہ کے لیے ایک مصیبت ہوتا ہے جس کو بس جھگڑا کرنے ہی میں لطف آتا ہو۔ اور جو ہر وقت لوگوں سے جھگڑنے کے لیے آمادہ رہتا ہو۔ جھگڑالو ذہنیت رکھنے والا شخص کبھی چین سے نہیں بیٹھ سکتا۔ وہ ہر وقت اپنا ذہنی توازن کھوئے ہی رہتا ہے۔

ایسے شخص سے کسی بھلائی کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ ایسا کم ظرف شخص خدا کی نگاہ میں سب سے زیادہ مبغوض ہوتا ہے۔

﴿۲﴾ وَ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم كَفٰى بِكَ اِثْمًا اَنْ لَّا تَزَالَ مُخَاصِمًا۔ (ترمذی)

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”تیرے لیے یہی گناہ کافی ہے کہ تو ہمیشہ جھگڑتا ہی رہے۔“

تشریح: یعنی آدمی کے گنہ گار ہونے کے لیے اتنی سی بات کافی ہے کہ وہ ذہن کا جھگڑالو ہو اور لوگوں سے ہمیشہ لڑتا جھگڑتا رہتا ہو۔ ایسا شخص خواہ کسی اور گناہ میں ملوث ہو یا نہ ہو، خدا کی نگاہ میں اس کے گنہ گار قرار پانے کے لیے یہی ایک برائی بہت ہے کہ وہ جھگڑالو قسم کا آدمی ہے۔

﴿۳﴾ وَ عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم: اِنَّ اللّٰهَ يَرْضٰى لَكُمْ ثَلاَثًا وَّ يَكْرَهُ لَكُمْ، وَ يُرْوٰى "وَ يَسْخَطُ لَكُمْ" ثَلاَثًا: فَرَضِيَ لَكُمْ اَنْ تَعْبُدُوْهُ وَلاَ تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّ اَنْ تَعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلاَ تَفَرَّقُوْا وَ اَنْ تُنَاصِحُوْا مَنْ وَّلاَّهُ اللّٰهُ اَمْرَكُمْ وَ يَكْرَهُ لَكُمْ قِيْلَ وَ قَالَ وَ كَثْرَةَ السُّوَالِ وَ اِضَاعَةَ الْمَالِ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اللہ تمھارے لیے تین باتوں کو پسند فرماتا ہے اور تین کو ناپسند کرتا ہے۔“ ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ وہ تین باتوں کی وجہ سے تم پر غضب ناک ہوتا ہے۔ اس نے جو چیزیں تمھارے لیے پسند فرمائی ہیں وہ یہ ہیں کہ تم اسی کی بندگی اختیار کرو اور اس کے ساتھ کسی بھی چیز کو شریک نہ قرار دو اور یہ کہ تم سب مل کر اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے تھام لو اور تفرقہ میں نہ پڑو۔ اور یہ کہ اس کی خیر خواہی کرو جس کو خدا نے تم پر حاکم بنایا ہو۔ اور اس نے تمھارے لیے جو چیزیں ناپسند کی ہیں وہ یہ ہیں: قیل و قال، کثرتِ سوال اور اضاعتِ مال۔“

تشریح: اسلامی نظامِ حکومت کی یہ نمایاں خصوصیت ہے کہ اس میں امیر و مامور کے باہمی رشتہ کو محض ظاہری ضابطہ ہی کی حد تک مطلوب قرار نہیں دیا گیا ہے بل کہ یہ لازم ٹھہرایا گیا ہے کہ ان کی تعلق کی اصل بنیاد نصح و خیر خواہی اور محبت ہو۔ کیوں کہ اس کے بغیر خوش گوار نتائج کی توقع نہیں کی

جاسکتی۔ امیر کو اپنے مامورین کا خیر خواہ ہونا چاہیے اور مامورین کو چاہیے کہ وہ اپنے امیر کے خیر خواہ ہوں۔ لیکن امیر کی پوزیشن چوں کہ نہایت نازک ہوتی ہے۔ اس لیے وہ اس کا سب سے زیادہ مستحق ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ تعاون کیا جائے اور اس کے ساتھ معاملہ ہمیشہ خیر خواہی کا ہو۔

اس حدیث میں جن تین ناپسندیدہ باتوں کا ذکر فرمایا گیا ہے ان میں پہلی چیز کا تعلق آدمی کے فکر اور اس کی ذہنی کیفیت سے ہے۔ دوسری چیز کا تعلق بہ راہ راست آدمی کے اخلاق اور اس کی سیرت سے ہے۔ اور تیسری چیز اس بات سے تعلق رکھتی ہے کہ آدمی اپنی عملی زندگی ذمہ دارانہ گزارتا ہے یا نہیں۔ یہ تین باتیں ہم قافیہ بیان ہوئی ہیں۔ اس لیے ان کو آسانی کے ساتھ یاد رکھا جاسکتا ہے۔

پہلی چیز جو اللہ کو ناپسند ہے وہ ہے قیل وقال یعنی لاحاصل باتیں اور بے معنی بحث مباحثہ، کسی بات میں کھود کرید، بے جا بحث مباحثہ اور حجت بازی سخت ناپسندیدہ چیز ہے۔ یہ بگڑے ہوئے ذہن کی علامت ہے۔ ایسا شخص جو قیل وقال کا دل دادہ ہوتا ہے اسے بس اسی میں دل چسپی ہوتی ہے۔ طول طویل گفتگو، لایعنی نکتہ آفرینی، ہر بات میں کیڑے نکالنا ہی اس کا محبوب مشغلہ بن جاتا ہے۔ اس کی قوت وتوانائی کا بڑا حصہ قیل وقال کی نذر ہوکر رہ جاتا ہے۔ اس کے یہاں غور وفکر اور گہرے سوچ بچار اور سمع وطاعت کا جذبہ اور صلاحیت مجروح ہوکر رہ جاتی ہے۔ اس میں ایک طرح کا کبر بھی پیدا ہوجاتا ہے۔ وہ ہر بات میں عیب ڈھونڈ نکالنے ہی کو اپنی فتح مندی تصور کرتا ہے۔

ایسا شخص سماج کے لیے بھی مضر ہوتا ہے۔ کتنے ہی لوگ اس کی باتوں کے فریب میں آجاتے ہیں۔ اور وہی بے اعتدالی ان کے اندر بھی سرایت کر جاتی ہے۔ وہ ان کا ذوق ومزاج بھی بگاڑ کر رکھ دیتا ہے۔ ایک بڑا نقصان اس سے یہ ہوتا ہے کہ آدمی دین کی اصل لذّت وکیفیت سے محروم ہوجاتا ہے۔ دین قیل وقال اور لایعنی مناظرہ بازی میں نہیں ہوتا۔ دین تو دل کے بہترین احساسات اور مخلصانہ طاعت کا نام ہے۔ بے جا قیل وقال دل کو تباہ کر کے چھوڑتا ہے۔ امت کے بہترین لوگ وہ تھے جو خدا اور اس کے رسول (ﷺ) کے ہر حکم پر لبیک کہتے اور جی جان سے اسے اختیار کرتے تھے۔ انھوں نے حق اور صداقت کو کاغذ کے اوراق سے زیادہ کتاب زندگی کے لیے صفحات میں محفوظ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ حق نہ تو ان کے علم سے دور رہا اور نہ اس سے

ان کی زندگی بے گانہ رہی۔حق کی پاسبانی ان کی نگاہوں اوران کے ذوق ومزاج نے کی اوران کی پوری زندگی حق کی پاسباں ثابت ہوئی۔

صحابہ کرامؓ کا یہ حال تھا کہ جب ان سے کوئی سوال کیا جاتا توان کی زبان پر یہی فقرہ آتا کہ اللہ ورسولہ اعلم، ''اللہ اوراس کے رسول ﷺ ہی زیادہ جانتے ہیں۔'' بعد کے دور میں قیل وقال بڑھا۔لیکن اس کے ساتھ ایک گروہ ایسا بھی موجود تھا جس نے روحِ دین کوزندہ رکھنے کی کوشش کی۔لیکن ہم اورآپ جس دور سے گزر رہے ہیں اس میں معاشرہ جس صورتِ حال سے دوچار ہے وہ آپ سے پوشیدہ نہیں ہے۔

دوسری چیز جوخدا کوناپسند ہے، وہ ہے سوال کی کثرت۔سوال کی کثرت تنگی کا سبب بنتی ہے۔سوال سے زیادہ توجہ عمل اوراپنی اصلاح کی طرف ہونی چاہیے۔خودحضور (ﷺ) نے بے جا سوالات کرنے سے روکا تھا اورفرمایا تھا کہ جوکچھ کہا جائے اس پرعمل کرو،سوال کرکر کے دین میں تنگی پیدا نہ کرو۔سوال کرنے کے بعد اگر متعین جواب دے دیا گیا تو پھراس میں کسی دوسری صورت کے اختیار کرنے کی گنجائش باقی نہ رہے گی۔ بہ صورت دیگر، اگر شارع نے کسی مسئلہ میں متعین بات نہیں کی ہے تو اس میں لوگ اپنی فہم کے مطابق عمل کریں گے۔اس میں اختلاف بھی ہوگا۔لیکن یہ اختلاف دین میں کشادگی اورفراخی ثابت کرے گا۔افتراق وفتنہ کا موجب نہ ہوگا۔

دینی امورمیں بے جااورکثرت سے سوال کرنے کوجس طرح ناپسندیدہ قراردیا گیا ہے اسی طرح اس کثرتِ سوال کوبھی پسند نہیں کیا گیا جب آدمی اپنی ضرورت پوری کرنے کی غرض سے لوگوں کے سامنے اپنا دامن پھیلاتا اوراپنا دستِ سوال درازکرتا ہے۔آدمی کوحتی الامکان مانگنے سے بچنا چاہیے۔اوراگر بہ درجۂ مجبوری مدد کے لیے درخواست کرنی ہی پڑے تواس سلسلہ میں اپنے نیک اوراہلِ ایمان بھائی سے ہی درخواست کرے۔لیکن جہاں تک ممکن ہولوگوں کا احسان نہ لے۔کثرت سوال کو پیشہ بنانا توکسی موت سے کم نہیں ہے۔ جوشخص مانگنے ہی کواپنا روزگار بنالیتا ہے وہ حقیقت میں اپنے لیے فقرکا دروازہ کھولتا ہے۔

تیسری چیز جواللہ کوپسند نہیں ہے وہ ہے مال کوضائع کرنا۔یعنی اس کا خرچ کرنے میں

غیر ذمہ دارانہ روش اختیار کرنا، مال اگر غلط اور لایعنی جگہوں پر خرچ کیا گیا تو اسے اضاعتِ مال ہی کہا جائے گا۔ اسلام میں جس طرح بخل برا ہے کہ آدمی دولت کا پجاری بن کر رہ جائے اور پیسہ خرچ کرتے ہوئے اس کی روح قبض ہونے لگے اسی طرح مال کو ضائع کرنا بھی سخت جرم ہے۔ اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ حدیث میں آیا ہے کہ اگر کھانا کھاتے وقت تم میں سے کسی کا کوئی لقمہ گر جائے تو اس کو چاہیے کہ اس کو اٹھالے اور صاف کر کے کھالے، اس کو شیطان کے لیے نہ چھوڑے۔ (مسلم) اسلام کو یہ بھی گوارا نہیں کہ ایک لقمہ بھی ضائع ہو کہ اس سے شیطان کے مشن کو تقویت پہنچے۔ اسلام ایسا مزاج بناتا ہے کہ مومنین کے اندر ایک طرف یہ حوصلہ ہو کہ ضرورت پڑنے پر وہ اپنا سب کچھ راہ خدا میں لٹا دیں۔ دوسری طرف ایک پیسہ کی فضول خرچی بھی ان کے لیے ناقابلِ برداشت ہو۔ قرآن میں ہے:

اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ کَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنِ ؕ وَ کَانَ الشَّیْطٰنُ لِرَبِّهٖ کَفُوْرًا۝ (بنی اسرائیل:۲۷)

”یقیناً فضول خرچی کرنے والے شیطانوں کے بھائی ہوتے ہیں۔ اور شیطان اپنے رب کا بڑا ہی ناشکرا ہے۔“

کہاں یہ تعلیم اور کہاں مسلمانوں کا طرز عمل، دونوں میں کوئی نسبت نہیں۔ کتنی ہی رقوم غیر اسلامی تقریبات اور شادی وغیرہ کے غیر شرعی رسوم میں خرچ کی جاتی ہیں اور ہمیں اس کا احساس تک نہیں ہوتا کہ مال خدا کی امانت ہے۔ اس کے خرچ کرنے کے اگر ہم مجاز ہیں تو صحیح جگہ خرچ کرنے کے مجاز ہیں۔ اسے ضائع کرنے کا اختیار خدا نے ہمیں ہرگز نہیں عطا کیا ہے۔

فساد

〈۱〉 عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رضی اللہ عنہ عَنِ النَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: اِیَّاكُمْ وَ سُوْٓءَ ذَاتِ الْبَیْنِ فَاِنَّهَا الْحَالِقَةُ۔ (ترمذی)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”تم اپنے آپ کو دو آدمیوں کے درمیان بگاڑ پیدا کرنے سے بچاؤ، کیوں کہ یہ خصلت مونڈنے والی (یعنی دین و اخلاق کو تباہ کرنے والی) ہے۔“

تشریح: لوگوں کے درمیان فساد ڈالنے والا اپنے اس قبیح فعل سے یہ ثابت کرتا ہے وہ ابھی تک

اسلامی اخلاقیات سے بالکل ہی نا آشنا ہے۔اس کا ایمان و اسلام ابھی تک اس کے کردار اور اس کی سیرت میں شامل نہیں ہوسکا ہے۔آدمی کا دین اور اس کا ایمان جب تک اس کا اپنا کردار نہیں بن جاتا وہ محض رسمی اور بے جان ہوتا ہے۔روح سے خالی ایمان نہ تو دنیا میں اس کے کسی کام کا ہوتا ہے اور نہ آخرت میں وہ کسی کو خدا کی گرفت سے بچا سکتا ہے۔یہ ایک حقیقت ہے کہ لوگوں کے درمیان صلح کے بجائے فساد اور بگاڑ کو پسند کرنا آدمی کی ساری ہی نیکیوں پر پانی پھیر دیتا ہے۔

﴿۲﴾ وَ عَنْ اَبِی الدَّرْدَآءِ ؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اَلَآ اُخْبِرُکُمْ بِاَفْضَلِ مِنْ دَرَجَةِ الصِّیَامِ وَالصَّدَقَةِ وَالصَّلٰوةِ؟ قَالَ: قُلْنَا: بَلٰی۔ قَالَ: اِصْلَاحُ ذَاتِ الْبَیْنِ۔ وَ فَسَادُ ذَاتِ الْبَیْنِ هِیَ الْحَالِقَةُ۔ (ابوداؤد، ترمذی)

ترجمہ: حضرت ابو درداءؓ سے روایت ہے کہ رسول خدا ﷺ نے فرمایا: ’’کیا میں تمھیں بتاؤں کہ روزے، صدقہ اور نماز سے بھی افضل کیا چیز ہے؟‘‘ راوی کا بیان ہے کہ میں نے عرض کیا کہ کیوں نہیں، آپؐ ضرور بیان فرمائیں، آپؐ نے ارشاد فرمایا: ’’وہ ہے دو آدمیوں کے درمیان (جن میں بگاڑ پیدا ہو گیا ہو) صلح کرانا۔اور درمیان یک دیگر فساد ڈالنا وہ ہے جو مونڈ دینے والی ہے۔‘‘

تشریح: یہ حدیث اجتماعی محاسن کے باب میں ہم پہلے بھی نقل کر آئے ہیں۔ دیکھیں عنوان ’’باہم صلح کرانا۔‘‘

خلق عظیم

جاذبیت

﴿۱﴾ عَنْ سَعِيدِ الْجَرِيرِيِّ عَنْ اَبِى الطُّفَيْلِ قَالَ: رَاَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم قُلْتُ: كَيْفَ رَاَيْتَهُ؟ قَالَ: كَانَ اَبْيَضَ مَلِيْحًا اِذَا مَشٰى كَاَنَّمَا يَهْوِىْ فِىْ صُبُوْبٍ۔

(ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت سعید جریری حضرت ابوطفیلؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے۔ حضرت سعیدؒ نے کہا کہ آپ نے کیسا دیکھا؟ انھوں نے فرمایا کہ آپؐ گورے تھے، کچھ ملاحت لیے ہوئے۔ جب چلتے تو گویا نشیب میں اتر رہے ہوں۔

تشریح: ایک روایت میں ہے کہ اِذَا مَشٰى يَتَكَفَّاء (شمائل ترمذی) یعنی جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم چلتے تو آگے کو جھکے ہوئے چلتے۔ اس کے دو ترجمے اور بھی کیے جاسکتے ہیں۔ ایک یہ کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم چلتے تو تیز رفتاری کے ساتھ چلتے۔ دوسرا ترجمہ یہ ہوسکتا ہے۔ ''جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم چلتے تو قدم جما کر چلتے۔ درحقیقت یہ تینوں ہی ترجمے صحیح ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رفتار میں بھی تینوں ہی خوبیاں پائی جاتی تھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو متکبرین کی طرح سینہ تان کر چلنا پسند نہ تھا بل کہ تواضع کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم جھکے ہوئے چلتے۔ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم سست چال نہ تھے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم قوت کے ساتھ زمین سے پورا پاؤں اٹھا کر آگے رکھتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پاؤں زمین سے گھسیٹتے ہوئے نہیں چلتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی چال ہی سے ہر شخص یہ سمجھ سکتا تھا کہ یہ کوئی ذمّہ دار اور مہذب شخص گزر رہا ہے۔ یہ نہ تو بے خبر اور غیر ذمّہ دار ہوسکتا ہے۔ اور نہ یہ متکبر اور مغرور ہوسکتا ہے۔

روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں اِذَا مَشٰی کَاَنَّہٗ یَتَوَکَّاءُ ’’جب چلتے تو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا آگے جھکے جاتے ہیں۔‘‘

﴿۲﴾ عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِکٍ قَالَ: کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ لَیْسَ بِالطَّوِیْلِ الْبَآئِنِ وَلَا بِالْقَصِیْرِ وَلَا بِالْاَبْیَضِ الْاَمْھَقِ وَ لَیْسَ بِالْاٰدَمِ۔ وَ لَیْسَ بِالْجَعْدِ الْقَطَطِ وَلَا بِالسَّبِطِ۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نہ تو بہت لمبے قد کے تھے اور نہ پستہ قد تھے۔ اور نہ تو بالکل سفید تھے اور نہ بالکل گندم گوں۔ سر کے بال نہ تو زیادہ بل کھائے ہوئے ہوتے تھے اور نہ بالکل سیدھے۔‘‘

تشریح: یعنی نبی کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے کمال باطنی کے ساتھ جمال و کمال ظاہری سے بھی نوازا تھا۔ قد آپ ﷺ کا درمیانہ تھا لیکن مجلسوں میں آپ ﷺ ہی نمایاں نظر آتے۔ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کا چہرہ نہ لمبوترا تھا اور نہ بہت زیادہ گول تھا۔ بل کہ دونوں کے درمیان تھا۔ بال نہ بالکل پیچ دار اور گھنگھریالے تھے اور نہ بالکل سیدھے تھے بل کہ کسی قدر بل کھائے ہوئے تھے۔ آپ موٹے بدن کے نہ تھے۔ آنکھیں سرمگیں اور پلکیں دراز تھیں۔ آپ ﷺ کا وقار ایسا تھا کہ جو کوئی اچانک آپ ﷺ کو دیکھتا تو مرعوب ہوجاتا، اس پر ایک ہیبت سی طاری ہوجاتی تھی۔ لیکن آپ ﷺ سے قریب ہوکر آدمی آپ ﷺ کا گرویدہ ہوکر رہ جاتا تھا۔

﴿۳﴾ وَ عَنِ الْبَرَآءِؓ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ اَحْسَنَ النَّاسِ وَجْھًا وَ اَحْسَنَہٗ خَلْقًا، لَیْسَ بِالطَّوِیْلِ الْبَآئِنِ وَلَا بِالْقَصِیْرِ۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت براءؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ سب لوگوں سے زیادہ خوب صورت اور ڈیل ڈول میں سب سے بہتر تھے۔ آپؐ نہ بہت دراز قامت تھے اور نہ پستہ قد تھے۔‘‘

آواز اور اندازِ تکلم

﴿۱﴾ عَنِ الْبَرَآءِ قَالَ: سَمِعْتُ النَّبِیَّ ﷺ یَقْرَأُ فِی الْعِشَآءِ ’’وَالتِّیْنِ وَالزَّیْتُوْنِ‘‘ فَمَا سَمِعْتُ اَحَدًا اَحْسَنَ صَوْتًا اَوْ قِرَآءَۃً مِّنْہُ۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت براءؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے نبی ﷺ کو عشاء میں سورۂ والتین والزیتون پڑھتے ہوئے سنا۔ میں نے کسی کو بھی آپؐ سے زیادہ خوش آواز یا بہتر قرأت والا نہیں سنا۔

﴿۲﴾ وَ عَنْ اَنَسٍؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ اِذَا سَلَّمَ سَلَّمَ ثَلاَ ثًا وَ اِذَا تَکَلَّمَ بِکَلِمَةٍ اَعَادَهَا ثَلاَ ثًا۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب سلام کرتے تو تین بار کرتے اور جب کوئی بات کہتے تو تین بار کہتے۔"

تشریح: یعنی ضرورت محسوس کرتے تو بات کو تین بار دہراتے اور تینوں طرف توجہ فرماتے تاکہ سننے والے اچھی طرح بات کو سمجھ لیں۔ اور اگر سمجھتے کہ دوبار کہنا کافی ہے تو دو مرتبہ ہی فرماتے۔

﴿۳﴾ وَ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَؓ قَالَ: قِیْلَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، اُدْعُ عَلَی الْمُشْرِکِیْنَ۔ قَالَ: اِنِّیْ لَمْ اُبْعَثْ لَعَّانًا وَ اِنَّمَا بُعِثْتُ رَحْمَةً۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آپؐ سے عرض کیا گیا کہ اے اللہ کے رسولؐ، مشرکین کے حق میں بددعا فرمائیے۔ آپؐ نے فرمایا: "مجھے لعنت کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا گیا ہے۔ بل کہ مجھے تو رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے۔"

تشریح: یعنی میں وہ کام کیوں کروں جو میری بعثت کا اصل مقصد نہیں ہے۔ آپ ﷺ بددعا سے احتراز فرماتے تھے۔ کیوں کہ یہ آپ ﷺ کے شایانِ شان نہ تھا کہ آپ ﷺ لوگوں کو بددعائیں دیتے اور ان پر لعنت بھیجتے۔

﴿۴﴾ وَ عَنْ عَآئِشَةَ قَالَتْ: اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ لَمْ یَکُنْ یَسْرُدُ الْحَدِیْثَ کَسَرْدِکُمْ، کَانَ یُحَدِّثُ حَدِیْثًا لَوْ عَدَّهُ الْعَادُّ لَاَحْصَاهُ۔ (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ لگاتار بے تکان بات نہیں کرتے تھے جس طرح تم لوگ مسلسل اور بے تکان بولے چلے جاتے ہو۔ آپؐ اس طرح ٹھہر ٹھہر کر بات کرتے کہ کوئی گننے والا آپؐ کے جملوں کو گننا چاہتا تو گن سکتا تھا۔"

تشریح: یعنی ایسا نہیں ہوتا تھا کہ آپ ﷺ بے تکان بولتے چلے جائیں کہ لوگوں میں

اکتاہٹ پیدا ہو جائے۔ پھر آپ ﷺ تیز رفتاری سے بات نہیں کرتے تھے کہ مخاطبین کچھ سمجھ سکیں اور کچھ ان کی سمجھ میں آنے سے رہ ہی جائے۔ آپ ﷺ نہایت اطمینان کے ساتھ گفتگو فرماتے تھے۔ گفتگو آپ ﷺ کی نہایت واضح اور صاف ہوا کرتی تھی کہ آپ ﷺ کے مخاطبین کو اس کے سمجھنے میں ذرا بھی دشواری پیش نہیں آسکتی تھی۔ آپ ﷺ کی گفتگو لغویات اور فضولیات سے پاک ہوتی تھی اور اس میں اس طرح کی کوتاہیاں ہرگز نہیں پائی جاتی تھیں جو عام طور پر لوگوں کی گفتگوؤں میں پائی جاتی ہیں۔ آپ ﷺ کا انداز تکلم آپ ﷺ کی عظمت اور آپ ﷺ کی باوقار شخصیت کا بین ثبوت ہوا کرتا تھا۔

ابو داؤد کی ایک روایت میں ہے: كَانَ كَلَامُ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ كَلَامًا فَصْلًا يَّفْهَمُهٗ كُلُّ مَنْ سَمِعَهٗ ''رسول خدا ﷺ کی گفتگو میں ہر مضمون صاف اور دوسرے سے ممتاز ہوتا تھا کہ ہر سننے والا اسے سمجھ لیتا تھا۔''

﴿۵﴾ وَ عَنْ اَنَسٍ قَالَ: لَمْ يَكُنْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فَاحِشًا وَّلَا لَعَّانًا وَّلَا سَبَّابًا، كَانَ يَقُوْلُ عِنْدَ الْمَعْتِبَةِ: مَالَهٗ؟ تَرِبَ جَبِيْنُهٗ. (بخاری)

ترجمہ: حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نہ تو فحش گو تھے، نہ لعنت کرنے والے تھے اور نہ بدکلام تھے۔ جب کسی پر آپؐ کو غصّہ آتا تو بس اتنا فرماتے: ''کیا ہوا اسے، خاک آلود ہو اس کی پیشانی۔''

تشریح: معلوم کہ آپ ﷺ فحش گو نہ تھے یعنی آپ ﷺ ہمیشہ مہذب الفاظ ہی استعمال فرماتے تھے۔ آپ ﷺ کی عادت لعنت کرنے کی بھی نہ تھی۔ لعن کے لغوی معنی ہیں ہانک دینا، محروم کر دینا، ذلیل کرنا، لعنت کی نسبت جب خدا کی طرف ہوتی ہے تو اس کا مفہوم ہوتا ہے ''خدا کا اپنے قرب سے دور اور اپنی رحمتوں سے محروم کر دینا'' اور جب اس لفظ کی نسبت کسی بندے کی جانب ہو تو اس سے مراد ہے برا کہنا اور رحمت خداوندی سے دوری و محرومی کی بددعا دینا۔ یہی وجہ ہے کہ کسی ایسے شخص پر لعنت کرنا جو لعنت کا سزاوار نہ ہو، سخت گناہ کی بات ہے۔

''خاک آلود ہو اس کی پیشانی'' یہ فقرہ کسی سے سخت ناراضی اور غصّہ کی حالت میں آپ ﷺ کی زبان سے ادا ہوتا تھا۔ پھر آپ ﷺ اس میں بہ راہ راست اس شخص کو خطاب نہ

کر کے غائب کا صیغہ استعمال فرماتے۔ مثلاً آپؐ فرماتے خاک آلود ہواس کی ناک'' یا'' خاک آلود ہواس کی پیشانی'' ان جملوں میں دو معنی کا احتمال بھی ہے۔ ان کو ذلت وخواری اور نگوں ساری سے کنایہ کہہ سکتے ہیں۔ لیکن ان کو سجدہ ریزی سے بھی کنایہ کہا جا سکتا ہے۔ اس صورت میں ان جملوں کا مفہوم ہوگا سَجِدَ اللّٰہُ وَجْھَکَ '' خدا تیرے چہرے کو اپنے حضور سجدہ ریز ہونے کی توفیق بخشے'' گویا عین غصّہ کی حالت میں بھی آپ ﷺ کی زبان مبارک سے دعائیہ کلمات ہی نکلتے تھے۔

﴿۶﴾ وَ عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ سَلَامٍؓ عَنْ اَبِیْہِ قَالَ: کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ اِذَا جَلَسَ یَتَحَدَّثُ یُکْثِرُ اَنْ یَّرْفَعَ طَرْفَہٗ اِلَی السَّمَآءِ۔ (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن سلامؓ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب گفتگو کرنے بیٹھتے تو اکثر آپؐ کی نگاہ آسمان کی طرف اٹھتی رہتی۔''

تشریح: یعنی خدا کی عظمت اور بزرگی کے احساس کی ہمیشہ آپ ﷺ تجدید فرماتے رہتے۔ روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ جب آپ ﷺ آسمان کی طرف نظر اٹھاتے تو فرماتے:

یَا مُصَرِّفَ الْقُلُوْبِ ثَبِّتْ قَلْبِیْ عَلٰی طَاعَتِکَ '' اے دلوں کے پھیرنے والے، میرے دل کو اپنی طاعت پر قائم رکھ۔''

آسمان کی طرف نگاہ اٹھانے کی ایک وجہ یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ آپ ﷺ کو یہ خیال ہوتا کہ شاید حضرت جبریلؑ وحی لے کر آتے ہوں۔

﴿۷﴾ وَ عَنْ عَآئِشَۃَؓ قَالَتْ: لَمْ یَکُنْ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ فَاحِشًا وَّلَا مُتَفَحِّشًا وَّلَا سَخَّابًا فِی الْاَسْوَاقِ وَلَا یَجْزِیْ بِالسَّیِّئَۃِ السَّیِّئَۃَ وَ لٰکِنْ یَعْفُوْ وَ یَصْفَحُ۔ (ترمذی)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ'' رسول اللہ ﷺ نہ تو فحش گو تھے اور نہ بہ تکلف فحش گوئی کرتے تھے۔ اور نہ بازاروں میں شور مچاتے تھے اور نہ برائی کا بدلہ برائی سے لیتے تھے بل کہ معاف کر دیتے اور درگزر سے کام لیتے تھے۔''

تشریح: صحیح بخاری میں ہے مَا انْتَقَمَ رَسُوْلُ اللّٰہِ لِنَفْسِہٖ فِیْ شَیْءٍ قَطُّ۔'' اللہ کے رسول ﷺ نے

اپنی ذات کے لیے کبھی کسی بات میں انتقام نہیں لیا۔" مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ نے اپنی ذاتی تکلیف کا کسی سے انتقام نہیں لیا۔ فتح مکہ کے موقع پر آپ ﷺ نے اپنی جان کے دشمنوں کو بے تکلف معاف فرما دیا۔ حالاں کہ اگر آپ ﷺ چاہتے تو اپنے ایک ایک دشمن سے پورا بدلہ لے سکتے تھے۔ البتہ قانون شریعت کی خلاف ورزی کی جاتی تو اسے آپ ﷺ ہرگز برداشت نہ کرتے تھے۔ ایک موقع پر فرمایا: "بہ خدا اگر فاطمہ بنت محمد ﷺ سے بھی چوری کا ارتکاب ہوتو میں اس کے ہاتھ بھی کاٹ دوں گا۔"

تبسم

〈۱〉 عَنْ عَآئِشَةَ ؓ قَالَتْ: مَا رَاَیْتُ النَّبِیَّ ﷺ مُسْتَجْمِعًا قَطُّ ضَاحِكًا حَتّٰی اَرٰی مِنْهُ لَهَوَاتِهٖ، اِنَّمَا کَانَ یَتَبَسَّمُ۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ "میں نے نبی ﷺ کو کبھی اس طرح ہنستے نہیں دیکھا کہ آپؐ کا سارا منہ کھل گیا ہو اور مجھے آپؐ کے حلق کا کوّا نظر آ گیا ہو۔ آپؐ کی ہنسی بس مسکراہٹ تک ہی محدود تھی۔"

تشریح: یعنی آپ ﷺ عام لوگوں کی طرح زور سے قہقہہ لگا کر نہیں ہنستے تھے کہ پورا منھ کھل جائے اور اندر کے مسوڑھے اور حلق کا کوّا تک دکھائی دینے لگے۔ خوشی اور مسرت کے مواقع پر آپ ﷺ صرف مسکرا دینے ہی پر اکتفا کرتے تھے۔ کبھی کبھی اگر ہنستے بھی تو آپ ﷺ کی ہنسی ہلکی ہی ہوتی تھی۔

〈۲〉 وَ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ الْحَارِثِ بْنِ جَزْءٍ ؓ قَالَ: مَا رَاَیْتُ اَحَدًا اَکْثَرَ تَبَسُّمًا مِّنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ۔ (ترمذی)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن حارث بن جزءؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے زیادہ کسی اور کو مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ خشک مزاج نہ تھے کہ ہمہ وقت منھ بسورے اور اپنے آپ پر غم طاری کیے رہتے۔ اس صورت میں تو لوگ آپ ﷺ کے قریب آنے سے گھبراتے اور آپ ﷺ سے دور رہنے ہی کو ترجیح دیتے۔ آپ ﷺ کی شخصیت میں تو وہ جاذبیت تھی کہ جو شخص

آپ ﷺ کے قریب ہوتا وہ آپ ﷺ کا گرویدہ ہوکر رہ جاتا۔ آپ ﷺ کے صحابہؓ آپ ﷺ کو اکثر مسکراتے ہوئے ہی دیکھتے تھے۔

خاموشی

〈ا〉 عَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَؓ قَالَ: كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ طَوِيْلَ الصَّمْتِ۔ (شرح السنہ)

ترجمہ: حضرت جابر بن سمرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ زیادہ تر خاموش رہتے تھے۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ خاموشی اور کم گوئی آپ ﷺ کا نمایاں وصف تھا۔ بلا ضرورت کبھی آپ ﷺ گفتگو نہیں فرماتے تھے۔ جب کوئی ضروری بات کرنی ہوتی تو بولتے تھے ورنہ خاموش رہتے تھے۔ دوسروں کے لیے بھی آپ ﷺ کی تاکید یہی تھی: مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَلْيَقُلْ خَيْرًا اَوْ لِيَصْمُتْ (بخاری) "جو شخص اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتا ہو اسے چاہیے کہ یا تو اچھی بات زبان سے نکالے ورنہ خاموش رہے۔"

ورع

〈ا〉 عَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِيَّ ﷺ وَجَدَ تَمْرَةً فِي الطَّرِيْقِ، فَقَالَ: لَوْلَآ اَنِّيْ اَخَافُ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الصَّدَقَةِ لَاَكَلْتُهَا۔ (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ کو راستہ میں ایک کھجور (پڑی ہوئی) ملی تو آپؐ نے فرمایا: "اگر مجھے اس کا خوف نہ ہوتا کہ کہیں یہ صدقہ کی نہ ہو تو میں اس کو کھا لیتا۔"

تشریح: یعنی مجھے اس کا اندیشہ ہے کہ کہیں یہ کھجور صدقہ کے کھجوروں میں سے نہ ہو جو لے جاتے ہوئے کسی سے گر گئی ہو۔ اس لیے اس کا کھانا میرے لیے درست نہیں ہے۔ ورنہ اس کو اٹھا کر کھا لینے میں کوئی قباحت نہ تھی۔ ضروری نہیں کہ یہ کھجور صدقہ ہی کی ہو لیکن چوں کہ اس کے صدقہ کی کھجور ہونے کا امکان پایا جاتا ہے اس لیے احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ میں اسے نہ کھاؤں۔

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر کوئی ایسی معمولی چیز راستہ میں گری ہوئی ملے جس کے گرنے کا اس کے مالک کو کوئی غم نہیں ہوتا اور نہ کسی کے اس کو اٹھا لینے پر اسے اعتراض ہوتا ہے تو اس کو اٹھا لینے اور اپنے کام میں لانے میں کوئی گناہ نہیں۔

آرزو

〈۱〉 عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَؓ قَالَ: قَدِمَ طُفَیْلُ بْنُ عَمْرٍوؓ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ فَقَالَ: یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ، اِنَّ دَوْسًا قَدْ عَصَتْ وَ اَبَتْ۔ فَادْعُ اللّٰہَ عَلَیْھَا۔ فَظَنَّ النَّاسُ اَنَّہٗ یَدْعُوْ عَلَیْھِمْ، فَقَالَ: اَللّٰھُمَّ اھْدِ دَوْسًا وَأْتِ بِھِمْ۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ طفیل بن عمروؓ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یارسول اللہ قبیلۂ دوس نے نافرمانی کی اور انکار کیا، اس لیے آپؐ ان کے حق میں بددعا کیجیے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ آپؐ ان لوگوں کے حق میں بددعا کریں گے لیکن آپؐ نے فرمایا: ''خدایا، دوس کو ہدایت دے اور ان کو (میرے پاس) لادے۔''

تشریح: یعنی خدایا، تجھ سے یہ دعا ہے کہ قبیلۂ دوس کے لوگوں کو ہدایت نصیب ہو۔ اور وہ خدا کے وفادار مسلم بن جائیں اور میری نافرمانی ترک کردیں۔

نبیوں کی سب سے بڑی آرزو یہی ہوتی ہے کہ بھٹکے ہوئے لوگ راہ راست پر آجائیں۔ اور ہدایت کی دولت ان کے حصے میں آجائے جو زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ ہے۔ بندگان خدا کی خیرخواہی کا جذبہ نبیوں اور پیغمبروں کے دلوں میں بہ درجہ اتم موجود ہوتا ہے۔ اور درحقیقت یہ خدا کی محبت ہی کا ایک تقاضا ہوتا ہے کہ اس کے بندوں سے بھی ہمیں گہرا تعلق ہو۔ ان سے محبت کریں اور ان کی خیرخواہی سے کبھی غافل نہ ہوں۔

فضول باتوں سے پرہیز

〈۱〉 عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ اَبِیْ اَوْفٰیؓ قَالَ: کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ یُکْثِرُ الذِّکْرَ وَ یُقِلُّ اللَّغْوَ وَ یُطِیْلُ الصَّلٰوۃَ وَ یُقَصِّرُ الْخُطْبَۃَ وَلَا یَأْنِفُ اَنْ یَّمْشِیَ مَعَ الْاَرْمِلَۃِ وَالْمِسْکِیْنِ فَیَقْضِیَ لَہُ الْحَاجَۃَ۔ (النسائی، الدارمی)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن اوفیؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ذکر زیادہ کرتے۔ لغو اور فضول باتیں نہ کرتے۔ نماز کو طویل اور خطبہ کو مختصر کرتے اور بیوہ و مسکین کے ساتھ چلنے میں نہ عار محسوس فرماتے اور اس کی ضرورت پوری کردیتے تھے۔''

تشریح: ذکر سے مراد اللہ کا ذکر اور ہر وہ بات جس کا تعلق اللہ کی یاد سے ہو۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ نبی ﷺ مختلف انداز و اسلوب میں ہر وقت خدا کی یاد میں مشغول رہتے آپ ﷺ کا کوئی لمحہ خدا کی یاد سے خالی نہ گزرتا۔

''لغو اور فضول باتیں نہ کرتے۔'' اصل میں یُقِلُّ اللَّغْوَ آیا ہے۔ عربی میں قلیل کا لفظ مطلق نفی کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے مثلاً قرآن میں ہے: قَلِیْلاً مَّا یُؤْمِنُوْنَ ''وہ بالکل ایمان نہیں رکھتے۔''

بعض شارحین نے یُقِلُّ اللَّغْوَ کا ترجمہ کیا ہے: ''آپ ﷺ لغو باتیں بہت کم کرتے تھے۔'' لغو باتوں سے ان کے نزدیک وہ باتیں مراد ہیں جو دنیاوی امور سے تعلق رکھتی ہوں۔ دنیاوی امور سے تعلق رکھنے والی ضروری باتوں کو لغو تو نہیں کہا جاسکتا لیکن ذکر الٰہی کے مقابلہ مجازاً انھیں لغو کہا گیا ہے۔ ورنہ حضور ﷺ کی زبان مبارک سے کبھی لغویات کا صدور نہیں ہوا۔ خود آپ ﷺ کے پیروؤں تک کا وصف قرآن یہ بیان کرتا ہے وَالَّذِیْنَ ھُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ''جو لغو باتوں سے اعراض کرتے ہیں۔'' پھر حضور ﷺ کے بارے میں کوئی شخص لغویات کا تصوّر کیوں کر کرسکتا ہے۔

آپؐ کا اخلاق

(۱) عَنِ الْبَرَآءِؓ یَقُوْلُ: کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ اَحْسَنَ النَّاسِ وَجْھًا وَ اَحْسَنَہٗ خُلُقًا لَیْسَ بِالطَّوِیْلِ الْبَآئِنِ وَلاَ بِالْقَصِیْرِ۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت براءؓ کہتے ہیں کہ رسالت مآب ﷺ سب سے زیادہ خوب صورت اور سب سے بڑھ کر خلیق تھے۔ نہ تو آپؐ بہت لمبے قد کے تھے اور نہ آپؐ پستہ قد تھے۔

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو ظاہری اور باطنی دونوں ہی خوبیوں سے نوازا تھا۔ شکل وصورت کے لحاظ سے ہی آپ ﷺ حسین وجمیل شخص نہ تھے بل کہ اس کے ساتھ ہی حسنِ اخلاق کے لحاظ سے بھی آپ ﷺ نہایت بلند مرتبہ پر فائز تھے قرآن مجید میں بھی

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے: وَ اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیۡمٍ ﴿۶۸:۴﴾ ''اور یقیناً (اے نبی) تم ایک عظیم اخلاق پر فائز ہو۔''

﴿۲﴾ عَنۡ عَآئِشَۃَؓ قَالَتۡ: کَانَ خُلُقُ نَبِیِّ اللّٰہِ الۡقُرۡاٰنَ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ ''اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اخلاق قرآن تھا۔''

تشریح: نبی صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کے مطلوب انسان کا نمونۂ کامل تھے۔ قرآن میں جو اعلیٰ اخلاقی تعلیمات موجود ہیں ان کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کردار میں محسوس شکل میں دیکھا جاسکتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم درحقیقت قرآن کی تعلیمات کا ایک زندہ اور کامل نمونہ تھے۔ قرآن کی شکل میں نہ صرف یہ کہ خدا کی ہدایات قیامت تک کے لیے محفوظ ہوگئی ہیں۔ بل کہ اسی کے ساتھ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک بھی اس کتاب کے ذریعہ سے قیامت تک کے لیے محفوظ ہوگئی۔ سیرت کی دیگر کتابیں اگر گم بھی ہوجائیں جب بھی ہم اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کردار و اخلاق کی تصویر قرآن میں دیکھ سکتے ہیں۔

ادراک ونظر

﴿۱﴾ عَنۡ عَآئِشَۃَؓ قَالَتۡ: کَانَ النَّبِیُّ صلی اللہ علیہ وسلم یَذۡکُرُ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ اَحۡیَانِہٖ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ بیان فرماتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کو ہر وقت یاد کرتے تھے۔

تشریح: یعنی خدا سے ہر وقت اور ہر حال میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنا تعلق قائم رکھتے تھے۔ خدا کو ہر لمحہ یاد رکھنا انسان کے لیے ضروری ہے۔ کیوں کہ یہ اس کی روحانی غذا ہی نہیں، اس کی قوت کا اصل سرچشمہ بھی ہے۔

انسان ایک حساس اور متحرک ہستی ہے۔ انسان کی حیثیت حارث و ہمّام کی ہے، کھانا، حرکت وعمل اور ارادہ کرنا اس کا لازمی وصف ہے۔ ممکن نہیں کہ انسان کبھی ارادہ سے خالی ہو۔ اس لیے انسان کے لیے ضروری ہے کہ اس کا کوئی مقصود ومحبوب ہو جو اس کی محبتوں اور ارادوں کا مرکز ہو۔ انسان کے لیے سب سے بڑھ کر شرف کی بات یہ ہے کہ اس کا اصل مقصود

خدا ہوا گر وہ خدا سے غافل ہوتا ہے تو لازماً وہ کسی اور کا گرفتار ہو کر رہے گا۔ اور عزت وشرف کے مقام بلند سے گر جائے گا۔

﴿۲﴾ وَ عَنْ عَآئِشَةَؓ قُلْتُ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، اَتَنَامُ قَبْلَ اَنْ تُوْتِرَ؟ فَقَالَ: يَا عَآئِشَةُ، اِنَّ عَيْنَيَّ تَنَامَانِ وَلاَ يَنَامُ قَلْبِيْ۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ میں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ کیا آپؐ وتر ادا کرنے سے پہلے سوجاتے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: ''اے عائشہؓ، میری آنکھیں سوتی ہیں لیکن قلب میرا نہیں سوتا۔''

تشریح: یعنی سونے کی حالت میں بھی آپ ﷺ پر غفلت طاری نہ ہوتی تھی۔ آپ ﷺ کی روح سونے کی حالت میں بھی بے دار ہی رہتی تھی۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ ﷺ کے قلب مبارک پر غلبہ مادیت کا نہیں، روحانیت کا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ دل کا چراغ حالت خواب میں بھی روشن رہتا تھا۔

﴿۳﴾ وَ عَنْ جُنْدُبِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اِنِّیْ اَبْرَأُ اِلَی اللّٰهِ اَنْ يَّكُوْنَ لِیْ مِنْكُمْ خَلِيْلٌ فَاِنَّ اللّٰهَ قَدِ اتَّخَذَنِیْ خَلِيْلاً كَمَا اتَّخَذَ اِبْرَاهِيْمَ خَلِيْلاً۔

ترجمہ: حضرت جندب بن عبداللہ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ''مجھے خدا کے روبرو یہ تسلیم نہیں کہ تم میں سے کوئی میرا خلیل ہو۔ کیوں کہ خدا نے مجھے اپنا خلیل بنالیا ہے جیسے اس نے ابراہیمؑ کو اپنا خلیل بنایا تھا۔''

تشریح: خدا کے ساتھ بندے کی انتہا درجہ کی محبت خلت کہلاتی ہے۔ اسی طرح خدا کی بندے کے ساتھ کامل محبت کو بھی خلت کہتے ہیں۔ یہ محبت درحقیقت خدا کی ربوبیت کا تقاضا ہوتی ہے۔

آپؐ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ جب خدا نے مجھے اپنا خلیل بنایا ہے تو وہی میرا بھی خلیل ہے۔ میرے دل پر حقیقت میں اسی کا قبضہ ہے۔ میں اس کے سامنے بچھ گیا ہوں اور اس میں بالکل کھو گیا ہوں۔ اس کی محبت نے میرے دل میں گھر کرلیا ہے۔

ایسی انتہائی محبت صرف ایک ہی کے لیے ہوسکتی ہے۔ خلت ناقابل شرکت ہوا کرتی ہے۔ شاعر کا شعر ہے:

قَدْ تَخَلَّلْتَ مَسْلَکَ الرُّوْحِ مِنِّیْ وَ بِذَا سُمِّیَ الْخَلِیْلُ خَلِیْلاً

''میری محبوبہ مرے اندر روح کی طرح سرایت کیے ہوئے ہے۔ اسی وجہ سے خلیل کو خلیل کہتے ہیں۔''

﴿۴﴾ وَ عَنِ الْمُغِیْرَةَ بْنِ شُعْبَةَؓ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ صَلّٰی حَتّٰی انْتَفَخَتْ قَدَمَاهُ فَقِیْلَ لَهٗ: اَتَکَلَّفُ هٰذَا وَ قَدْ غَفَرَ لَکَ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِکَ وَمَا تَأَخَّرَ؟ قَالَ: اَفَلاَ اَکُوْنَ عَبْدًا شَکُوْرًا۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت مغیرہ بن شعبہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے نماز پڑھی یہاں تک کہ آپؐ کے پاؤں میں ورم آگئے۔ آپؐ سے کہا گیا کہ آپؐ اتنی تکلیف کیوں اٹھاتے ہیں جب کہ آپؐ کے اگلے اور پچھلے سب گناہ بخش دیے گئے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: ''کیا میں اللہ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں!۔''

تشریح: ''آپؐ کے اگلے اور پچھلے سب گناہ بخش دیے گئے ہیں'' یہ اشارہ قرآن کے اس بیان کی طرف ہے: اِنَّا فَتَحْنَا لَکَ فَتْحًا مُّبِیْنًاۙ لِّیَغْفِرَ لَکَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِکَ وَمَا تَاَخَّرَ وَ یُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَیْکَ وَ یَهْدِیَکَ صِرَاطًا مُّسْتَقِیْمًاۙ (الفتح: ۱-۲) ''(اے نبی) یقیناً ہم نے تمھیں ایک کھلی فتح دی، تاکہ اللہ تمھارے اگلے اور پچھلے گناہوں کو بخش دے اور تم پر اپنی نعمت کی تکمیل کرے۔ اور تمھیں سیدھے راستے پر چلائے۔''

''میں خدا کا شکر گزار بندہ نہ بنوں'' یعنی عبادت کا مقصد صرف ایک یہی تو نہیں ہے کہ ہمارے گناہ اور خطائیں معاف ہوجائیں یا خدا کی طرف سے ہم کو کسی گرفت اور عذاب کا اندیشہ اور خوف نہ رہے۔ سجدہ گزاری اور عبادت کا ایک اہم مقصد اپنے اس رب کا شکر ادا کرنا بھی ہے جس کے ہم پر بے پایاں احسانات ہیں۔ جس نے ہمارے اگلے پچھلے سبھی گناہ معاف فرمادیے ہیں۔ اپنے رب کے احسانات کے شکر ادا کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہم شکر کے بے تابانہ جذبہ کے ساتھ اس کے آگے سجدہ ریز ہوں۔

﴿۵﴾ وَ عَنْ عَآئِشَةَؓ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ: رَکْعَتَا الْفَجْرِ خَیْرٌ مِّنَ الدُّنْیَا وَمَا فِیْهَا۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''دو۲ رکعتیں فجر کی، دنیا اور جو کچھ اس میں ہے، اس سے بہتر ہیں۔''

تشریح: ایک روایت میں ہے کہ فجر کی دو۲ رکعتوں کے بارے میں آپ ﷺ نے فرمایا: اَحَبُّ اِلَیَّ مِنَ الدُّنْیَا وَمَا فِیْھَا۔ (مسلم) ''وہ مجھے ساری دنیا اور اس کی چیزوں سے زیادہ محبوب ہیں۔'' فطری بات ہے کہ نیند سے بیدار ہونے کے بعد سب سے پہلے فکر محبوب کی ہوتی ہے اور خدا تو دنیا ومافیہا سب سے بڑھ کر محبوب ہے۔ فجر کی دو رکعتیں (سنتیں) اسی حقیقت کا اظہار ہوتی ہیں۔

﴿۶﴾ وَ عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ لَأَنْ اَقُوْلَ سُبْحَانَ اللّٰہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ وَلَآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا طَلَعَتْ عَلَیْہِ الشَّمْسُ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ''اگر میں کہوں سُبْحَانَ اللّٰہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ وَلَآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ تو یہ مجھے ان تمام چیزوں سے بڑھ کر محبوب ہے جن پر آفتاب طلوع ہوتا ہے۔''

تشریح: یعنی یہ تسبیح وتحمید اور تحلیل وتکبیر کے کلمات دنیا کی تمام ہی چیزوں سے زیادہ میرے دل کو عزیز ومحبوب ہیں۔

﴿۷﴾ وَ عَنْہُ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ یَقُوْلُ: وَاللّٰہِ اِنِّیْ لَاَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ وَ اَتُوْبُ اِلَیْہِ فِی الْیَوْمِ اَکْثَرَ مِنْ سَبْعِیْنَ مَرَّۃً۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ ''بہ خدا، میں اللہ سے دن میں ستّر بار سے زائد مغفرت طلب کرتا ہوں اور اس کے حضور توبہ کرتا ہوں۔''

تشریح: یعنی میں رب کے حضور میں بہ کثرت استغفار وتوبہ کرتا رہتا ہوں۔ میں اس کے دین کے لیے خواہ کتنا ہی کیوں نہ سرگرم رہوں، اس کی بندگی کا حق کہاں ادا ہوسکتا ہے۔ اس کی تلافی کے لیے میں استغفار اور توبہ سے کام لیتا ہوں۔ میں استغفار کرتا ہوں یہ آرزو لے کر کہ

میرا رب میری خطاؤں، کوتاہیوں اور میرے عیوب کی پردہ پوشی فرمائے، وہ مجھے اپنی رحمت سے پورے طور پر ڈھک لے۔ اس طرح میں زیادہ سے زیادہ مٹ سکوں تاکہ میرا رب زیادہ سے زیادہ نمایاں ہو سکے۔

میں اس کے حضور میں بہ کثرت توبہ کرتا رہتا ہوں یعنی میں بہ کثرت اپنے رب کی نوازشوں کی امید لیے ہوئے اس کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ بار بار اس کی طرف پلٹتا ہوں تاکہ اس کی مہربانیوں اور عنایتوں سے کسی لمحہ محروم نہ رہوں۔ علاوہ ازیں، میرا دل خدا کے سوا کسی دوسری چیز میں اپنے لیے قرار اور چین تلاش نہ کر سکے۔

﴿۸﴾ وَ عَنْ حُذَیْفَةَ قَالَ: کَانَ النَّبِیُّ ﷺ اِذَا حَزَبَهٗ اَمْرٌ صَلّٰی۔ (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت حذیفہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ کو جب کوئی حادثہ پیش آتا تو نماز پڑھنے لگ جاتے تھے۔"

تشریح: اس لیے کہ بندے کے لیے سب سے بڑا سہارا اس کا اپنا رب ہی ہے۔ اس کی جناب سے بہتر بندے کے لیے کوئی دوسری پناہ گاہ نہیں ہو سکتی۔

﴿۹﴾ وَ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ: قَالَ النَّبِیُّ ﷺ: اَلْجَنَّةُ اَقْرَبُ اِلٰی اَحَدِکُمْ مِّنْ شِرَاکِ نَعْلِهٖ وَالنَّارُ مِثْلُ ذٰلِکَ۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت عبداللہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: "جنت اور اسی طرح جہنم بھی، تم میں سے ہر ایک کی جوتیوں کے تسمے سے بھی زیادہ اس سے قریب ہیں۔"

تشریح: یعنی جنت اور دوزخ کو دور نہ خیال کرو۔ وہ تو تمھاری جوتیوں کے تسموں سے بھی زیادہ تم سے قریب ہیں۔ جنت کی نعمتیں اور اس کی راحتیں ہوں یا دوزخ کے مصائب اور تکالیف ان کا ہمارے اعمال وافکار سے گہرا تعلق ہے۔ ہمارے افکار و اعمال ہی ہوں گے جن کی وجہ سے ہماری زندگی جنت کی زندگی میں بدل جائے گی یا وہ دوزخ کی زندگی کی شکل اختیار کر لے گی۔ ہمارے اعمال ہم سے دور اور ہم سے الگ نہیں ہوتے۔ اعمال کے ذریعہ سے خود ہمارے اپنے وجود و شخصیت کا اظہار ہوتا ہے۔ اعمال اگر نیک اور خدا پرستی کے ہیں تو ہماری جنت ہم سے کچھ بھی دور

نہیں اور اگر اس کے برعکس ہمارے کردار واعمال اس کا ثبوت پیش کرتے ہیں کہ نعوذ باللہ، ہم اپنے رب سے بے گانہ ہیں اور وہ راہ اختیار کر رکھی ہے جو ہمارے رب کو پسند نہیں تو سمجھ لیجیے کہ جنت کے بجائے ہم دوزخ سے اپنا گہرا رشتہ اور تعلق قائم کر چکے ہیں۔

〈۱۰〉 وَ عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ نَامَ عَلٰی حَصِیْرٍ فَقَامَ وَ قَدْ اَثَّرَ فِیْ جَسَدِهٖ فَقَالَ ابْنُ مَسْعُوْدٍؓ: یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ لَوْ اَمَرْتَنَا اَنْ نَّبْسُطَ لَکَ وَ نَعْمَلَ فَقَالَ: مَالِیْ وَ لِلدُّنْیَا وَمَآ اَنَا وَالدُّنْیَا اِلَّا کَرَاکِبٍ اسْتَظَلَّ تَحْتَ شَجَرَةٍ ثُمَّ رَاحَ وَ تَرَکَهَا۔ (احمد، ترمذی، ابن ماجہ)

ترجمہ: حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ بوریے پر سوئے۔ اٹھے تو آپؐ کے جسمِ مبارک پر بوریے کے نشان پڑے ہوئے تھے۔ ابن مسعودؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ، اگر آپؐ ہمیں حکم دیتے تو ہم آپؐ کے لیے فرش بچھاتے اور اچھے کپڑے کا انتظام کر دیتے۔ آپؐ نے فرمایا: ''مجھے اس دنیا سے اور اس دنیا کو مجھ سے کیا سروکار؟ میری اور اس دنیا کی مثال تو بس ایسی ہے جیسے کوئی سوار کسی درخت کے نیچے سایہ کی تلاش میں آئے اور پھر اسے چھوڑ کر چل دے۔''

تشریح: یعنی اصلاً میری رغبت اور میلان کا مرکز دنیا اور اس کا آرام نہیں ہے بل کہ میں تو آخرت کا طلب گار ہوں۔ جس طرح ایک سوار اپنا سفر طے کرتے ہوئے کسی درخت کے نیچے سایہ کے لیے اپنے گھوڑے کو روک کر پھر آگے بڑھ جاتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح میرے پیش نظر آخرت کا سفر ہے۔ پھر میں کسی ایسی چیز کو کیسے وزن دے سکتا ہوں اور اس کی طرف کیوں کر ملتفت ہو سکتا ہوں جو فکر آخرت کی طرف سے مجھے غفلت میں ڈال سکتی ہے۔

〈۱۱〉 وَ عَنْ اَنَسٍؓ قَالَ: اَصَابَنَا وَ نَحْنُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ مَطَرٌ قَالَ فَحَسَرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ ثَوْبَهٗ حَتّٰی اَصَابَهٗ مِنَ الْمَطَرِ فَقُلْنَا یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، لِمَ صَنَعْتَ هٰذَا؟ قَالَ: لِاَنَّهٗ حَدِیْثُ عَهْدٍ بِرَبِّهٖ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے کہ بارش ہونے لگی۔ حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ آپؐ نے اپنا کپڑا اتار لیا یہاں تک کہ آپؐ کے اوپر بارش

کا پانی گرنے لگا۔ ہم نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ، آپؐ نے ایسا کیوں کیا؟ آپؐ نے فرمایا: ''اس لیے کہ بارش کا یہ پانی ابھی تازہ دم اپنے رب کے پاس سے آیا ہے۔''

تشریح: ''اپنا کپڑا اتار لیا۔'' یعنی اپنے سر یا پیٹھ سے کپڑا ہٹا دیا۔

یہ حدیث بتاتی ہے کہ بندے کو اپنے رب کی عنایتوں کے سلسلہ میں کس درجہ حساس ہونا چاہیے۔ یہ ہمارے جذبۂ عبودیت کا تقاضا ہے کہ خدا کی نوازشوں کے سلسلہ میں ہمارا شعور و احساس حد درجہ تیز ہو۔ ہمارے لیے ضروری ہے کہ رب کی ہر تازہ عنایت ہمارے شعور کو احساس و ایمان کی تازگی سے بھر دے۔ اور ہماری طرف سے اس بات کا اظہار ہو کہ ہم اپنے رب کی عنایات کے حد درجہ محتاج اور ضرورت مند ہیں۔ ہم کبھی اور کسی حالت میں بھی اس کی نگاہِ کرم و بخشش سے بے نیاز ہو کر نہیں رہ سکتے۔

پانی کا جو قطرہ خدا کے منصوبہ سے مینہ کی صورت میں گرتا ہے اس کے اور خدا کے درمیان کوئی حائل نہیں ہوتا۔ گویا اس کا خدا سے براہ راست کا تعلق ہوتا ہے۔ وہ قطرۂ معصوم اپنی پاکیزگی کی حالت میں ہوتا ہے۔ خدا کے باغی اور نافرمان لوگوں کے ناپاک ہاتھ ابھی اس تک پہنچے ہوئے نہیں ہوتے۔ اس لیے پانی کے ایسے قطرے بابرکت ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کو اپنے جسم پر لینا ایک اچھے جذبہ اور ایک اچھی خواہش کا اظہار ہے۔

﴿۱۲﴾ وَ عَنْ عَآئِشَةَ ؓ قَالَتْ: مَا سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَنْسُبُ اَحَدًا اِلَّا اِلَى الدِّيْنِ۔ (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ بیان فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہؐ کو کسی شخص کا انتساب دین کے سوا کسی دوسری چیز کے ساتھ کرتے ہوئے نہیں سنا۔''

تشریح: یعنی ہر کام میں آپ ﷺ دینی جذبہ کو ملحوظ رکھتے تھے۔ آپ ﷺ کی نگاہ میں دین کی عظمت کے مقابلہ میں ہر چیز ہیچ تھی۔ چناں چہ رنگ و نسل وغیرہ کے مقابلہ میں آپ ﷺ کے یہاں ترجیح ہمیشہ دین ہی کو حاصل رہتی تھی۔ جو شخص دین میں بہتر ہوتا اسے دوسروں پر مقدم رکھتے خواہ وہ کسی بھی خاندان اور قبیلہ کا کیوں نہ ہو۔

ذوق

〈۱〉 **عَنْ عُمَرؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم لَا تَطْرُوْنِیْ كَمَا اَطْرَتِ النَّصٰرٰی ابْنَ مَرْيَمَ فَاِنَّمَا اَنَا عَبْدُهٗ فَقُوْلُوْا: "عَبْدُ اللّٰهِ وَ رَسُوْلُهٗ۔"** (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تم بڑھا چڑھا کر میری تعریف نہ کرو جیسا کہ عیسائیوں نے ابن مریم کی تعریف میں مبالغہ سے کام لیا۔ میں تو بس اللہ کا بندہ ہوں۔ پس تم مجھے اللہ کا بندہ اور اس کا رسول کہا کرو۔"

تشریح: یعنی فرقِ مراتب کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ عام طور پر لوگ اپنے بزرگوں کی تعریف و توصیف میں مبالغہ سے کام لیتے ہیں۔ چناں چہ حضرت مسیحؑ کے نام لیواؤں نے انھیں خدا کا بیٹا قرار دے لیا۔ یہود نے عزیرؑ کو ابن اللہ کہا۔ حالاں کہ خدا کی الوہیت میں کوئی بھی شریک نہیں ہوسکتا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تعریف میں مبالغہ سے کام لینے سے منع فرمایا۔ بندگی کے وصف کو رسالت کے ساتھ شامل کیا۔ کلمۂ شہادت میں عبدہٗ و رسولہٗ کے الفاظ بھی شامل ہیں تاکہ یہ احساس ہمیشہ تازہ رہے کہ رسول یا پیغمبر بھی خدا کا ایک بندہ ہی ہوتا ہے۔ اگرچہ وہ برگزیدہ اور بندۂ کامل ہوتا ہے۔ اس طرح اسلام نے شرک کی جڑ ہمیشہ کے لیے کاٹ دی ہے۔

〈۲〉 **وَ عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم لَا يُبَلِّغُنِیْ اَحَدٌ مِّنْ اَصْحَابِیْ عَنْ اَحَدٍ شَيْئًا فَاِنِّیْ اُحِبُّ اَنْ اَخْرُجَ اِلَيْكُمْ وَ اَنَا سَلِيْمُ الصَّدْرِ۔** (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "میرے صحابہؓ میں سے کوئی مجھ تک کسی شخص کے متعلق کوئی بری بات نہ پہنچائے کیوں کہ میں یہ پسند کرتا ہوں کہ جب تمھارے پاس آؤں تو میرا سینہ صاف ہو۔"

تشریح: یعنی کوئی شخص کسی کے بارے میں مجھ سے کوئی بات کہہ کر مجھے اس کے متعلق بدگمان کرنے کی کوشش نہ کرے۔ اگر کسی ساتھی کے اندر کوئی کمزوری تمھیں محسوس ہو تو ہمدردی و غم خواری کا تقاضا یہ ہوگا کہ تنہائی میں اس کو اس کی طرف توجہ دلاؤ نہ کہ برائی کو پھیلانے لگ

جاؤ۔ میں چاہتا ہوں کہ تم سے ملوں تو میرے دل میں کسی شخص کے بارے میں ناراضی وخفگی کے جذبات نہ ہوں۔

کسی کے معاملے کو آگے بڑھانے اور اس کو ذمہ داروں اور ذی اثر لوگوں کے علم میں لانے کا معاملہ سب سے آخر میں آتا ہے۔ جب اصلاح کی ساری کوششیں بے سود ثابت ہو رہی ہوں اور معاملہ بھی ایسا ہو کہ اس سے صرف نظر کرنے سے کسی بڑے فتنے اور خرابی کا اندیشہ پایا جاتا ہو۔

﴿۳﴾ وَ عَنْ عَآئِشَةَ ؓ قَالَتْ: قَالَ النَّبِیُّ ﷺ: مَا اُحِبُّ أَنِّیْ حَکَیْتُ اَحَدًا وَ أَنَّ لِیْ کَذَا وَ کَذَا۔ (ترمذی)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”میں ہرگز اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ کسی کی نقل اتاروں اگرچہ میرے لیے ایسا اور ایسا ہو۔“

تشریح: یعنی یہ مجھے ہرگز گوارا نہیں ہوسکتا کہ کسی شخص کی نقل اتاروں خواہ وہ قولی ہو یا فعلی اگرچہ اس سے کتنے ہی دنیوی یا مادی فائدے متوقع ہوں۔

اوصافِ حمیدہ

بشریت کا احساس

﴿۱﴾ عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: اَنَا بَشَرٌ، اَنْسٰی کَمَا تَنْسَوْنَ فَاِذَا نَسِیْتُ فَذَکِّرُوْنِیْ۔ (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''میں بھی ایک بشر ہوں، میں بھی بھولتا ہوں جس طرح تم لوگ بھولتے ہو۔ پس جب میں بھول جاؤں تو مجھے یاد دلا دیا کرو۔''

تشریح: ایک بار نبی ﷺ نے ظہر کی نماز میں چار رکعتوں کے بہ جائے پانچ رکعتیں ادا کیں۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ نماز میں اضافہ ہوا ہے؟ (اس لیے کہ نماز ظہر میں چار ہی رکعتیں فرض ہے) آپ ﷺ نے سہو کے دو۲ سجدے کیے اور وہ بات فرمائی جو اس حدیث میں نقل ہوئی ہے کہ میں بھی انسان ہوں، بھول سکتا ہوں۔ نسیان مقتضائے بشریت ہے۔ اگر میں کبھی بھولوں تو تم مجھے یاد دلا دو۔

﴿۲﴾ وَ عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: اَللّٰھُمَّ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ فَاَیُّمَا رَجُلٍ مِّنَ الْمُسْلِمِیْنَ سَبَبْتُہٗ اَوْ لَعَنْتُہٗ اَوْ جَلَدْتُّہٗ فَاجْعَلْھَا لَہٗ زَکٰوةً وَّ رَحْمَةً۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اے اللہ، میں بشر ہوں، پس جس مسلمان شخص کو میں برا کہوں یا لعنت کروں یا اسے ماروں تو تو اس کا تزکیہ فرما اور اس پر رحمت فرما۔''

تشریح: بشری تقاضے کے سبب سے غصہ آپ ﷺ کو بھی آتا تھا لیکن یہ کمال شفقت ہے کہ آپ ﷺ نے اللہ سے دعا فرمائی کہ اگر میں کسی مسلمان کو برا کہوں، اسے ماروں یا لعنت کروں تو اس کو اس کے حق میں رحمت کرے اور اس کا تزکیہ فرما۔

ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ فرماتے تھے: اَللّٰھُمَّ فَاَیُّمَا عَبْدٍ مُّؤْمِنٍ سَبَبْتُہٗ فَاجْعَلْ ذٰلِکَ لَہٗ قُرْبَةً اِلَیْکَ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ۔ (مسلم) ''اے اللہ میں جس بندۂ مومن کو برا کہوں تو قیامت کے روز تو اسے اس کے لیے اپنی قربت کا ذریعہ بنا۔'' ایک روایت میں ہے: فَاجْعَلْ ذٰلِکَ کَفَّارَةً لَہٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ۔ (مسلم) ''یعنی اسے اس کے لیے اس کے گناہوں کا کفارہ بنا دے۔''

﴿۳﴾ وَ عَنْ اُمِّ الْعَلاَءِ ؓ قَالَتْ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: وَمَآ اَدْرِیْ وَاللّٰہِ وَ اَنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ مَا یُفْعَلُ بِیْ۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت ام العلاءؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا: ’’بہ خدا، مجھے نہیں معلوم کہ (اللہ کے یہاں) میرے ساتھ کیا معاملہ ہوگا، حالاں کہ میں خدا کا رسول ہوں۔‘‘

تشریح: یہ ایک طویل روایت کا ایک حصہ ہے۔ حضرت عثمان بن مظعونؓ کے انتقال پر حضرت ام العلاءؓ نے ان سے خطاب کر کے کہا کہ اے ابوسائب، تم پر اللہ کی رحمت ہو، میں شہادت دیتی ہوں کہ خدا نے تمھیں نوازا ہے۔ اس پر نبی ﷺ نے فرمایا کہ یہ تمھیں کیسے معلوم ہوا کہ خدا نے انھیں نوازا ہے؟ حضرت ام العلاءؓ نے عرض کیا کہ میرے ماں باپ آپ ﷺ پر قربان ہوں، میں نہیں جانتی کہ (ان پر نوازش نہ ہوگی) تو کون ہے جس پر نوازش ہوگی۔ نبی ﷺ نے فرمایا کہ ’’عثمان تو جا چکے ہیں، ان کے بارے میں اچھی امیدیں میں بھی رکھتا ہوں۔‘‘ اور پھر آپ ﷺ نے وہ بات فرمائی جو میں نے یہاں نقل کی ہے کہ ’’بہ خدا، خود مجھے نہیں معلوم کہ میرے ساتھ کیا معاملہ پیش آئے گا جب کہ میں اللہ کا رسول ہوں۔‘‘ مطلب یہ ہے کہ خدا کے جلال اور اس کی عظمت کا تقاضا ہے کہ ہم اس سے ڈرتے رہیں اور اس کے غضب اور باز پرس کے سلسلہ میں کسی حالت میں بھی مطمئن نہ رہیں۔ ہاں، خدا سے اچھی امیدیں رکھ سکتے ہیں۔ لیکن حتمی طور پر کسی کے بارے میں کوئی بات کہنی درست نہیں ہے۔

عجز و نیاز

﴿۱﴾ عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ ؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ کَانَ یَقُوْلُ: لَآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ، اَعَزَّ جُنْدَہٗ وَ نَصَرَ عَبْدَہٗ وَ غَلَبَ الْاَحْزَابَ وَحْدَہٗ فَلاَ شَیْءَ بَعْدَہٗ۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ فرماتے تھے: ’’اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ یگانہ ہے۔ اس نے اپنے لشکر کو غلبہ عطا فرمایا اور اپنے بندے کی مدد فرمائی اور کفار کی جماعتوں کو مغلوب کیا، وہ یگانہ ہے۔ اس کے بعد کوئی شے نہیں۔‘‘

تشریح: صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ الفاظ آپ ﷺ کی زبان مبارک سے اس وقت ادا ہوئے ہوں گے جب مومنین کو اہل کفر پر غلبہ حاصل ہوا ہوگا اور کفار کو ہزیمت کے دن دیکھنے پڑے ہوں گے۔ اس فتح و کامرانی پر بجائے اس کے کہ آپ ﷺ فخر کرتے اور اسے اپنا کوئی کارنامہ سمجھتے اس کامیابی کو آپ ﷺ خدا کا فضل اور اس کا احسان قرار دیتے ہیں اور اہل ایمان کے لشکر کو اپنا لشکر قرار دینے کے

بہ جائے اسے خدا کا لشکر کہہ کر پکارتے ہیں۔ اور خود کو خدا کا ایک بندہ اور عاجز غلام سمجھتے ہیں۔

''وہ یگانہ ہے اس کے سوا کوئی شے نہیں۔'' مطلب یہ ہے کہ خدائے یگانہ کے بعد کچھ بھی نہیں بچتا کہ وہ ہماری وابستگی کا مرکز بن سکے۔ خدا کے سوا جو کچھ ہے وہ کچھ نہ ہونے کے مترادف ہے۔ یہی حقیقت قرآن نے ان الفاظ میں ظاہر کی ہے: کل شییء ھالک الا وجھه۔ ''خدا کی ذات کے سوا ہر شے فنا صفت ہے۔''

﴿۲﴾ وَ عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم يَقُوْلُ: لَنْ يُّدْخِلَ اَحَدًا عَمَلُهُ الْجَنَّةَ۔ قَالُوْا: وَلاَ اَنْتَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ : لاَ، وَلاَ اَنَا اِلاَّ اَنْ يَّتَغَمَّدَنِىَ اللّٰهُ بِفَضْلٍ وَّ رَحْمَةٍ فَسَدِّدُوْا وَ قَارِبُوْا وَلاَ يَتَمَنَّيَنَّ اَحَدُكُمُ الْمَوْتَ اِمَّا مُحْسِنًا فَلَعَلَّهُ اَنْ يَّزْدَادَ خَيْرًا وَ اِمَّا مُسِيْئًا فَلَعَلَّهُ اَنْ يَّسْتَعْتِبَ۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ''کسی شخص کو اس کا عمل جنت میں داخل نہ کرے گا'' لوگوں نے عرض کیا کہ آپ کو بھی نہیں، اے اللہ کے رسولؐ؟ فرمایا: ''نہیں، مجھے بھی نہیں، مگر یہ کہ اللہ مجھے اپنے فضل و رحمت سے ڈھک لے۔ پس تم استقامت اور راست روی اور مقاربت اختیار کرو اور تم میں سے کوئی موت کی آرزو نہ کرے۔ اس لیے کہ وہ یا تو نیکوکار ہوگا تو توقع ہے کہ وہ نیکیوں میں اضافہ کرے اور اگر وہ برا ہے تو شاید وہ (توبہ کرکے) خدا کو راضی کرے۔''

تشریح: ایک روایت میں ہے: وَاعْلَمُوْا اَنَّهٗ لَنْ يَّنْجُوَ اَحَدٌ مِنْكُمْ بِعَمَلِهٖ۔ (مسلم) جان رکھو کہ تم میں سے کوئی شخص اپنے عمل کے سبب سے نجات نہیں پائے گا۔''

قرآن میں ہے: وَ نُوْدُوْٓا اَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ٥ (الاعراف: ۴۳) ''اور انھیں آواز دی جائے گی کہ یہ جنت ہے جس کے تم وارث ہوئے ان اعمال کی بہ دولت جو تم کرتے رہے تھے۔'' قرآن اور حدیث کے بیان میں درحقیقت کوئی تضاد نہیں پایا جاتا جنت کی عظیم وراثت تو خدا کے رحم و کرم سے ہی ہاتھ آسکتی ہے۔ انسان کے اعمالِ نیک تو محض ایک بہانہ ہوں گے۔ نیک اعمال سے محض اس کی توقع قائم ہوتی ہے کہ خدا رحم فرمائے گا۔ دخولِ جنت کا اصل اور بنیادی سبب خدا کی رحمت کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس کی رحمت ساتھ نہ دے تو انسانی اعمال کی حیثیت کچھ بھی نہیں ہوسکتی۔

خدا نے کسی کو اس کی وسعت اور طاقت سے بڑھ کر مکلّف نہیں قرار دیا ہے۔ (البقرہ: ۲۳۳)

اس لیے راست روی اور استقامت اختیار کرو۔ لیکن میانہ روی اور اعتدال کو ہمیشہ ملحوظ رکھو تاکہ راہ اعتدال پر ہمیشہ قائم رہنا تمھارے لیے ممکن ہو سکے۔ اگر اپنے اوپر سختی کرتے ہو تو یہ سختی دیر تک چلنے کی نہیں۔ اس کا اندیشہ ہے کہ سرے سے عمل ہی ترک نہ ہو جائے۔ یہ بات یاد رہے: قَلِيْلٌ دَائِمٌ خَيْرٌ مِنْ كَثِيْرٍ مُنْقَطِعٍ۔ ”قلیل جو باقی رہے وہ اس کثیر سے بہتر ہے جس کا سلسلہ منقطع ہو جائے۔“

سداد کہتے ہیں استقامت واستجابت اور مقاربت اس میانہ روی کو کہتے ہیں جس میں نہ تو غلو پایا جاتا ہو اور نہ تقصیر۔

کسی شخص کو اگر نیکی کی توفیق حاصل نہیں ہو رہی ہے تب بھی اسے موت کی آرزو نہیں کرنی چاہیے۔ زندگی میں اس کا امکان ہے کہ اس کو توبہ کی توفیق حاصل ہو اور خدا کا عتاب اس سے ہٹ جائے۔

〈۳〉 وَ عَنْ عَآئِشَةَ رضی اللہ عنہا قَالَتْ: سَمِعْتُ النَّبِيَّ صلی اللہ علیہ وسلم وَ هُوَ مُسْتَنِدٌ اِلَيَّ يَقُوْلُ: اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ وَارْحَمْنِيْ وَالْحِقْنِيْ بِالرَّفِيْقِ۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس حال میں کہ آپؐ مجھ پر سہارا لگائے ہوئے تھے، یہ فرماتے ہوئے سنا: ”اے اللہ، میری مغفرت فرما اور مجھ پر رحم کر اور مجھے رفیق سے ملا دے۔“

تشریح: ساری زندگی خدا کی راہ میں سرگرم عمل رہنے کے باوجود اپنے خدا سے رحمت ومغفرت کے طالب ہیں۔ یہی عجز ونیازمندی ہے جو روحِ ایمان اور رونقِ جان ودل ہے۔

〈۴〉 وَ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم يَعْنِيْ فِي الْاِسْتِسْقَآءِ مُتَبَذِّلاً مُتَوَاضِعًا مُتَخَشِّعًا مُتَضَرِّعًا۔ (ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ)

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم استسقاء (یعنی بارش کی دعا) کے لیے نکلے۔ آپؐ کی کیفیت یہ تھی کہ زینت ترک کیے ہوئے متواضع تھے۔ عاجزی وتضرع اختیار کیے ہوئے تھے۔“

تشریح: یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ظاہری وضع سے خاکساری وتواضع عیاں تھی اور تضرع اور زاری کی کیفیت آپ کے چہرۂ مبارک سے ظاہر ہو رہی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پانی کے لیے دعا کرنے کے لیے باہر نکلے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس بات کو بہ خوبی سمجھتے تھے کہ خدا کی رحمت کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے — خواہ وہ رحمت بارش کی صورت میں ہو یا کسی اور شکل میں — ضروری ہے کہ بندہ اپنے رب کے آگے اپنے عجز واحتیاج کا اظہار کرے۔ آدمی کو یوں تو ہر وقت اور ہر حالت

میں ایک عاجز اور محتاج بندہ بن کر رہنا چاہیے لیکن مصیبت کے موقع پر تو اس کو لازماً اپنی عاجزی اور محتاجی کا پورا پورا احساس ہونا چاہیے۔ بندے کی قامت پر جو لباس راست آتا ہے وہ صرف عجز و نیاز کا لباس ہے نہ کہ کوئی اور لباس۔ خدا کا پیغمبر ہمارے اندر اسی احساس کو اپنے طرز عمل اور اپنی تعلیمات کے ذریعہ سے پیدا کرنا چاہتا ہے۔

﴿۵﴾ وَ عَنْهُ اَنَّ النَّبِیَّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ، وَ هُوَ فِی قُبَّةٍ یَوْمَ بَدْرٍ: اَللّٰهُمَّ اَنْشُدُکَ عَهْدَکَ وَ وَعْدَکَ اَللّٰهُمَّ اِنْ تَشَأْ لاَ تُعْبَدْ بَعْدَ الْیَوْمِ فَاَخَذَ اَبُوْبَکْرٍ بِیَدِهٖ فَقَالَ: حَسْبُکَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! اَلْحَحْتَ عَلٰی رَبِّکَ فَخَرَجَ وَ هُوَ یَثِبُ فِی الدِّرْعِ وَ هُوَ یَقُوْلُ: سَیُهْزَمُ الْجَمْعُ وَ یُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جنگ بدر کے موقع پر ایک خیمہ میں یہ دعا مانگ رہے تھے: "اے اللہ، میں تجھ سے تیری امان کی درخواست کرتا ہوں اور تیرے وعدہ کا ایفاء چاہتا ہوں۔ اے اللہ، اگر تو یہی چاہتا ہے (کہ مسلمان ہلاک ہوجائیں) تو آج کے بعد پھر تیری عبادت نہ ہوگی۔" اس پر ابوبکرؓ نے آپؐ کا ہاتھ پکڑ لیا اور عرض کیا کہ "یا رسول اللہ، بس اتنا کافی ہے۔ آپؐ نے بہت الحاح وزاری کے ساتھ اپنے رب سے التجا کی ہے۔" اس کے بعد آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم زرہ پہنے ہوئے تیزی سے باہر آئے۔ اور یہ آیت آپؐ پڑھ رہے تھے: "سَیُهْزَمُ الْجَمْعُ وَ یُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ۔ (کفار کی یہ جماعت عنقریب شکست کھائے گی اور وہ پیٹھ پھیر کر بھاگ کھڑے ہوں گے۔)

تشریح: اللہ تعالیٰ نے آپ سے صلی اللہ علیہ وسلم وعدہ فرمایا تھا: وَ اِذْ یَعِدُکُمُ اللّٰهُ اِحْدَی الطَّآئِفَتَیْنِ اَنَّهَا لَکُمْ (الانفال:۷) "اور یاد کرو جب اللہ تم سے وعدہ کر رہا تھا کہ دو گروہوں میں سے ایک تمھارے ہاتھ آئے گا۔" اللہ کے وعدہ کا حوالہ دے کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم دعا فرما رہے تھے۔ اللہ کے وعدہ پر یقین کے باوجود بندہ کا فرض ہے کہ وہ اپنے رب سے درخواست اور الحاح وزاری کرنے میں کوتاہی نہ کرے۔ بندے کی عبدیت اور اللہ کی شان بے نیازی کا تقاضا بھی یہی ہے کہ بندہ نہایت منت وسماجت کے ساتھ اس سے دعائیں کرتا رہے۔ اس دعا سے مجاہدین اسلام کے دلوں

کو تقویت پہنچانی اور ان کے حوصلوں کو بلند رکھنا بھی ایک خاص مقصد ہو سکتا ہے۔

آپ ﷺ زرہ پہنے ہوئے باہر آئے تو زبان مبارک پر قرآن کی وہ آیت تھی جس کا ذکر اس حدیث میں کیا گیا ہے۔ اس آیت کے ذریعہ سے گویا آپ ﷺ اہل ایمان کو خدا کی جانب سے بشارت واطلاع دے رہے تھے کہ دشمنوں کے مقابلہ میں فتح مسلمانوں ہی کو حاصل ہوگی۔

خوفِ خدا

(۱) عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ ن الْخُدْرِیِّ ؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: کَیْفَ اَنْعَمُ وَ صَاحِبُ الصُّوْرِ قَدِ الْتَقَمَہٗ وَ اَصْغٰی سَمْعَہٗ وَ حَنٰی جَبْھَتَہٗ یَنْتَظِرُ مَتٰی یُؤْمَرُ بِالنَّفْخِ۔ فَقَالُوْا: یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ، وَمَا تَاْمُرُنَا؟ قَالَ: قُوْلُوْا حَسْبُنَا اللّٰہُ وَ نِعْمَ الْوَکِیْلِ۔ (ترمذی)

ترجمہ: حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ''میں کیوں کر راحت ولذات سے لطف اندوز ہوں جب کہ صورت حال یہ ہے کہ صور پھونکنے والے فرشتے نے صور کو اپنے منہ میں لے لیا ہے، اپنی پیشانی جھکا لی ہے اور اپنے کان لگا رکھے ہیں اور اس انتظار میں ہے کہ اسے صور پھونکنے کا حکم ملے۔'' صحابہؓ نے عرض کیا کہ اس حالت میں آپؐ ہمیں کیا حکم دیتے ہیں؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ کہو: ''حَسْبُنَا اللّٰہُ وَ نِعْمَ الْوَکِیْلُ۔ (ہمیں اللہ کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے۔'')

تشریح: یعنی جس کسی شخص کو بھی اس صورتِ حال کی نزاکت کا احساس ہوگا کہ فرشتہ صور میں پھونک مارنے کو بالکل تیار ہے۔ کسی وقت بھی قیامت برپا ہو سکتی ہے وہ چین اور اطمینان سے کیسے رہ سکتا ہے۔ اور دنیا کا کوئی بھی لطف وآرام اسے اس صورتِ حال کی طرف سے کیوں کر بے پروا کر سکتا ہے۔ اس کو تو یہی فکر دامن گیر ہوگی کہ دنیا میں اس کی زندگی کا کوئی لمحہ بھی غفلت کی نذر نہ ہو اور وہ خدا سے ہمہ وقت ڈرتا رہے۔

انسان جس صورت حال سے دوچار ہے، اگر اسے اس کی سنگینی اور نزاکت کا احساس ہو تو اسے ہرگز قرار نہیں آ سکتا۔ ایسی حالت میں انسان کے لیے صحیح روش اگر ہو سکتی ہے تو وہ یہی ہے کہ وہ خدا کی نافرمانیوں اور معصیتوں سے بچتا رہے اور اس کی بندگی سے کبھی غافل نہ ہو لیکن اصل

بھروسہ اسے اپنے عمل پر نہیں بل کہ اپنے خدا پر ہو۔ کسی پر اگر اطمینان اور اعتماد کیا جا سکتا ہے تو وہ کوئی اور چیز نہیں بل کہ خدا کی ذات ہے۔ آدمی خدا ہی کو اپنا کارساز سمجھے اور اپنا معاملہ اس کے سپرد کر دے اور کہے کہ اللہ ہمارے لیے کافی ہے۔ پریشانیوں میں یہی اس کے لیے سکون کا باعث ہو سکتی ہے۔

﴿۲﴾ وَ عَنْ عَآئِشَةَؓ قَالَتْ: مَا رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ ضَاحِكًا حَتّٰى اَرٰى مِنْهُ لَهَوَاتِهٖ، اِنَّمَا كَانَ يَتَبَسَّمُ فَكَانَ اِذَا رَاٰى غَيْمًا اَوْ رِيْحًا عُرِفَ فِيْ وَجْهِهٖ۔

(بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ بیان فرماتی ہیں کہ ’’میں نے کبھی رسول اللہ ﷺ کو اس طرح ہنستے نہیں دیکھا کہ آپؐ کا کوّا نظر آیا ہو۔ آپؐ صرف تبسم فرماتے تھے۔ اور جب ابر یا ہوا دیکھتے تو آپؐ کے چہرے کا تغیر صاف پہچانا جاتا تھا۔‘‘

تشریح: یعنی آپ ﷺ کے چہرۂ مبارک سے خوف کے آثار نمایاں نظر آتے تھے۔ یوں تو آپ ﷺ کا قلبِ مبارک خوف و خشیت سے کسی وقت بھی خالی نہ رہتا تھا۔ لیکن ابر و ہوا کے موقع پر آپ ﷺ زیادہ متفکر ہو جایا کرتے تھے کہ کہیں ابر ہوا کے دامن میں غضب الٰہی کی بجلیاں نہ پوشیدہ ہوں۔ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسی صورت میں آپ ﷺ کی گھبراہٹ اور پریشانی اس درجہ بڑھ جاتی تھی کہ آپ ﷺ اضطراب میں کبھی گھر سے باہر آتے اور کبھی اندر جاتے۔ یہ اضطراب اس وقت ختم ہوتا جب بارش شروع ہو جاتی۔ حضرت عائشہؓ نے آپ ﷺ سے پریشانی کی وجہ دریافت کی تو فرمایا: ’’عائشہؓ، کیا خبر، یہ ابر ویسا ہی نہ ہو جس کے متعلق قوم عاد نے کہا تھا: هٰذَا عَارِضٌ مُمْطِرُنَا (یہ ابر ہے، ہم پر برسے گا۔)‘‘ یعنی عاد کے لوگ غلط فہمی میں رہے۔ خدا نے ان کی اس غلط فہمی کو جلد ہی ہلاکت اور تباہی کی صورت میں بدل دیا۔

﴿۳﴾ عَنْ مُطَرِّفِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ الشِّخِّيْرِؓ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ اَتَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ وَ هُوَ يُصَلِّيْ وَ لِجَوْفِهٖ اَزِيْزٌ كَاَزِيْزِ الْمِرْجَلِ يَعْنِيْ يَبْكِيْ۔

(احمد، نسائی)

ترجمہ: حضرت مطرف بن عبداللہ بن شخیر اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے کہا کہ میں نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، اس وقت آپؐ نماز پڑھ رہے تھے اور آپؐ کے سینے

سے اس طرح آواز نکل رہی تھی جیسے پکتی ہانڈی سے آواز نکلتی ہے یعنی آپؐ رو رہے تھے۔

تشریح: ابوداؤد کی روایت میں ہے: رَاَیْتُ النَّبِیَّ صلی اللہ علیہ وسلم یُصَلِّی وَ صَدْرِہٖ اَزِیْزٌ کَاَزِیْزَ الرَّحٰی مِنَ الْبُکَاءِ ـــــ ''میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھتے دیکھا اس وقت رونے کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سینے سے چکی کی سی آواز آ رہی تھی۔'' نماز میں خوف وخشیت کے سبب سے رونے اور آہ کرنے سے نماز باطل نہیں ہوتی۔ البتہ اگر کوئی شخص جسمانی درد اور تکلیف کی وجہ سے آہ کرے اور بہ آواز بلند روئے تو اس کی نماز ٹوٹ جائے گی۔ (ہدایہ)

﴿۴﴾ عَنْ عَآئِشَةَ رضی اللہ عنہا قَالَتْ: فَقَدْتُّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم لَیْلَةً مِّنَ الْفِرَاشِ فَالْتَمَسْتُہٗ فَوَقَعَتْ یَدِیْ عَلٰی بَطْنِ قَدَمِہٖ وَ ھُوَ فِی الْمَسْجِدِ وَ ھُمَا مَنْصُوْبَتَانِ وَ ھُوَ یَقُوْلُ: اَللّٰھُمَّ اِنِّیْٓ اَعُوْذُ بِرِضَاکَ مِنْ سَخَطِکَ وَ بِمُعَافَاتِکَ مِنْ عُقُوْبَتِکَ وَ اَعُوْذُ بِکَ مِنْکَ لَآ اُحْصِیْ ثَنَآءً عَلَیْکَ، اَنْتَ کَمَآ اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِکَ۔
(مسلم)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ بیان فرماتی ہیں کہ میں ایک رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بستر پر نہ پا کر آپؐ کو تلاش کرنے لگی۔ میرا ہاتھ آپؐ کے تلوے پر پڑا۔ آپؐ سجدے میں تھے اور دونوں پاؤں اٹھے ہوئے تھے۔ اور آپؐ فرما رہے تھے: ''اے اللہ، میں تیرے غضب سے بچنے کو تیری رضا کی پناہ لیتا ہوں۔ تیرے عذاب سے محفوظ رہنے کے لیے تیری بخشش کی اور تیری گرفت سے بچنے کے لیے تیری ہی پناہ مانگتا ہوں۔ مجھ میں یہ طاقت نہیں کہ میں تیری پوری تعریف کرسکوں۔ تو ایسا ہی ہے جیسا تو نے خود اپنی تعریف فرمائی۔''

تشریح: نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کے یہ الفاظ یہ اندازہ کرنے کے لیے کافی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قلب مبارک کن کیفیات کا حامل تھا اور خدا کے خوف سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کس قدر لرزاں و ترساں رہتے تھے۔

﴿۵﴾ وَ عَنْھَا قَالَتْ: کَانَ رَسُوْلَ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم اِذَا اَمَرَھُمْ اَمَرَھُمْ مِنَ الْاَعْمَالِ بِمَا یُطِیْقُوْنَ قَالُوْا: اِنَّا لَسْنَا کَھَیْئَتِکَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ، اِنَّ اللّٰہَ غَفَرَ لَکَ مَا تَقَدَّمَ

مِنْ ذَنْبِکَ وَمَا تَاَخَّرَ فَیَغْضَبُ حَتّٰی یُعْرَفَ الْغَضَبُ فِیْ وَجْھِہٖ ثُمَّ یَقُوْلُ: اِنَّ اَتْقَاکُمْ وَ اَعْلَمَکُمْ بِاللّٰہِ اَنَا۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب لوگوں کو حکم دیتے تو انھیں ان اعمال کے اختیار کرنے کا حکم دیتے جن کو اختیار کرنے کی ان میں طاقت ہوتی۔ لوگوں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ، ہم آپؐ جیسے ہرگز نہیں۔ اللہ نے تو آپؐ کے اگلے اور پچھلے سبھی گناہوں کو بخش دیا ہے۔ اس پر آپؐ کو سخت غصّہ آیا یہاں تک کہ آپؐ کے چہرے سے غصّہ کا اثر صاف نمایاں ہو رہا تھا۔ پھر آپؐ نے ارشاد فرمایا: ''میں تم سے زیادہ اللہ کا ڈر رکھتا ہوں اور تم سب سے زیادہ اللہ کو جاننے والا میں ہوں۔''

تشریح: ایک روایت میں ہے: اِنِّی لَاَعْلَمُھُمْ بِاللّٰہِ وَ اَشَدُّھُمْ لَہٗ خَشْیَۃً (بخاری) ''میں سب لوگوں سے زیادہ اللہ کو جانتا ہوں اور سب سے بڑھ کر اس سے ڈرتا ہوں۔''

حدیث کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی اطاعت و عبادت کا اصل محرک خدا کی معرفت اور اس کا تقویٰ ہے۔ اس سے ہٹ کر کسی دوسری چیز کو اس کا محرک قرار دینا صحیح نہ ہوگا۔ جب علم باللہ اور تقویٰ اللہ میں تم سب سے بڑھ کر میں ہوں تو پھر طاعت و عبادت میں تمھیں میری پیروی اختیار کرنی چاہیے۔ میرے طریقے سے ہٹ کر جو طریقہ بھی تم اختیار کرو گے وہ غلط اور منشائے حق کے خلاف ہوگا۔

خدا کو جاننے اور اس کا تقویٰ اختیار کرنے میں نبی ﷺ سے بڑھ کر دوسرا کون ہوسکتا ہے۔ آپ ﷺ نے اپنی ایک اور خاص صفت یہ بیان فرمائی ہے کہ امانت کی ادائے گی میں بھی دوسرا کوئی آپ ﷺ کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ چناں چہ ایک یہودی نے بغض و عناد کے باعث درپردہ جب آپ ﷺ کی امانت داری کی طرف سے بے اطمینانی ظاہر کی تو آپ ﷺ نے فرمایا: کَذَبَ قَدْ عَلِمَ اَنِّیْ مِنْ اَتْقَاھُمْ وَ آدَاھُمْ لِلْاَمَانَۃِ (ترمذی، نسائی) ''وہ جھوٹا ہے اور وہ خود اس سے واقف ہے۔ وہ جانتا ہے کہ میں تمام لوگوں سے زیادہ متقی ہوں اور ان سے بڑھ کر امانتوں کو اچھی طرح ادا کرنے والا ہوں۔''

جذبۂ شکر

﴿۱﴾ عَنِ الْمُغِیْرَۃِؓ قَالَ: قَامَ النَّبِیُّ ﷺ حَتّٰی تَوَرَّمَتْ قَدَمَاہُ فَقِیْلَ لَہٗ: لِمَ تَصْنَعُ ھٰذَا وَ قَدْ غُفِرَلَکَ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِکَ وَمَا تَاَخَّرَ؟ قَالَ: اَفَلاَ اَکُوْنَ عَبْدًا شَکُوْرًا۔ (بخاری، مسلم، ابن ماجہ)

ترجمہ: حضرت مغیرہؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے رات میں اس قدر طویل قیام کیا کہ آپؐ کے پاؤں ورم کر آئے آپؐ سے دریافت کیا گیا کہ آپؐ ایسا کیوں کرتے ہیں، آپؐ کے تو سب اگلے پچھلے قصور معاف ہو چکے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: کیا میں ایک شکر گزار بندہ نہ بنوں؟''

تشریح: آپؐ نے دیر تک نماز میں قیام فرمایا۔ یہاں تک آپ ﷺ کے پاؤں میں ورم آ گیا۔ آپ ﷺ عبادت میں غیر معمولی مشقتیں اٹھاتے تھے۔ آپؐ سے کہا جاتا ہے کہ اپنی جان پر اتنی سختی کیوں اٹھاتے ہیں؟ آپ ﷺ جو مشقتیں اٹھا رہے ہیں، اس کی ضرورت تو محسوس نہیں ہوتی۔ آپ ﷺ کی تو سب اگلی پچھلی کوتاہی معاف ہو چکی ہے۔ یہ بات غالباً سورۂ الفتح آیت ۲ کے پیشِ نظر کہی۔

سوال کا آپؐ نے جو جواب دیا اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ جب خدا نے مجھ پر انتہا نوازش کی ہے تو میرا بھی فرض ہے کہ میں اس کا شکر گزار بندہ بنوں۔ اور زیادہ سے زیادہ اس کی رضا اور خوشنودی کا طالب رہوں۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ خدا کا شکر گزار ہونے کا ایک تقاضا یہ ہے کہ بندہ خدا کے ساتھ زیادہ سے زیادہ اپنی وابستگی اور تعلق کا اظہار کرے۔ اور زیادہ سے زیادہ اس کے قرب کا خواست گار رہو۔ اور اس کا بہترین ذریعہ نماز ہے۔ اور سجدہ تو خاص ذریعۂ قرب بل کہ عین حالت قرب کا دوسرا نام ہے۔

صبر

﴿۱﴾ عَنْ جُنْدُبِ بْنِ سُفْیَانَؓ قَالَ: دَمِیَتْ اِصْبَعُ رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ فِیْ بَعْضِ تِلْکَ الْمَشَاھِدِ فَقَالَ: ھَلْ اَنْتِ اِلَّا اِصْبَعٌ دَمِیْتِ وَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ مَا لَقِیْتِ۔

(مسلم)

ترجمہ: حضرت جندب بن سفیانؓ بیان کرتے ہیں کہ کسی لڑائی میں رسول اللہ ﷺ کی انگلی زخمی ہوئی اور خون نکل آیا تو آپؐ نے (اپنی انگلی کو مخاطب کر کے) فرمایا: ''تو محض ایک خوں آلود زخمی انگلی ہے۔ تجھے جو مصیبت پہنچی ہے وہ خدا کی راہ میں پہنچی ہے۔''

تشریح: یعنی جب یہ تکلیف خدا کی راہ میں پہنچی ہے تو میں اس کا غم کیوں کروں خدا کی راہ میں تو جان تک قربان کی جاسکتی ہے۔ خدا کی راہ میں چلنے والوں کا راستہ مصائب نہیں روک سکتے۔ اور نہ خدا کی راہ کے مسافر اس راہ میں پہنچنے والی مصیبتوں کا کسی سے شکوہ کرتے ہیں۔

﴿۲﴾ وَ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ: كَأَنِّيْ اَنْظُرُ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ يَحْكِيْ نَبِيًّا مِّنَ الْاَنْبِيَآءِ ضَرَبَهٗ قَوْمُهٗ وَ هُوَ يَمْسَحُ الدَّمَ عَنْ وَّجْهِهٖ وَ يَقُوْلُ: رَبِّ اغْفِرْ لِقَوْمِيْ فَاِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ بیان کرتے ہیں کہ میں گویا رسول اللہ ﷺ کو ایک نبی کی سرگزشت بیان فرماتے ہوئے دیکھ رہا ہوں جن کو ان کی قوم نے مارا تھا۔ وہ اپنے چہرے سے خون پونچھتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے، اے اللہ، تو میری قوم کو بخش دے۔ کیوں کہ وہ نادان ہے۔

تشریح: حقیقت میں نبی کریم ﷺ کی خود اپنی بھی یہی سرگزشت ہے۔ قوم کے ہاتھوں آپ ﷺ بھی طائف کے دعوتی سفر میں اور جنگ احد میں زخمی ہوئے۔ لیکن آپ ﷺ نے غیر معمولی صبر سے کام لیا۔ ملکِ جبال نے جب آپ ﷺ سے کہا کہ آپ ﷺ فرمائیں تو میں دونوں پہاڑوں (ابوقبیس اور اوس کے سامنے کا پہاڑ جو مکہ میں ہے) ان لوگوں پر الٹ دوں (اور یہ لوگ پس کر رہ جائیں) تو آپ ﷺ نے جواب میں فرمایا: بَلْ اَرْجُوْ اَنْ يُّخْرِجَ اللّٰهُ تَعَالٰى مِنْ اَصْلَابِهِمْ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ وَحْدَهٗ لَا يُشْرِكُ بِهٖ شَيْئًا (مسلم، بخاری، نسائی) ''نہیں، بل کہ میں امید رکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کی نسل سے ان لوگوں کو پیدا فرمائے گا جو ایک خدا کی عبادت کریں گے اور کسی چیز کو اس کا شریک نہ ٹھیرائیں گے۔''

جسمانی تکلیف کے علاوہ آپ ﷺ نے ذہنی اذیتیں بھی برداشت کی ہیں۔ ایک دفعہ جب آپ ﷺ کو خبر ملی کہ ایک شخص کہہ رہا ہے کہ مال کی تقسیم میں آپ ﷺ نے خدا اور

آخرت کا کچھ بھی لحاظ نہ رکھا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: رَحْمَةُ اللّٰهِ عَلٰی مُوْسٰیؑ فَاِنَّهٗ اُوْذِیَ بِاَکْثَرَ مِنْ هٰذَا فَصَبَرَ (مسند احمد، ترمذی، ابوداؤد) اللہ کی رحمت ہو موسیٰؑ پر، ان کو اس سے زیادہ اذیتیں پہنچائی گئیں اور انھوں نے صبر کیا۔"

سادگی

﴿۱﴾ عَنْ اَنَسٍؓ قَالَ: حَجَّ النَّبِیُّ ﷺ عَلٰی رَحْلٍ رَثٍّ وَّ قَطِیْفَةٍ خَلَقَةٍ تُسَاوِیْ اَرْبَعَةَ دَرَاهِمَ اَوْلَا تُسَاوِیْ۔ (ترمذی)

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ایک پرانے کجاوہ پر بوسیدہ چادر میں حج کیا جس کی قیمت چار درہم رہی ہوگی یا چار درہم بھی نہ رہی ہوگی۔"

تشریح: جس طرح سے آپ ﷺ نے اپنے پیروؤں کو سادگی کی تعلیم دی ہے اسی طرح آپ ﷺ نے خود بھی سادگی کو اختیار فرمایا۔ اور دنیوی زیب وآرائش سے اپنے آپ کو بے پروا رکھا۔ آپ ﷺ کی یہ سادگی اس زمانے کی ہے جب کہ سارا عرب اسلام کے زیرنگیں تھا۔ یعنی یہ ۱۰ھ کی بات ہے۔ آپ ﷺ چاہتے تو اپنے لیے بہت کچھ ساز وسامان کر سکتے تھے۔

﴿۲﴾ وَ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍؓ قَالَ: نَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَلٰی حَصِیْرٍ فَقَامَ وَ قَدْ اَثَّرَ فِیْ جَنْبِهٖ۔ فَقُلْنَا یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، لَوِ اتَّخَذْنَا لَکَ وِطَآءً۔ فَقَالَ: مَالِیْ وَ لِلدُّنْیَا؟ مَآ اَنَا فِی الدُّنْیَا اِلَّا کَرَاکِبٍ اِسْتَظَلَّ تَحْتَ شَجَرَةٍ ثُمَّ رَاحَ وَ تَرَکَهَا۔ (ترمذی)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ایک چٹائی پر سوئے۔ جب آپؐ اٹھے تو چٹائی کے نشانات آپؐ کے پہلو پر نمایاں تھے۔ ہم نے عرض کیا کہ کیا اچھا ہو کہ ہم آپؐ کے لیے ایک توشک بنا دیں۔ آپؐ نے فرمایا: "مجھے دنیا سے کیا مطلب؟ میں تو اس دنیا میں بس اس مسافر کی طرح ہوں جو کسی درخت کے نیچے تھوڑا سا سایہ لے اور پھر اسے چھوڑ کر (آگے اپنی منزل کی طرف) روانہ ہو جائے۔"

تشریح: آپ ﷺ نے اپنے طرزِ عمل سے اس کا اظہار فرمایا کہ دنیا اس لیے نہیں ہے کہ

کوئی اس کی طلب میں جیے اور مرے۔ دنیا تو ایک رہ گزر ہے اسے منزل سمجھ لینے کی غلطی ہرگز نہیں کرنی چاہیے۔

یہ پیشِ نظر رہے کہ بوریے پر سونے کا واقعہ جو اس حدیث میں بیان ہوا ہے، اسلام کے دورِ اقتدار کا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ دنیا سے جو شخص بھی محبت کرے گا آخرت کی اہمیت اور اس کی قدر و قیمت اس کی نگاہ میں باقی نہیں رہ سکتی۔ اس لیے نگاہ ہمیشہ آخرت پر ہونی چاہیے۔ دنیا میں اگر فکر ہو تو صرف اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کی ہو۔

گناہوں سے بچنا

〈۱〉 عَنْ عَآئِشَۃَ ؓ اَنَّھَا قَالَتْ: مَا خُیِّرَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ بَیْنَ اَمْرَیْنِ اِلَّآ اَخَذَ اَیْسَرَھُمَا مَالَمْ یَکُنْ اِثْمًا فَاِنْ کَانَ اِثْمًا کَانَ اَبْعَدَ النَّاسِ مِنْہُ وَمَا انْتَقَمَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ لِنَفْسِہٖ اِلَّآ اَنْ تُنْتَھَکَ حُرْمَۃُ اللّٰہِ فَیَنْتَقِمَ لِلّٰہِ بِھَا۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو دو کاموں میں اختیار دیا جاتا تو لازماً آپؐ ان میں سے جو آسان اور ممکن العمل ہوتا اسے اختیار فرماتے بس شرط یہ تھی کہ وہ گناہ نہ ہو۔ اگر وہ گناہ (کا سبب) ہوتا تو لوگوں میں سب سے بڑھ کر آپؐ اس سے دور رہنے والے تھے اور رسولِ خدا ﷺ نے اپنی ذات کے لیے کبھی (کسی سے) انتقام نہیں لیا۔ البتہ اللہ کی حرمت کے خلاف کوئی کام کیا جاتا تو آپؐ خدا کے لیے ضرور اس کا انتقام لیتے۔

تشریح: دین میں ہرگز یہ مطلوب نہیں ہے کہ آدمی لازماً اپنے آپ کو مشقتوں میں مبتلا کرے۔ اسلام نے دین کے اس راہبانہ تصوّر کی نفی کی ہے کہ کسی شخص کو سخت ترین ریاضتوں اور ہلاکتوں سے گزرے بغیر کمال حاصل نہیں ہوسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اگر دو کاموں میں ایک کا اختیار نبی ﷺ کو دیا جاتا تو اس کام کو اختیار فرماتے جو ان میں ممکن العمل یا آسان تر ہوتا۔ پھر آپ ﷺ کو اپنی امت کی سہولت بھی پیشِ نظر رہتی تھی۔ نبی ﷺ کا طرزِ عمل امت کے لیے اسوہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

جس طرح نبی کریم ﷺ بنی آدم میں سب سے بڑھ کر فیاض تھے۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے: اَنَا اَجْوَدُ بَنِی اٰدَمَ (بیہقی عن انس بن مالکؓ) ''میں بنی آدم میں سب سے بڑھ کر فیاض ہوں۔'' ٹھیک اسی طرح سارے انسانوں میں سب سے بڑھ کر گناہوں سے دور رہنے والے بھی آپ ﷺ تھے۔ ایک نبی کی حقیقت میں یہی شان ہوتی ہے۔ آپؐ کی سچی پیروی درحقیقت یہی ہوگی کہ ہم آپ ﷺ کے یہ دونوں ہی وصف اختیار کرنے کی کوشش کریں۔

فضول باتوں سے اجتناب

(۱) عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ اَبِیْ اَوْفیٰؓ قَالَ: کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ یُکْثِرُ الذِّکْرَ وَ یُقِلُّ اللَّغْوَ وَ یُطِیْلُ الصَّلٰوۃَ وَ یُقَصِّرُ الْخُطْبَۃَ وَلاَ یَأنِفُ اَنْ یَمْشِیَ مَعَ الْاَرْمِلَۃِ وَالْمِسْکِیْنِ فَیَقْضِیَ لَہُ الْحَاجَۃَ۔ (نسائی، دارمی)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن اوفیٰؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ذکر میں زیادہ مصروف رہتے تھے۔ فضول باتیں تھوڑے ہی کرتے۔ نماز کو طویل اور خطبہ کو مختصر کرتے۔ آپ بیوہ اور مسکین کے ساتھ چلنے میں عار محسوس نہ فرماتے اور ان کا ہر کام کر دیتے تھے۔

تشریح: آپ ﷺ بہ کثرت اللہ کو یاد کرتے۔ ہر وہ چیز جو خدا کی یاد سے تعلق رکھتی ہو، ذکر میں شامل ہے۔ آپ مختلف صورتوں میں ہر لمحہ خدا کو یاد کیا کرتے تھے۔

حقیقی زندگی خدا کی یاد اور اس کے ذکر سے وابستہ ہونا ہے۔ جس زندگی میں خدا کا ذکر نہ ہو وہ زندگی نہیں، حسرت و محرومی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کوئی شخص اس بات کو محسوس نہ کر رہا ہو۔ دنیا کی باتوں سے آپ کم ہی دل چسپی لیتے۔ دنیا کی باتیں آپ ﷺ بہت کم کرتے تھے۔ یوں آپ ﷺ کی دنیوی باتیں بھی حکمت اور مصلحت سے خالی نہ ہوتی تھیں۔ حقیقی معنی میں ان کو لغو یا فضول نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن بہ اعتبار ظاہر مجازاً ان پر فضول کا اطلاق کیا گیا ہے۔ لغو باتوں سے مراد ایسی لایعنی باتیں ہوتی ہیں جن کا کوئی حقیقی مقصد نہ ہو اور جو خدا کی یاد سے بہ راہ راست یا بالواسطہ کوئی تعلق نہ رکھتی ہوں بہ ظاہر نبی ﷺ کی زبان مبارک سے لغویات کا صدور ممکن نہ تھا۔

قلیل کا لفظ مطلق نفی کے معنی میں بھی آتا ہے۔ اس لحاظ سے بعض لوگوں نے اس حدیث کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ رسولِ خدا ﷺ کبھی زبان سے لغو بات نکالتے ہی نہ تھے۔

خدا سے تعلق خاص ہو تو نماز لازماً طویل ہو جائے گی۔ اور اگر خطبہ میں غیر ضروری باتوں سے احتراز کیا جائے، صرف ضروری اور کام کی باتیں پیش کرنے پر اکتفا کیا جائے تو خطبہ کبھی بھی طول طویل اور اکتا دینے والا نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے آپؐ نے فرمایا ہے:۔۔۔اِنَّ طُولَ صَلٰوةِ الرَّجُلِ وَ قَصْرَ خُطْبَتِهٖ مَئِنَّةٌ مِنْ فِقْهِهٖ (مسلم) ''آدمی کی لمبی نماز اور اس کا مختصر خطبہ اس کی دانائی کی علامت ہے۔'' یہ آدمی کی نادانی اور ناسمجھی کی بات ہوگی کہ وہ خطبہ تو بہت لمبا پڑھے لیکن نماز کو جو اصل مقصود ہے، مختصر کر دے۔

آپ ﷺ کے اندر کبر کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا تھا۔ آپؐ بیوہ اور مسکین کے ساتھ چل کر ان کا کام کر دیتے حالاں کہ خدا نے آپ ﷺ کو رتبۂ بلند عطا فرمایا تھا۔

صدق وصفا

(۱) عَنْ عَلِيٍّؓ اَنَّ اَبَا جَهْلٍ قَالَ لِلنَّبِيِّ ﷺ: اِنَّا لَا نُكَذِّبُكَ وَ لٰكِنْ نُكَذِّبُ بِمَا جِئْتَ بِهٖ۔ (ترمذی)

ترجمہ: حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ ابوجہل نے نبی ﷺ سے کہا کہ (اے محمدؐ) ہم (اہل قریش) تمھیں نہیں جھٹلاتے۔ ہم تو اس چیز کی تکذیب کرتے ہیں جو تم لے کر آئے ہو۔

تشریح: یعنی ہم پر تمھاری سچائی روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ ہم نے کبھی بھی تم کو جھوٹ بولتے نہیں دیکھا۔ لوگوں میں صدق و امانت کے لحاظ سے تمھیں شہرت حاصل ہے۔ ہم دراصل تمھاری کتاب و شریعت کو ماننا نہیں چاہتے۔ ہم اس وحی کو تسلیم نہیں کرتے جسے تم پیش کر رہے ہو۔

کاش یہ دشمنِ حق یہ سمجھ سکتا کہ جو شخص دنیا کے معاملات میں لوگوں سے جھوٹ نہیں بول سکتا وہ دین کے معاملہ میں جھوٹ کیسے بولے گا۔ جس شخص کا نمایاں وصف صدق ہے وہ خدا کی طرف کوئی غلط بات کیوں کر منسوب کرے گا۔

حقیقت میں قریش مکہ کے بڑے بڑے سردار بغض و حسد اور کبر و تعصب کے شکار تھے جس کی وجہ سے حق کو قبول کرنا ان کے لیے کوئی آسان بات نہیں رہ گئی تھی۔

حیا

﴿۱﴾ عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ ﹷالْخُدْرِیِّ ؓ قَالَ: کَانَ النَّبِیُّ ﷺ اَشَدَّ حَیَآءً مِّنَ الْعَذْرَآءِ فِیْ خِدْرِهَا فَاِذَا رَاٰی شَیْئًا یُّکْرَهُهٗ عَرَفْنَاهُ فِیْ وَجْهِهٖ۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت ابو سعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ پردہ نشین کنواری لڑکیوں سے بھی زیادہ حیادار تھے۔ جب کوئی ایسی بات دیکھتے جو آپؐ کو ناگوار ہوتی تو ہم یہ بات آپؐ کے چہرے سے معلوم کر لیتے تھے۔

تشریح: یعنی کوئی مکروہ اور خلاف مزاج بات دیکھتے تو غلبۂ حیا کی وجہ سے گرچہ آپ ﷺ زبان سے کچھ نہ فرماتے لیکن اس ناگواری کے اثرات آپ ﷺ کے چہرے سے نمایاں ہوجاتے تھے۔

پردہ نشین لڑکیاں زیادہ شرمیلی اور حیادار ہوتی ہیں لیکن حیا اور شرم آپ ﷺ میں ان لڑکیوں سے بھی بڑھ کر تھی۔

﴿۲﴾ وَ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ ؓ قَالَ: لَمْ یَکُنْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فَاحِشًا وَّلَا مُتَفَحِّشًا۔ (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاصؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی طبیعت میں بے حیائی نہ تھی اور نہ آپؐ کوئی بے حیائی کی بات کرتے تھے۔

فیاضی

﴿۱﴾ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ ؓ قَالَ: کَانَ النَّبِیُّ ﷺ اَجْوَدَ النَّاسِ وَ اَجْوَدُ مَا یَکُوْنُ فِیْ رَمَضَانَ۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ لوگوں میں سب سے بڑھ کر فیاض تھے اور رمضان میں معمول سے کہیں زیادہ فیاض ہوجاتے تھے۔

تشریح: رمضان المبارک درحقیقت مہینہ ہی نیکی کا ہے۔ اس لیے اس مہینے میں سخاوت اور فیاضی میں نمایاں اضافہ ایک فطری بات ہے۔

صحیح بخاری کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ جبریل علیہ السلام رمضان کی ہر شب میں آپ ﷺ سے ملتے تھے اور پھر باہم قرآن پڑھا جاتا تھا۔ جب آپ ﷺ جبریلؑ سے ملتے تو فائدہ پہنچانے میں تیز ہوا سے بھی بڑھ کر فیاض ہوتے تھے: (حِيْنَ يَلْقَاهُ جِبْرِيْلُ اَجْوَدُ بِالْخَيْرِ مِنَ الرِّيْحِ الْمُرْسَلَةِ)۔

〈۲〉 وَ عَنْ جَابِرٍؓ قَالَ: مَا سُئِلَ النَّبِيُّ ﷺ عَنْ شَيْءٍ قَطُّ فَقَالَ لاَ۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ نبی ﷺ سے کوئی چیز مانگی گئی ہو اور جواب میں آپؐ نے ''نہیں'' فرمایا ہو۔

تشریح: یعنی کسی سائل کو ''نہیں'' کہہ کر واپس نہیں کیا۔ ہر سائل کو کچھ نہ کچھ عطا فرمایا۔ اگر اپنے پاس دینے کو کچھ نہ ہوا تو قرض لے کر دیا۔

〈۳〉 وَ عَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: لَوْ كَانَ عِنْدِىْ مِثْلُ اُحُدٍ ذَهَبًا لَسَرَّنِىْ اَنْ لَّا يَمُرَّ عَلَىَّ ثَلٰثُ لَيَالٍ وَ عِنْدِىْ مِنْهُ شَيْءٌ اِلَّا شَيْءٌ اَرْصُدُهٗ لِدَيْنٍ۔ (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اگر میرے پاس کوہِ احد برابر بھی سونا ہو تو میری خوشی کی چیز یہی ہوگی کہ مجھ پر تین راتیں بھی نہ گزریں کہ میرے پاس اس میں سے کچھ باقی ہو بجز اس کے کہ کسی قرض کے ادا کرنے کے لیے اس میں سے کچھ روک لوں۔''

تشریح: یہ حدیث بتاتی ہے کہ فیاضی اور سخاوت آپ ﷺ کی سیرت کا نمایاں وصف تھا، مال جمع کرنے میں نہیں، آپ ﷺ کو راحت اور خوشی مال و دولت کے تقسیم کرنے میں حاصل ہوتی تھی۔ مال خواہ کتنا ہی زیادہ ہو، اس کے ختم ہونے پر آپ ﷺ افسردگی کے بہ جائے مسرت کی کیفیت محسوس فرماتے تھے۔

〈۴〉 وَ عَنْ اَنَسٍؓ اَنَّ رَجُلاً سَأَلَ النَّبِيَّ ﷺ غَنَمًا بَيْنَ جَبَلَيْنِ فَاَعْطَاهُ اِيَّاهُ فَاَتٰى قَوْمَهٗ فَقَالَ اَىْ قَوْمِ اَسْلِمُوْا فَوَ اللّٰهِ اِنَّ مُحَمَّدًا لَّيُعْطِىْ عَطَآءً مَا يُخَافُ الْفَقْرُ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے نبی ﷺ سے بکریاں مانگیں جو دو پہاڑوں کے درمیان تھیں۔ آپؐ نے وہ سب اسے دے دیں۔ وہ شخص اپنی قوم کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ اے لوگو، مسلمان ہو جاؤ، یہ خدا محمدؐ اتنا کچھ دیتے ہیں کہ محتاجی کا ڈر نہیں رہتا۔

تشریح: آپؐ نے نہ صرف یہ کہ سائل کے سوال کو رد نہیں کیا بل کہ دینے میں حد درجہ فیاضی سے کام لیا۔

حضرت انسؓ بیان فرماتے ہیں کہ ایک شخص محض دنیا کے لیے مسلمان ہوتا لیکن پھر اسلام اس کی نگاہ میں ساری دنیا سے بڑھ کر محبوب ہو جاتا۔ یہ تھا دینِ حق کا کرشمہ اور نبی ﷺ کی صحبت کا اثر کہ طالبِ دنیا بھی آپ ﷺ کے قریب آ کر حق کا پرستار بن جاتا تھا۔

﴿۵﴾ وَ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: هَلْ تَدْرُوْنَ مَنْ اَجْوَدُ جُوْدًا؟ قَالُوْا: اَللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ۔ قَالَ: اَللّٰهُ اَجْوَدُ جُوْدًا ثُمَّ اَنَا اَجْوَدُ بَنِیْٓ اٰدَمَ وَ اَجْوَدُهُمْ مِنْۢ بَعْدِیْ رَجُلٌ عَلِمَ عِلْمًا فَنَشَرَهٗ یَاْتِیْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اَمِیْرًا وَّحْدَهٗ اَوْ اُمَّةً وَّاحِدَةً۔
(البیہقی)

ترجمہ: حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کیا تم جانتے ہو کہ سب سے بڑھ کر فیاض کون ہے؟'' صحابہؓ نے عرض کیا کہ اللہ اور اس کے رسول ہی زیادہ جانتے ہیں۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا: ''سب سے بڑھ کر فیاض و سخی اللہ ہے۔ پھر بنی آدم میں سب سے زیادہ فیاض میں ہوں اور میرے بعد انسانوں میں سب سے بڑھ کر فیاض شخص وہ ہے جو علم حاصل کر کے اس کو پھیلائے۔ ایسا شخص قیامت کے روز ایک امیر کی شکل میں آئے گا یا پھر وہ اس طرح آئے گا کہ اسے اپنی ذات میں ایک پوری امت کی حیثیت حاصل ہو گی۔''

تشریح: فیاضی درحقیقت زندگی کی علامت ہے۔ جہاں جس قدر زندگی پائی جائے گی وہاں اسی قدر فیاضی کا مظاہرہ ہوگا۔ خدا چوں کہ سراپا حیات اور سرچشمۂ زندگی ہے اس لیے اس سے بڑھ کر کسی فیاضی کا ہم تصوّر بھی نہیں کر سکتے۔ یہ آسمان و زمین خدا کی فیاضی اور اس کے فضل و کرم کا زندہ ثبوت ہیں۔ خدا کے بعد سخاوت اور فیاضی کے وصف سے سب سے زیادہ انبیاء علیہم السلام

متصف ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ خدا کی صفات کے عکوس ان کی زندگیوں میں سب سے زیادہ نمایاں ہوتے ہیں۔

پھر فیاضی کا تعلق محض انفاق مال ہی سے نہیں ہوتا۔ سب سے بڑھ کر فیاضی اور جود و احسان کی بات یہ ہے کہ دنیا کو علم کی روشنی سے بہرہ مند کرنے کی سعی کی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اس حدیث میں بنی آدم میں سب سے بڑھ کر فیاض اس شخص کو قرار دیا گیا ہے جو علم و معرفت سے بہرہ مند ہو کر دنیا میں علم کی روشنی کو عام کرے تا کہ لوگ ضلالت اور گم رہی کی تاریکیوں سے نجات پاسکیں۔ ان کے لیے حقیقی مسرتوں کا سامان بہم ہو سکے اور وہ دنیا و آخرت میں حقیقی فلاح و کامرانی سے ہم کنار ہو سکیں۔

شفقت

(۱) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رضی اللہ عنہ اَنَّ النَّبِیَّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: مَا مِنْ مُّؤْمِنٍ اِلَّا وَ اَنَا اَوْلٰی بِهٖ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ۔ اِقْرَءُ وْٓا اِنْ شِئْتُمْ: اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ۔ فَاَیُّمَا مُؤْمِنٍ مَّاتَ وَ تَرَکَ مَالاً فَلْیَرِثْهُ عَصَبَتُهٗ مَنْ کَانُوْا، وَ مَنْ تَرَکَ دَیْنًا اَوْ ضِیَاعًا فَلْیَاْتِنِیْ فَاَنَا مَوْلَاهُ۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: ”کوئی بھی مومن ایسا نہیں جس کا میں دنیا اور آخرت میں سب سے بڑھ کر عزیز و قریب نہ ہوں۔ اگر چاہو تو پڑھ لو: اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ (نبی اہلِ ایمان سے خود ان کے اپنے نفسوں سے بھی زیادہ قریب ہے۔) پس جس مومن کو موت آئے اور وہ مال چھوڑے تو اس کے عصبہ اس کے وارث ہوں گے، جو بھی موجود ہوں۔ اور جو کوئی قرض چھوڑے یا اہل و عیال چھوڑے وہ میرے پاس آئے میں اس کا مولیٰ (ذمّہ دار) ہوں۔“

تشریح: یعنی سرمایہ اور دولت اگر اس نے اپنے پیچھے چھوڑا ہے تو یہ اس کے حقیقی ورثہ کو ملے گا۔ لیکن کوئی اپنے پیچھے قرض یا ایسے بچے وغیرہ چھوڑ رہا ہے جن کی کفالت و پرورش کے بارے میں وہ فکر مند ہے تو اسے پریشان اور متردد ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایسے شخص کا عزیز و قریب میں

ہوں۔ اس کا قرض ادا کرنا میرے ذمّہ ہوگا اور اس کے بچوں کی کفالت اور پرورش کی ذمّہ داری میری ہوگی۔

نبی ﷺ نے یہ بات حکومت کے اعلیٰ ذمہ دار کی حیثیت سے کہی تھی۔ اس سے بہ خوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ذمّہ داران حکومت کی ذمّہ داریاں کتنی وسیع اور اہمیت کی حامل ہوتی ہیں۔ اور اسلامی حکومت کا کیا مزاج ہوتا ہے۔

﴿۲﴾ وَ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرؓ يَقُوْلُ: كُنَّا نُبَايِعُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ يَقُوْلُ لَنَا فِيْمَا اسْتَطَعْتُمْ. (مسلم)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ سے سمع و طاعت پر بیعت کرتے تھے تو آپؐ فرماتے کہ یہ بھی کہو" جتنا مجھ سے ہو سکے گا۔"

تشریح: حدیث کے راوی کا بیان ہے کہ جب ہم لوگ اس بات پر بیعت کرتے تھے کہ ہم حکم سنیں گے اور اسے مانیں گے اور اس کی پیروی کریں گے۔ آپ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ اپنے عہد و پیمان میں ان الفاظ کا اضافہ کرلو کہ ہم سمع و طاعت حسب استطاعت کریں گے۔ یہ درحقیقت آپ ﷺ کی شفقت تھی۔ آپ ﷺ چاہتے تھے کہ جو کام کسی سے نہ ہو سکے تو وہ اس کے لیے خدا کے یہاں گنہ گار نہ ٹھیرے۔

﴿۳﴾ وَ عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اَللّٰهُمَّ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ فَاَيُّمَا رَجُلٍ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ سَبَبْتُهٗ اَوْ لَعَنْتُهٗ اَوْ جَلَدْتُّهٗ فَاجْعَلْهَا لَهٗ زَكٰوةً وَّ رَحْمَةً. (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: "اے اللہ، میں ایک بشر ہوں، پس جس کسی مسلم شخص کو میں برا کہوں یا لعنت کروں یا ماروں تو اسے اس کے لیے عمدگی اور رحمت بنا دے۔"

تشریح: میں ایک بشر ہوں یعنی بشری کم زوریاں مجھ میں بھی ہوسکتی ہیں۔ ممکن ہے غصّہ کی حالت میں کسی مسلمان کو برا بھلا کہوں، اسے لعنت ملامت کروں یا اسے ماروں تو خدایا، تو اسے اس شخص کے حق میں باعثِ رحمت و برکت کردے۔ میری بد دعا اس کے حق میں دعا بن جائے۔

ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: اَللّٰھُمَّ فَاَیُّمَا مُؤمِنٍ سَبَبْتُہٗ فَاجْعَلْ ذٰلِکَ لَہٗ قُرْبَۃً اِلَیْکَ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ۔ (بخاری) ”اے اللہ، جس کسی مومن کو میں نے برا بھلا کہا ہو تو اس کو قیامت کے روز اس کے لیے قربت کا ذریعہ بنا دے۔“

نبیِ رحمت

〈۱〉 عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَؓ قَالَ: قِیْلَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ ادْعُ عَلَی الْمُشْرِکِیْنَ قَالَ: اِنِّیْ لَمْ اُبْعَثْ لَعَّانًا۔ وَ اِنَّمَا بُعِثْتُ رَحْمَۃً۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ (اپنے دشمن) مشرکین کے حق میں بددعا فرمایئے۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا: ”مجھے درحقیقت لعنت کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا گیا ہے، بل کہ مجھے تو رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے۔“

تشریح: یعنی میرا نمایاں وصف رحمت ہے۔ یہ چیز میرے شایان شان نہیں ہے کہ میں بددعا کروں گرچہ اہل شرک میری دشمنی میں حد درجہ سرگرم ہیں۔ میری بعثت کی غرض وغایت تو یہ ہے کہ میں لوگوں کو اللہ کی رحمت سے قریب کرنے کے لیے کوشاں رہوں۔ ایسی صورت میں یہ چیز مجھے ہرگز زیب نہیں دیتی کہ لعنت اور بددعائیں کرنے میں میری دل چسپی ہو۔

ترحّم

〈۱〉 عَنْ اَنَسٍؓ قَالَ: دَخَلْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ عَلٰی اَبِیْ سَیْفٍ الْقَیْنِ وَ کَانَ ظِئْرًا لِّاِبْرَاھِیْمَ فَاَخَذَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ اِبْرَاھِیْمَ فَقَبَّلَہٗ وَ شَمَّہٗ ثُمَّ دَخَلْنَا عَلَیْہِ بَعْدَ ذٰلِکَ وَ اِبْرَاھِیْمَ یَجُوْدُ بِنَفْسِہٖ فَجَعَلَتْ عَیْنَا رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ تَذْرِفُ فَقَالَ عَبْدُ الرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفٍؓ: وَ اَنْتَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ فَقَالَ: یَا ابْنَ عَوْفٍ، اِنَّھَا رَحْمَۃٌ۔ ثُمَّ اَتْبَعَھَا بِاُخْرٰی فَقَالَ: اِنَّ الْعَیْنَ تَدْمَعُ وَالْقَلْبُ یَحْزَنُ وَلَا نَقُوْلُ اِلَّا مَا یَرْضٰی رَبُّنَا وَ اِنَّا بِفِرَاقِکَ یَآ اِبْرَاھِیْمُ لَمَحْزُوْنُوْنَ۔ (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ابو سیف لوہار کے یہاں گئے

جو (آں حضرتؐ کے صاحب زادے) ابراہیم کی دایہ کے شوہر تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے ابراہیم کو (گود میں) لے کر ان کا بوسہ لیا اور انھیں سونگھا۔ اس واقعہ کے کچھ دنوں کے بعد ہم پھر ابوسیف کے یہاں گئے۔ ابراہیم اس وقت حالتِ نزع میں تھے۔ یہ دیکھ کر رسول اللہ ﷺ کی آنکھیں اشک بار ہو گئیں۔ عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ، آپؐ بھی روتے ہیں آپؐ نے فرمایا: ''اے ابن عوف، یہ رحمت ہے۔'' اس کے بعد پھر آپؐ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ آپؐ نے فرمایا: ''آنکھیں اشک بار ہیں اور دل غمگین ہے مگر ہم اس کے باوجود زبان سے وہی کہیں گے جس سے ہمارا رب راضی ہو۔ اے ابراہیم، یقیناً ہم تیری جدائی سے غم زدہ ہیں۔''

تشریح: صاحب زادے (ابراہیم) کو سونگھا صاحب زادے کو پیار کیا۔ منھ کے ساتھ ناک ان کے منھ پر اس طرح رکھی جیسے کوئی پھول سونگھتا ہو۔

حضرت ابراہیم آپ ﷺ کے صاحب زادے سولہ[۱۶] سترہ[۱۷] مہینے ہی کے تھے کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ یہاں ان کی بیماری اور حالت نزع کا ذکر کیا گیا ہے۔ حضور ﷺ نے جب یہ دیکھا کہ لختِ جگر ہمیشہ کے لیے آپ ﷺ سے جدا ہونے کو ہے تو آپ ﷺ کی آنکھیں اشک بار ہو گئیں۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کے یہ کہنے کا کہ یارسول اللہ آپؐ روتے ہیں؟ کا مطلب یہ ہے کہ اس قسم کے رقت انگیز مواقع پر تو عام لوگ روتے ہی ہیں۔ مگر ہم سمجھتے تھے کہ یہ بات آپ ﷺ کی عظمت اور شان کے منافی ہے کہ آپ ﷺ بھی آنسو بہائیں۔

''اے ابن عوف، یہ رحمت ہے'' یہ آپ ﷺ کا جواب تھا۔ یعنی جذبۂ ترحم اور الفت و محبت کا تقاضا یہی ہے کہ ایسے مواقع پر آدمی کو غم ہو اور اس کی آنکھیں نم ہو جائیں۔ یہ کیفیت کسی کمال اور عظمت شان کے منافی ہرگز نہیں ہے۔ پیغمبر دنیا میں اس لیے نہیں آتا کہ وہ لوگوں کو جذبات و احساسات سے عاری بنا دے بل کہ وہ ان کو زندگی کی صحیح فطری راہ دکھانے آتا ہے۔ انسان کی زندگی میں خوشیاں ہی نہیں، غم کے مواقع بھی آتے ہیں۔ غم کے موقع پر آدمی اظہارِ غم کرے لیکن اپنے خدا کے فیصلہ پر حرفِ شکایت زبان پر نہ لائے۔ انسان کے لیے بہترین اور صحیح روش یہی ہے۔

حضور ﷺ اپنے نواسے کے انتقال کے موقع پر بھی اپنی بیٹی حضرت زینبؓ کے یہاں تشریف لے گئے تھے۔ تشریف لے جانے سے پیش تر آپ ﷺ نے کہلا بھیجا تھا کہ اِنَّ لِلّٰهِ مَا اَخَذَ وَلَهٗ مَآ اَعْطٰی وَ كُلٌّ عِنْدَهٗ بِاَجَلٍ مُسَمًّى فَلْتَصْبِرْ وَلْتَحْتَسِبْ ''وہ چیز خدا ہی کی ہے جو اس نے لے لی اور وہ بھی اسی کی ہے جو اس نے دے رکھی ہو پس تمھیں صبر کرنا چاہیے اور ثواب کا طلب گار رہنا چاہیے۔'' بیٹی کے اصرار پر جب آپ ﷺ تشریف لے گئے اور بچہ کو آپ ﷺ کی گود میں دے دیا گیا تو اس وقت وہ جاں کنی کی حالت میں تھا۔ آپ ﷺ کی آنکھیں پرنم ہوگئیں۔ حضرت سعدؓ نے عرض کیا کہ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا هٰذَا ''یا رسول اللہ، یہ کیا ہے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: هٰذِهٖ رَحْمَةٌ جَعَلَهَا اللّٰهُ فِیْ قُلُوْبِ عِبَادِهٖ فَاِنَّمَا يَرْحَمُ اللّٰهُ مِنْ عِبَادِهِ الرُّحَمَاءَ۔ (بخاری ومسلم) ''یہ رحمت ہے جسے اللہ نے اپنے بندوں کے دلوں میں رکھا ہے۔ پس اللہ اپنے بندوں میں سے صرف انھی لوگوں پر رحمت فرماتا ہے جن کے دلوں میں جذبۂ ترحم پایا جاتا ہے۔'' یعنی یہ جذبۂ ترحم ہے۔ جو محمود ہے، نامحمود نہیں۔ ایسے مواقع پر جو چیز ممنوع ہے وہ چاک گریباں ہونا اور نوحہ کے ساتھ رونا وغیرہ ہے۔ غم اور صدمہ کا آدمی پر جو فطری ردِعمل ہوتا ہے اس کو معیوب سمجھنا کوتہ نظری اور دین کے اصل مزاج سے ناواقفیت کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

خوش مزاجی

﴿۱﴾ عَنْ جَرِيْرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِؓ مَا حَجَبَنِیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مُنْذُ اَسْلَمْتُ وَلَا رَاٰنِیْ اِلَّا ضَحِكَ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت جریر بن عبداللہؓ روایت کرتے ہیں کہ جب سے میں مسلمان ہوا، رسول اللہ ﷺ نے مجھے اندر آنے سے کبھی نہیں روکا اور جب بھی مجھے آپؐ نے دیکھا، ہنسے۔

تشریح: یعنی کبھی بھی آپ ﷺ مجھ سے خشک مزاجی کے ساتھ نہیں ملے بل کہ ہمیشہ آپ ﷺ خندہ روئی کے ساتھ پیش آئے۔

﴿۲﴾ وَ عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَؓ قَالَ: قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، اِنَّكَ تُدَاعِبُنَا، قَالَ: اِنِّیْ لَآ اَقُوْلُ اِلَّا حَقًّا۔ (ترمذی)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک دن صحابہؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ، آپؐ ہم سے خوش طبعی فرماتے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: ''میں (مزاح میں بھی) سچی بات ہی کہتا ہوں۔''

تشریح: صحابہؓ کا یہ کہنا کہ اے رسول اللہ، آپؐ ہم لوگوں سے خوش طبعی فرماتے ہیں۔ صحابہؓ کو غالباً خیال ہوا کہ شاید یہ چیز پیغمبر کے شایانِ شان نہ ہو کیوں کہ رتبہ و مقام کے لحاظ سے وہ نہایت بلند ہوتے ہیں۔

آپؐ کا یہ ارشاد کہ میں سچی بات ہی کہتا ہوں کا مطلب یہ ہے کہ میں مزاح اور خوش طبعی میں بھی میں حدود و آداب کا پورا خیال رکھتا ہوں۔ مثلاً میری مزاح کی باتوں میں بھی کوئی جھوٹی اور لچر بات ہرگز نہیں ہوتی۔

﴿۳﴾ وَ عَنْ اَنَسٍ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ لِامْرَاَۃٍ عَجُوْزٍ اَنَّہٗ لَا تَدْخُلُ الْجَنَّۃَ عَجُوْزٌ۔ فَقَالَتْ: وَمَا لَھُنَّ؟ وَ کَانَتْ تَقْرَءُ الْقُرْاٰنَ، فَقَالَ لَھَا: اَمَا تَقْرَئِیْنَ الْقُرْاٰنَ؟ اِنَّآ اَنْشَاْنٰھُنَّ اِنْشَآءً فَجَعَلْنَا ھُنَّ اَبْکَارًا۔ (شرح السنہ)

ترجمہ: حضرت انسؓ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے ایک بوڑھی عورت سے فرمایا (جب اس نے آپؐ سے یہ درخواست کی کہ میرے لیے آپؐ دعا فرمائیں کہ میں جنت میں داخل ہوں): ''بوڑھی عورت جنت میں نہ جائے گی۔'' اس نے کہا کہ آخر انھوں نے کیا قصور کیا ہے؟ وہ عورت قرآن پڑھی ہوئی تھی۔ آپؐ نے اس سے فرمایا: ''کیا تم نے قرآن میں یہ نہیں پڑھا ہے: اِنَّآ اَنْشَاْنٰھُنَّ اِنْشَآءً فَجَعَلْنٰھُنَّ اَبْکَارًا (الواقعہ: ۳۵-۳۶) (یقیناً ہم نے ان عورتوں کو (جنت میں) ایک خاص اٹھان پر اٹھایا اور ہم نے انھیں کنواریاں بنایا)''

تشریح: اس روایت سے معلوم ہوا کہ نبی ﷺ خشک مزاج نہ تھے۔ آپ ﷺ اپنے صحابہؓ کے ساتھ خوش طبعی بھی فرماتے تھے۔ لیکن آپ ﷺ کا مزاح مزاحِ لطیف ہوتا تھا۔ معتدل خوش طبعی درحقیقت صحتِ مزاج کی علامت ہے۔ بہ شرطے کہ اس سے مقصود کسی کی دل شکنی اور ایذا رسانی نہ ہو اور یہ بھی ضروری ہے کہ آدمی ہر وقت ہنسی مذاق ہی نہ کرتا رہے۔ کیوں کہ اس سے اس کی شخصیت بری طرح مجروح ہوتی ہے اور اس کے وقار کو سخت صدمہ پہنچتا ہے۔

﴿۴﴾ عَنْ عَدِیِّ بْنِ حَاتِمٍؓ قَالَ: لَمَّا نَزَلَتْ "حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَکُمُ الْخَیْطُ الْاَبْیَضُ مِنَ الْخَیْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ" قَالَ لَہٗ عَدِیٌّ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ، اِنِّیْٓ اَجْعَلُ تَحْتَ وِسَادَتِیْ عِقَالَیْنِ عِقَالاً اَبْیَضَ وَ عِقَالاً اَسْوَدَ اَعْرِفُ اللَّیْلَ مِنَ النَّھَارِ۔ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: اِنَّ وِسَادَکَ لَعَرِیْضٌ اِنَّمَا ھُوَ سَوَادُ اللَّیْلِ وَ بَیَاضُ النَّھَارِ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت عدی بن حاتمؓ بیان کرتے ہیں کہ جب آیت "حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَکُمُ الْخَیْطُ الْاَبْیَضُ مِنَ الْخَیْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ" (کھاؤ پیو) یہاں تک کہ تمھیں فجر کی سفید دھاری (شب کی) سیاہ دھاری سے نمایاں نظر آنے لگے" نازل ہوئی تو عدیؓ نے عرض کیا: یارسول اللہ، میں اپنے تکیہ کے نیچے دو ڈوریاں، ایک سفید اور ایک سیاہ رنگ کی رکھتا ہوں۔ اسی سے میں رات کو دن سے الگ پہچان لیتا ہوں آپؐ نے فرمایا: "تمھارا تکیہ تو بڑا ہی وسیع و عریض ہے۔ اس سے تو رات کی سیاہی اور دن کی سفیدی مراد ہے۔"

تشریح: یعنی رمضان کی راتوں میں صبح صادق سے پہلے تک کھانے پینے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ آیت میں بتایا گیا ہے کہ کھانے پینے کی اجازت اس وقت تک کے لیے ہے جب تک سپیدیِ سحر سیاہیِ شب سے نمایاں نظر نہ آئے۔

حضرت عدیؓ نے غلطی سے قرآن کی آیت میں مجاز کا حقیقی مفہوم لے لیا اور دو ڈوریاں ایک کالی اور ایک سفید رنگ کی اپنے تکیہ کے نیچے رکھ کر سونے لگے۔ اور جب اتنا اجالا ہو جاتا کہ وہ ڈوریوں کو دیکھ کر یہ پہچان لیتے کہ یہ سفید ڈوری ہے اور یہ سیاہ تو کھانا پینا بند کر دیتے۔

نبی ﷺ نے حضرت عدیؓ سے مزاحاً فرمایا کہ تمھارا یہ تکیہ تو بہت لمبا چوڑا ہے کہ صبح صادق اس کے نیچے طلوع ہوتی ہے۔ پھر وضاحت فرما دی کہ سفید اور سیاہ دھاگے سے مراد وہ نہیں ہے جو تم نے سمجھا ہے بل کہ اس سے رات کی سیاہی اور دن کی سفیدی مراد ہے جو افق میں نمایاں ہوتی ہے۔ اس کا تمھارے تکیہ کے نیچے رکھی ہوئی سیاہ اور سفید ڈوری سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

دل داری

﴿۱﴾ عَنْ اَنَسٍؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم کَانَ اِذَا صَافَحَ الرَّجُلَ لَمْ یَنْزِعْ یَدَہٗ مِنْ یَدِہٖ حَتّٰی یَکُوْنَ ھُوَ الَّذِیْ یَنْزِعُ یَدَہٗ وَلاَ یَصْرِفُ وَجْھَہٗ عَنْ وَّجْھِہٖ حَتّٰی یَکُوْنَ ھُوَ الَّذِیْ یَصْرِفُ وَجْھَہٗ عَنْ وَّجْھِہٖ وَلَمْ یُرَ مُقَدِّمًا رُکْبَتَیْہِ بَیْنَ یَدَیْ جَلِیْسٍ لَّہٗ۔ (ترمذی)

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی شخص سے مصافحہ کرتے تو اپنا ہاتھ اس وقت تک علیحدہ نہ کرتے جب تک کہ وہ شخص اپنا ہاتھ علیحدہ نہ کر لیتا۔ اور آپؐ اس وقت تک اس کی جانب سے منہ نہ پھیرتے جب تک وہ شخص آپؐ کے سامنے سے اپنا منہ نہ ہٹا لیتا۔ نیز آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی کسی نے اس حال میں نہیں دیکھا کہ آپؐ اپنے گھٹنے اپنے ہم جلیس کے سامنے کر کے بیٹھے ہوں۔

تشریح: یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق اور شفقت و محبت کا حال تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کسی سے مصافحہ کرتے تو جب تک دوسرا شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ نہ چھوڑتا آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے علیحدہ نہ کرتے۔ اور جب تک وہ شخص خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سے نہ ہٹ جاتا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی جانب سے روئے مبارک نہ ہٹاتے۔ بل کہ اس کی طرف متوجہ رہتے۔

مجلس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے لوگوں سے برتر اور بڑا ظاہر کرنے کے لیے کوئی امتیازی انداز ہرگز اختیار نہ فرماتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سب کے ساتھ بغیر زانو یا گھٹنا آگے بڑھائے بیٹھتے۔ بعض شارحینِ حدیث کے نزدیک اس سے مراد یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کے سامنے گھٹنے کھڑے کر کے نہ بیٹھتے اور بعض شارحین نے اس کا مفہوم یہ لیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کسی کے سامنے پاؤں پھیلا کر نہیں بیٹھا کرتے تھے۔

﴿۲﴾ وَ عَنِ ابْنِ عُمَرَؓ قَالَ: بَعَثَنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم فِیْ سَرِیَّۃٍ فَحَاصَ النَّاسُ حَیْصَۃً فَاَتَیْنَا الْمَدِیْنَۃَ فَاخْتَفَیْنَا بِھَا وَ قُلْنَا ھَلَکْنَا ثُمَّ اَتَیْنَا رَسُوْلَ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم فَقُلْنَا: یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ، نَحْنُ الْفَرَّارُوْنَ۔ قَالَ: بَلْ اَنْتُمُ الْعَکَّارُوْنَ وَ اَنَا فِئَتُکُمْ۔

(ترمذی)

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) رسول اللہ ﷺ نے ہمارا ایک لشکر بھیجا۔ لوگ دشمن کے مقابلہ سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ مدینہ واپس آئے تو (ندامت اور شرم کی وجہ سے) چھپ رہے۔ اور ہم نے کہا کہ ہم ہلاک ہوگئے۔ پھر ہم رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ، ہم تو فرار اختیار کرنے والے لوگ ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: ''نہیں، بل کہ تم حملہ پر حملہ کرنے والے لوگ ہو اور میں تمھاری جماعت ہوں۔''

تشریح: ''ہم ہلاک ہوگئے'' یعنی ہم ناقابلِ معافی جرم کے مرتکب ہوئے ہیں۔ اس لیے اب ہمیں ہلاکت اور تباہی سے کوئی نہیں بچا سکتا۔

آپ ﷺ نے سرزنش کرنے کے بجائے شفقت آمیز انداز میں اپنے اصحاب کی ہمت افزائی فرمائی اور ان کا دل رکھنے کے لیے فرمایا کہ بات یہ نہیں ہے کہ تم لوگوں نے میدان جہاد سے فرار اختیار کیا ہے بل کہ تم تو پلٹ پلٹ کر لڑنے والے لوگ ہو۔ بھاگنے والے دوسرے ہوا کرتے ہیں۔ یوں بھی جنگی حکمت عملی کے تحت کسی لشکر کا پیچھے ہٹنا اور نئی کمک کے ساتھ دوبارہ میدان میں اترنے کی فکر کرنی کوئی جرم بھی نہیں ہے۔

''اور میں خود تمھاری جماعت ہوں۔'' یعنی میں خود تمھارے ساتھ ہوں۔ تم سے الگ نہیں ہوں۔ تم کو اس عارضی پسپائی کا غم نہیں کرنا چاہیے۔ تمھارا رسول تمھاری پشت پر ہے۔ اور خدا کا رسول اپنی ذات میں پوری ایک جماعت کی حیثیت رکھتا ہے۔ تم ہرگز دل گرفتہ نہ ہو۔ خدا کی نصرت و مدد تمھارا ساتھ نہیں چھوڑے گی۔

عظمت و وقار

استقامت

﴿۱﴾ عَنْ عَلْقَمَةَ قَالَ: سَاَلْتُ اُمَّ الْمُؤْمِنِيْنَ عَآئِشَةَ قَالَ، قُلْتُ: يَآ اُمَّ الْمُؤْمِنِيْنَ كَيْفَ كَانَ عَمَلُ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ هَلْ كَانَ يَخُصُّ شَيْئًا مِّنَ الْاَيَّامِ؟ قَالَتْ: لَا، كَانَ عَمَلُهٗ دِيْمَةً، وَ اَيُّكُمْ يَسْتَطِيْعُ مَا كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَسْتَطِيْعُ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت علقمہؒ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے ام المومنین حضرت عائشہؓ سے دریافت کیا، کہتے ہیں کہ میں نے کہا اے ام المومنین رسول اللہ ﷺ کے عمل کا کیا حال تھا؟ کیا کسی عبادت کے لیے آپؐ کسی دن کو مخصوص فرماتے تھے؟ فرمایا: ''نہیں، آپؐ کا عمل ہمیشہ کا تھا۔ اور تم میں سے کون اتنی استطاعت رکھتا ہے جو رسول اللہ ﷺ رکھتے تھے۔''

تشریح: یعنی آپ ﷺ جو عمل اختیار فرماتے اور جو عبادت بھی کرتے اس پر مداومت اختیار فرماتے تھے۔ اسے کبھی ترک کرنا آپ ﷺ کو گوارا نہ ہوتا۔ یہ آپ ﷺ کی سیرت کا خاص وصف تھا۔ آپ ﷺ سے پوچھا گیا کہ کون سا عمل اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے: (اَیُّ الْعَمَلِ اَحَبُّ اِلَی اللّٰہِ تَعَالٰی) آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اَدْوَمُہٗ وَ اِنْ قَلَّ (مسلم) ''جس کی پابندی ہمیشہ کی جائے اگرچہ وہ عمل تھوڑا ہی ہو۔''

وہی اعمال آدمی کی سیرت اور اس کے کردار کا اصل حصہ ہوتے ہیں جن کو وہ عزم و استقلال کے ساتھ اختیار کرتا ہے اور کبھی انھیں ترک کرنے کا ارادہ نہیں کرتا۔

شانِ عفو

﴿۱﴾ عَنْ عَآئِشَةَ قَالَتْ مَا خُيِّرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بَيْنَ اَمْرَيْنِ قَطُّ اِلَّآ اَخَذَ اَيْسَرَهُمَا مَالَمْ يَكُنْ اِثْمًا فَاِنْ كَانَ اِثْمًا كَانَ اَبْعَدَ النَّاسِ مِنْهُ وَمَا انْتَقَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ

لِنَفۡسِہٖ فِیۡ شَیۡءٍ قَطُّ اِلَّآ اَنۡ یُّنۡتَھَکَ حُرۡمَۃُ اللّٰہِ فَیَنۡتَقِمُ لِلّٰہِ بِھَا۔ (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ”رسول اللہ ﷺ کو جب دو کاموں میں سے ایک کو کرنے کا اختیار دیا جاتا تو آپؐ ان میں سے جو آسان ہوتا اسی کو اختیار فرماتے بہ شرطے کہ اس کے گناہ کے موجب ہونے کا احتمال نہ ہوتا اور اگر اس کے گناہ کے موجب ہونے کا احتمال ہوتا تو آپؐ سب سے زیادہ اس سے دور رہنے والے شخص تھے۔ اور رسول خدا ﷺ نے کبھی کسی بات میں اپنی ذات کے لیے کسی سے بھی انتقام نہیں لیا۔ البتہ حرمتِ خداوندی کے پامال کرنے پر آپؐ ضرور خدا کی خاطر اس کی سزا دیتے تھے۔

تشریح: یعنی آپ ﷺ اپنی ذات کے لیے کبھی کسی سے انتقام نہیں لیتے تھے۔ شرعی حدود و احکام کو توڑنے والوں کو اگر سزائیں دی گئی ہیں تو یہ سزائیں خدا کے حکم کی تعمیل میں دی گئی ہیں۔ ان کے پیچھے کوئی ذاتی انتقامی جذبہ کارفرما نہیں رہا ہے۔ سزا ان ہی کو ملی جو خدا کی طرف سے سزا کے مستوجب ہو چکے تھے۔

〈۲〉 وَ عَنۡھَا قَالَتۡ: مَا ضَرَبَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ ﷺ شَیۡئًا قَطُّ بِیَدِہٖ وَلَا امۡرَاَۃً وَّلَا خَادِمًا اِلَّآ اَنۡ یُّجَاھِدَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَمَا نِیۡلَ مِنۡہُ شَیۡءٌ قَطُّ فَیَنۡتَقِمُ مِنۡ صَاحِبِہٖ اِلَّآ اَنۡ یُّنۡتَھِکَ شَیۡئًا مِّنۡ مَّحَارِمِ اللّٰہِ فَیَنۡتَقِمُ لِلّٰہِ عَزَّوَجَلَّ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ بیان فرماتی ہیں کہ رسولِ خدا ﷺ نے کبھی کسی کو اپنے ہاتھ سے نہیں مارا، نہ عورت کو اور نہ خادم کو، (نہ کسی اور کو) علاوہ اس صورت کے جب کہ آپؐ راہ خدا میں جہاد کر رہے ہوتے تھے۔ اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ آپؐ کو کوئی ذاتی اذیّت و تکلیف پہنچی ہو اور آپؐ نے اذیّت پہنچانے والے سے انتقام لیا ہو۔ البتہ اگر خدا کے احکام کو توڑا جاتا تو آپؐ ضرور خدا عزوجل کے لیے اس کی سزا دیتے۔“

تشریح: معلوم ہوا کہ عفو و درگزر سے کام لینا آپ ﷺ کا ذاتی شعار تھا۔ آپ ﷺ کبھی کسی پر ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے خواہ وہ بیوی ہو یا خادم یا اور کوئی۔ آپ ﷺ ہمیشہ لوگوں کے قصور معاف فرما دیا کرتے تھے اور انتقام لینے سے ہمیشہ گریز فرماتے تھے۔ اعلیٰ ظرفی کے بغیر آپ ﷺ کی سنت پر عمل کرنا کوئی آسان بات نہیں ہے۔

عفوودرگزر سے کام لینا اور لوگوں کی غلطیوں اور ان کے قصوروں کو معاف کردینا شاید فیاضی اور سخاوت کی سب سے اعلیٰ قسم ہے۔

تحمل

〈۱〉 عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِکٍؓ قَالَ: کُنْتُ اَمْشِیْ مَعَ النَّبِیِّ ﷺ وَ عَلَیْهِ بُرْدٌ نَجْرَانِیٌّ غَلِیْظُ الْحَاشِیَةِ فَاَدْرَکَهٗ اَعْرَابِیٌّ فَجَذَبَهٗ جَذْبَةً شَدِیْدَةً حَتّٰی نَظَرْتُ اِلٰی صَفْحَةِ عَاتِقِ النَّبِیِّ ﷺ قَدْ اَثَّرَتْ بِهٖ حَاشِیَةُ الرِّدَآءِ مِنْ شِدَّةِ جَذْبَتِهٖ ثُمَّ قَالَ: مُرْ لِیْ مِنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِیْ عِنْدَکَ فَالْتَفَتَ اِلَیْهِ فَضَحِکَ ثُمَّ اَمَرَ لَهٗ بِعَطَآءٍ۔

(بخاری)

ترجمہ: حضرت انس بن مالکؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نبی ﷺ کے ساتھ چل رہا تھا۔ اس وقت آپؐ کے جسم پر نجران کی بنی ہوئی موٹے کنارے کی چادر تھی۔ ایک اعرابی (گنوار بدوی) آپؐ کو ملا۔ اس نے آپؐ کو نہایت سختی کے ساتھ آپؐ کی چادر پکڑ کر کھینچا۔ یہاں تک کہ میں نے دیکھا کہ اس کے زور سے کھینچنے کی وجہ سے نبی ﷺ کی گردن پر چادر کے کنارے کا نشان پڑ گیا۔ پھر اس نے کہا کہ مجھے بھی اللہ کے اس مال میں سے جو تمھارے پاس ہے، کچھ دینے کا حکم دو۔ اس پر آپؐ اس کی طرف متوجہ ہوئے اور ہنسے، اور اسے کچھ دینے کا حکم دیا۔

تشریح: یہ واقعہ غزوہ حنین سے واپسی کا ہے۔ آپ ﷺ نے اس بدوی کی بدتمیزی کا کچھ خیال نہ فرمایا بل کہ ہنس کر ٹال دیا۔ اور اس کے مطالبہ کو بھی پورا فرما دیا۔

〈۲〉 وَ عَنْهُ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ اَنَّهٗ کَانَ عِنْدَهٗ رَجُلٌ بِهٖ اَثَرُ صُفْرَةٍ قَالَ وَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَا یَکَادُ یُوَاجِهُ اَحَدًا بِشَیْءٍ یَکْرَهُهٗ فَلَمَّا قَامَ قَالَ لِلْقَوْمِ: لَوْ قُلْتُمْ لَهٗ یَدَعُ هٰذِهِ الصُّفْرَةَ۔ (الشمائل لامام الترمذی)

ترجمہ: حضرت انس بن مالکؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک شخص بیٹھا تھا جس پر (کسم یا زعفران سے رنگا ہوا) زرد رنگ کا کپڑا تھا۔ آں حضرت ﷺ کی عادت تھی کہ آپؐ ناگوار

بات کو منہ در منہ منع نہ فرماتے تھے (اس لیے سکوت فرمایا) پھر جب وہ شخص چلا گیا تو آپؐ نے حاضرین سے فرمایا: ”تم لوگ اس کو زرد کپڑے سے منع کر دیتے تو اچھا ہوتا۔“

تشریح: یہ آپ ﷺ کی غایت درجہ کی شفقت اور مروت تھی کہ اکثر آپ ﷺ بالمواجہ ایسے امور سے منع نہ فرماتے کہ آدمی خفت محسوس کرے یا اس کی طرف سے کوئی برا ردّ عمل ظاہر ہو۔ لیکن اگر اس طرح کا اندیشہ نہ ہوتا تو آپ ﷺ بروقت قابل ترک چیزوں کو ترک کرنے کی تاکید فرماتے۔

یہاں یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ منھ در منھ ٹوکنے اور کسی بات سے منع کرنے میں توقف سے کام آپ ﷺ اس وقت لیتے جب وہ بات خلاف اولیٰ ہوتی یا اس کے ترک کرنے میں تاخیر ہونے سے چنداں نقصان نہ ہوتا۔ ورنہ صریح حرام چیز کے ارتکاب اور امر حق سے تجاوز کی صورت میں آپ ﷺ ہرگز یہ انداز اختیار نہ فرماتے۔

﴿۳﴾ وَ عَنْهُ قَالَ: لَمَّا قَدِمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ الْمَدِيْنَةَ اَخَذَ اَبُوْ طَلْحَةَ بِيَدِىْ فَانْطَلَقَ بِىْ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، اِنَّ اَنَسًا غُلَامٌ كَيِّسٌ فَلْيَخْدِمْكَ قَالَ: فَخَدَمْتُهُ فِي السَّفَرِ وَالْحَضَرِ وَاللّٰهِ مَا قَالَ لِىْ لِشَىْءٍ صَنَعْتُهُ لِمَ صَنَعْتَ هٰذَا هٰكَذَا وَلَا لِشَىْءٍ لَمْ اَصْنَعْهُ لِمَ لَمْ تَصْنَعْ هٰذَا هٰكَذَا۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ مدینہ تشریف لے آئے تو ابوطلحہ نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے آپؐ کے پاس لے گئے اور کہا کہ یارسول اللہ، انس ہوشیار لڑکا ہے۔ یہ آپؐ کی خدمت میں رہے گا۔ حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ پھر میں نے سفر و حضر ہر حال میں آپؐ کی خدمت کی۔ بہ خدا، آپؐ نے کسی کام کو جو میں نے کیا یہ نہ فرمایا کہ ”تو نے ایسا کیوں کیا۔“ اور جس کو میں نے نہیں کیا اس کے بارے میں یہ نہیں فرمایا کہ ”تو نے ایسا کیوں نہیں کیا۔“

تشریح: یہ غیر معمولی وصف اسی شخصیت کے اندر پایا جا سکتا ہے جو خلقِ خدا پر انتہائی مہربان اور اپنے خادموں کے لیے حد درجہ شفیق ہو۔ اور جس کو خدا کی جانب سے غیر معمولی سکون اور طمانینت (Peace of mind) کی دولت حاصل ہو۔

توکل

〈۱〉 عَنْ اَنَسٍؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم كَانَ لَا يَدَّخِرُ شَيْئًا لِغَدٍ۔ (ترمذی)

ترجمہ: حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم اپنے لیے کوئی چیز کل کے لیے جمع کر کے نہ رکھتے تھے۔

تشریح: مطلب یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کی ذات پر ایسا کامل اعتماد اور اس کے خزانۂ رحمت پر ایسا پورا بھروسہ تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے لیے کسی چیز کو بچا کر جمع کرنے کی کوشش نہیں کرتے تھے کہ وہ کل کام آئے گی۔ یہ بات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات خاص کے لیے مخصوص تھی۔ ورنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اکثر اپنے اہل وعیال کے لیے سال بھر کے اخراجات جمع کر کے رکھ دیتے کہ ممکن ہے کہ ضرورت کے وقت وہ صبر و تحمل سے کام نہ لے سکیں اور انھیں پریشانی لاحق ہو۔

〈۲〉 وَ عَنْ جَابِرٍؓ اَنَّهٗ غَزَا مَعَ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم قِبَلَ نَجْدٍ فَلَمَّا قَفَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم قَفَلَ مَعَهٗ فَاَدْرَكَتْهُمُ الْقَائِلَةُ فِيْ وَادٍ كَثِيْرِ الْعِضَاةِ فَنَزَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم وَ تَفَرَّقَ النَّاسُ يَسْتَظِلُّوْنَ بِالشَّجَرِ فَنَزَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم تَحْتَ سَمُرَةٍ فَعَلَّقَ بِهَا سَيْفَهٗ وَ نِمْنَا نَوْمَةً فَاِذَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم يَدْعُوْنَا وَ اِذَا عِنْدَهٗ اَعْرَابِيٌّ فَقَالَ: اِنَّ هٰذَا اخْتَرَطَ عَلَيَّ سَيْفِيْ وَ اَنَا نَآئِمٌ فَاسْتَيْقَظْتُ وَ هُوَ فِيْ يَدِهٖ صَلْتًا قَالَ مَنْ يَّمْنَعُكَ مِنِّيْ فَقُلْتُ اَللّٰهُ ثَلٰثًا وَ لَمْ يُعَاقِبْهُ وَ جَلَسَ۔ (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس غزوہ میں شریک تھے جو نجد کے اطراف میں پیش آیا تھا۔ پھر جب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم جہاد سے فارغ ہو کر واپس ہوئے تو جابرؓ بھی آپؐ کے ساتھ واپس ہوئے۔ صحابہؓ دوپہر میں ایک ایسی وادی میں پہنچے جس میں کیکر کے درخت کثیر تعداد میں تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (صحابہؓ کے ساتھ) وہیں اترے۔ اور تمام لوگ سایہ کی تلاش میں ادھر ادھر درختوں کے نیچے جا پڑے۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم بھی کیکر کے ایک درخت کے نیچے فروکش ہو گئے اور اپنی تلوار اس درخت پر لٹکا دی۔ (حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ) ہم لوگ تھوڑی نیند لینے کی غرض سے سو گئے کہ ناگہاں ہم نے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں آواز دے رہے ہیں۔ (ہم لوگ وہاں پہنچے تو) کیا دیکھتے ہیں کہ آپؐ کے پاس ایک بدوی موجود ہے۔

آں حضرتؐ نے فرمایا: ''اس نے مجھ پر میری تلوار کھینچی جب کہ میں سو رہا تھا۔ اور جب میری آنکھ کھل گئی تو کیا دیکھتا ہوں کی میری ننگی تلوار اس کے ہاتھ میں ہے۔ اس نے مجھ سے کہا کہ اب تمھیں میرے ہاتھ سے کون بچائے گا؟ میں نے کہا کہ اللہ۔ یہ بات تین بار کہی۔'' اور آپؐ نے اس بدوی کو کوئی سزا نہیں دی اور اٹھ کر بیٹھ گئے۔

تشریح: نازک موقع پر بھی آپ مطلق گھبرائے نہیں اور اپنے رب پر اعتماد اور کامل توکل کا اظہار فرمایا۔

ایک دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ جب رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا کہ مجھے اللہ بچائے گا، تو اعرابی کے ہاتھ سے تلوار گر گئی اور آں حضرت ﷺ نے اسے اٹھالیا اور فرمایا کہ اب بتا، تجھے میرے ہاتھ سے کون بچائے گا؟ اس نے کہا کہ آپ ﷺ تو بھلائی کے ساتھ گرفت کرنے والے شخص ہیں۔ (یعنی مجھے آپ ﷺ سے یہی امید ہے کہ آپ ﷺ مجھے از راہ لطف و نوازش معاف کر دیں گے اور میرے خلاف کوئی انتقامی کارروائی نہ کریں گے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: تَشْهَدُ اَنْ لّآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَنِّی رَسُوْلُ اللّٰهِ ''اچھا، گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ میں خدا کا رسول ہوں۔'' (یعنی جب تجھے مجھ پر اعتماد ہے تو تجھے میری دعوت اور میرے پیغام کے حق ہونے پر یقین کرنا چاہیے۔) اس نے کہا کہ ''نہیں، البتہ یہ عہد کرتا ہوں کہ نہ میں خود آپ ﷺ سے لڑوں گا اور نہ آپ ﷺ سے لڑنے والوں کا ساتھ دوں گا۔'' آپ ﷺ نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ اپنے ساتھیوں کے پاس گیا اور کہا: جِئْتُكُمْ مِنْ عِنْدِ خَيْرِ النَّاسِ ''میں تمھارے پاس ایک بہترین شخص کے پاس سے ہو کر آ رہا ہوں۔''

(کتاب حمیدی، ریاض الصالحین لامام محی الدین)

مروّت

﴿۱﴾ عَنْ عَآئِشَةَ ؓ اَنَّ رَجُلاً اِسْتَاْذَنَ عَلَى النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: بِئْسَ اَخُو الْعَشِيْرَةِ فَلَمَّا دَخَلَ اِنْبَسَطَ اِلَيْهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَ كَلَّمَهُ فَلَمَّا خَرَجَ قُلْتُ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، لَمَّا اسْتَاْذَنَ قُلْتَ: بِئْسَ اَخُو الْعَشِيْرَةِ. فَلَمَّا دَخَلَ اِنْبَسَطْتَ اِلَيْهِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: يَا عَآئِشَةُ اِنَّ اللّٰهَ لاَ يُحِبُّ الْفَاحِشَ الْمُتَفَحِّشَ.

(ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے نبی ﷺ سے اندر آنے کی اجازت مانگی۔ نبی ﷺ نے فرمایا: ''یہ شخص نہایت بُرا ہے اپنے کنبہ میں۔'' (آپؐ نے اجازت دے دی) پھر جب وہ اندر آیا تو آپؐ اس سے کھل کر ملے اور اس سے گفتگو فرمائی۔ جب وہ چلا گیا تو میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ، جب اس شخص نے اجازت مانگی تو آپؐ نے فرمایا کہ ''یہ شخص نہایت برا ہے اپنے کنبہ میں'' پھر جب وہ اندر آیا تو آپؐ اس سے کھل کر ملے۔ رسولِ خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اے عائشہ، اللہ فحش گو اور پھکڑ باز کو پسند نہیں کرتا۔''

تشریح: یعنی برے لوگوں کے ساتھ بھی ہم خوش اخلاقی سے پیش آئیں، اللہ کو یہی چیز پسند ہے۔ کسی بداخلاق شخص کی وجہ سے ہم حسنِ خلق سے ہرگز دست بردار نہ ہوں۔

آدمی اخلاق کے اعتبار سے کیسا ہے ــــ اس کا اندازہ اس سے بہ خوبی کیا جا سکتا ہے کہ وہ لوگوں سے کس طرح ملتا ہے اور لوگوں سے اس کی گفتگو کیسی ہوتی ہے۔ پھر حسن خلق اور نرمی کی یہ تاثیر ہے کہ اس کے ذریعہ سے بڑے سے بڑا دشمن بھی مطیع و فرماں بردار ہو سکتا ہے۔ اس لیے حکمت عملی کا تقاضا یہی ہے کہ ہم ہمیشہ اور ہر حال میں حسن خلق کو ملحوظ رکھیں۔

شجاعت

﴿۱﴾ عَنْ اَنَسٍ رضؓ **قَالَ: كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ** ﷺ **اَحْسَنَ النَّاسِ وَ اَجْوَدَ النَّاسِ وَ اَشْجَعَ النَّاسِ، قَالَ: وَ قَدْ فَزِعَ اَهْلُ الْمَدِيْنَةِ لَيْلَةً سَمِعُوْا صَوْتًا قَالَ فَتَلَقَّاهُمُ النَّبِيُّ** ﷺ **عَلٰى فَرَسٍ لِاَبِىْ طَلْحَةَ عُرْيٍ وَّ هُوَ مُقَلِّدٌ سَيْفَهٗ فَقَالَ: لَمْ تُرَاعُوْا لَمْ تُرَاعُوْا ثُمَّ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ** ﷺ**: وَجَدْتُّهٗ بَحْرًا يَعْنِى الْفَرَسَ۔** (بخاری)

ترجمہ: حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سب لوگوں سے زیادہ خوب صورت، سب سے زیادہ فیاض اور سب لوگوں سے بڑھ کر بہادر تھے۔ ایک مرتبہ رات کو ایک آواز سن کر اہلِ مدینہ مضطرب و خوف زدہ ہو گئے۔ راوی کا بیان ہے کہ پھر نبی ﷺ انھیں ملے۔ آپؐ ابوطلحہؓ کے گھوڑے پر جس پر زین نہ تھی، سوار تھے اور گردن میں آپؐ تلوار حمائل کیے ہوئے

تھے۔ آپؐ نے فرمایا: ''ڈرو نہیں، ڈرو نہیں۔'' پھر رسولِ خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''میں نے اس گھوڑے کو مثلِ دریا رواں اور تیز رو پایا۔''

تشریح: ایک رات کسی جانب سے کوئی ایسی آواز سنائی دی کہ اہلِ مدینہ کو چوروں یا دشمنوں کا خوف ہوا۔ لوگوں نے جدھر سے آواز سنی تھی، اس طرف چل پڑے۔ انھوں نے دیکھا کہ نبی ﷺ سب سے پہلے تن تنہا دشمن کی خبر لینے کے لیے گھر سے نکل پڑے تھے اور یہ پتہ لگا کر واپس لوٹ رہے تھے کہ دشمن وغیرہ کا اندیشہ صحیح نہ تھا۔ صورت حال کی تحقیق کے لیے آپ ﷺ کا سبقت کرنا اور تن تنہا گھر سے نکل پڑنا نہایت دلیری اور شجاعت کی بات تھی۔

آپ ﷺ نے لوگوں کو اطمینان دلایا کہ کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اس لیے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر خطرے کی کوئی آہٹ ملے تو صورت حال کی تحقیق کے لیے تن تنہا نکل پڑنا مستحب ہے بہ شرطے کہ ہلاکت میں پڑنے کا قوی اندیشہ نہ ہو۔ لیکن ایسے موقع پر خالی ہاتھ بغیر ہتھیار کے نکلنا صحیح نہ ہوگا۔

﴿۲﴾ وَ عَنِ الْبَرَآءِؓ قَالَ الْبَرَآءُ: كُنَّا وَاللّٰهِ اِذَا احْمَرَّ الْبَأْسُ نَتَّقِیْ بِهٖ وَ اِنَّ الشُّجَاعَ مِنَّا لَلَّذِیْ یُحَاذِیْ بِهٖ یَعْنِی النَّبِیَّ ﷺ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت براء بن عازبؓ سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ بہ خدا جب کبھی خون خوار اور گھمسان کی جنگ ہوتی تو ہم لوگ نبی ﷺ کی آڑ میں اپنا بچاؤ کرتے تھے اور یقیناً بہادر ہم میں وہ تھے جو لڑائی کا سامنا کرتے یعنی نبی ﷺ۔

تشریح: یعنی ایسے نازک موقع پر آپ ﷺ آگے ہوتے اور ہم آپ ﷺ کو اپنی اوٹ بنا لیتے۔ اس سے بھی نبی ﷺ کی شجاعت و جرأت کا بہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ جس کا اللہ پر ایمان ہوتا ہے اور جو اللہ کی نصرت پر یقین رکھتا ہے وہ کبھی موت کو خاطر میں نہیں لاتا۔ موت بھی ایسے شخص کے لیے حیاتِ ابدی کا ایک پیغام ہوتی ہے۔ اللہ کے نبی ﷺ سے بڑھ کر ایمان و یقین کس کو حاصل ہو سکتا ہے۔ صحیح مسلم کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی ﷺ نے انیس[۱۹] جنگوں میں شرکت فرمائی۔ آپ ﷺ محض ایک داعی ہی نہ تھے بل کہ لشکرِ اسلام کے ایک بہترین کمانڈر اور خدا کی راہ کے ایک جانباز مجاہد بھی تھے۔

غیرت

〈۱〉 عَنِ الْمُغِیْرَۃِ قَالَ: قَالَ سَعْدُ بْنُ عُبَادَۃَ: لَوْ رَأَیْتُ رَجُلاً مَعَ امْرَأَتِیْ لَضَرَبْتُہٗ بِالسَّیْفِ غَیْرَ مُصْفَحٍ، فَبَلَغَ ذٰلِکَ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ فَقَالَ: اَتَعْجَبُوْنَ مِنْ غَیْرَۃِ سَعْدٍ؟ وَاللّٰہِ لَاَنَا اَغْیَرُ مِنْہُ وَاللّٰہُ اَغْیَرُ مِنِّیْ وَ مِنْ اَجْلِ غَیْرَۃِ اللّٰہِ حَرَّمَ اللّٰہُ الْفَوَاحِشَ مَا ظَھَرَ مِنْھَا وَمَا بَطَنَ وَلَآ اَحَدٌ اَحَبُّ اِلَیْہِ الْعُذْرُ مِنَ اللّٰہِ، مِنْ اَجْلِ ذٰلِکَ بَعَثَ الْمُنْذِرِیْنَ وَالْمُبَشِّرِیْنَ وَلَآ اَحَدٌ اَحَبُّ اِلَیْہِ الْمِدْحَۃَ مِنَ اللّٰہِ وَ مِنْ اَجْلِ ذٰلِکَ وَعَدَ اللّٰہُ الْجَنَّۃَ۔ (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت مغیرہؓ روایت کرتے ہیں کہ سعد بن عبادہؓ نے فرمایا کہ اگر میں کسی غیر مرد کو اپنی بیوی کے ساتھ دیکھوں تو میں اسے تلوار سے ماردوں اور تلوار کی پشت کی جانب سے نہیں بل کہ اس کی دھار کی طرف سے۔ ان کی یہ بات رسولِ خدا ﷺ کو پہنچی تو آپؐ نے فرمایا: ''کیا تمھیں سعد کی غیرت پر تعجب ہو رہا ہے؟ بہ خدا میں ان سے کہیں زیادہ غیرت مند ہوں اور مجھ سے بھی بڑھ کر باغیرت خدا ہے۔ اسی وجہ سے کھلے اور چھپے تمام ہی بے حیائی کے کاموں کو حرام ٹھیرایا ہے۔ اور خدا سے زیادہ کوئی عذر کو محبوب نہیں رکھتا۔ اسی لیے اللہ نے ڈرانے والوں اور بشارت دینے والوں (یعنی پیغمبروں) کو بھیجا۔ نیز اللہ سے بڑھ کر کوئی تعریف کو پسند نہیں کرتا۔ اسی لیے اللہ نے جنت کا وعدہ فرمایا ہے۔''

تشریح: اس حدیث سے کئی باتیں معلوم ہوئیں ایک یہ کہ جس طرح کسی شخص کی غیرت اسے پسند نہیں کرتی کہ اس کی بیوی کسی دوسرے مرد کے آغوش میں دادِ عیش دے اسی طرح اللہ کی غیرت کو بھی یہ گوارا نہیں کہ اس کے بندے کسی قسم کے فواحش اور بے غیرتی کے کاموں میں ملوث ہوں۔ اسی لیے اس نے ایسے تمام ہی امور کو حرام قرار دے دیا ہے جو فواحش اور بے حیائی کے ذیل میں آتے ہیں۔

دوسری بات اس حدیث سے یہ معلوم ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں رسولوں اور نبیوں کو اسی لیے بھیجا تاکہ قیامت کے روز کوئی شخص یہ عذر پیش نہ کرسکے کہ مجھے تو خدا کا کوئی پیغام ملا ہی نہیں ورنہ میں زندگی میں خدا کا نافرمان بن کر ہرگز نہ رہتا۔ خدا نے انبیاء ورسل اسی لیے مبعوث

فرمائے کہ اتمام حجت ہو سکے اور لوگ خود کو معذور قرار نہ دے سکیں اور انھیں یہ شکایت کرنے کا موقع نہ ملے کہ انھیں صحیح راہ کی طرف رہ نمائی کرنے والا کوئی ملا ہی نہیں۔ قرآن میں بھی ہے:
رُسُلاً مُّبَشِّرِیْنَ وَ مُنْذِرِیْنَ لِئَلاَّ یَکُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَی اللّٰہِ حُجَّۃٌ بَعْدَ الرُّسُلِ ط (النساء:۱۶۵)
''رسول بشارت دینے والے اور ڈرانے والے بنا کر بھیجے گئے تاکہ رسولوں کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلہ میں کوئی حجت نہ رہے۔''

امام نوویؒ کے نزدیک اس حدیث میں لفظ عذر اعذار یعنی ازالۂ عذر کے معنی میں استعمال ہوا ہے تیسری بات جو اللہ کو پسند ہے اور سب سے بڑھ کر پسند ہے وہ ہے:

اعتراف حقیقت اور قدر شناسی کا وصف۔ کسی کی تعریف وہی کر سکتا ہے جو جوہر شناس ہو۔ جہاں قدر شناسی (Appreciation) نہیں وہاں بے حسی اور بے خبری کے سوا کوئی دوسری چیز نہیں پائی جا سکتی۔ خدا خود قدر شناس ہے۔ اسی لیے اس نے اپنے محبوب اور وفادار بندوں کی خود تعریف فرمائی ہے۔ اگر ہم خدا کی حمد اور تعریف کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اس کو جانتے اور اس کی عظمت کا علم رکھتے ہیں۔ منکرین حق کے بارے میں خدا کا تبصرہ یہ ہے: وَمَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖ (الانعام:۹۱) انھوں نے خدا کی قدر نہ پہچانی جیسی قدر پہچاننی چاہیے تھی۔'' قرآن کی پہلی آیت ہی زندگی کی سب سے بڑی یافت (Finding) کا پتہ دیتی ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ''سب تعریف اللہ رب العالمین کے لیے ہے۔'' سب سے بڑی حقیقت یہی ہے۔ انسان کی زندگی کو اسی حقیقت کا ترجمان ہونا چاہیے۔ اگر کسی کی زندگی فی الواقع اس بڑی حقیقت کا ترجمان بن جاتی ہے تو خدا سے بڑھ کر کوئی دوسرا اس کا قدرداں نہیں ہو سکتا۔ وہ لازماً اسے ہلاکت سے محفوظ رکھے گا اور اپنی جنت میں اسے جگہ عنایت فرمائے گا۔

فراخ دلی

(۱) عَنْ عَآئِشَۃَ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ قَالَ: لاَ نُوْرَثُ، مَا تَرَکْنَا صَدَقَۃٌ۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ہمارا کوئی وارث نہیں ہے۔ جو کچھ ہم نے چھوڑا وہ صدقہ ہے۔''

تشریح: نبی ﷺ اخلاق کے اتنے بلند مقام پر فائز تھے کہ آپ ﷺ کے شایان شان یہ بات نہیں ہوسکتی کہ آپ ﷺ عام انسانوں کی طرح اپنی اولاد کو اپنے ترکہ کا وارث قرار دیں۔ انبیاء علیہم السلام بے نفسی کے جس مقام پر ہوئے ہیں عام آدمی اس کا تصوّر بھی نہیں کرسکتا۔

〈۲〉 وَ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: لَا تَقْسِمُ وَرَثَتِیْ دِیْنَارًا مَّا تَرَكْتُ بَعْدَ نَفَقَةِ نِسَآئِیْ وَ مُؤْنَةِ عَامِلِیْ فَهُوَ صَدَقَةٌ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”میرے وارث ایک دینار بھی تقسیم نہیں کرسکتے۔ میں جو چھوڑ جاؤں اس میں سے میری بیویوں کے خرچ اور منتظم کی اجرت کے بعد جو بچے وہ صدقہ ہے۔“

تشریح: بیوں کا خرچ اور منتظم کی اجرت یعنی بنیادی اخراجات کے علاوہ جو کچھ بچتا ہے وہ ورثہ میں تقسیم نہیں ہوسکتا، وہ امت کے ضرورت مندوں کے لیے وقف ہوگا۔ نبی ﷺ کی اولاد عام لوگوں کی اولاد کی طرح نبی ﷺ کے ترکہ میں سے اپنے کسی حصے کا مطالبہ نہیں کرسکتی۔ بہ طور وراثت وہ ایک دینار بھی تقسیم نہیں کرسکتی۔

〈۳〉 وَ عَنْ عَآئِشَةَؓ زَوْجِ النَّبِیِّ ﷺ اَخْبَرَتْهُ اَنَّ فَاطِمَةَؓ بِنْتَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ سَأَلَتْ اَبَا بَكْرٍ بَعْدَ وَفَاةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ اَنْ یَّقْسِمَ لَهَا مِیْرَاثَهَا مِمَّا تَرَكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مِمَّا اَفَآءَ اللّٰهُ عَلَیْهِ فَقَالَ لَهَا اَبُوْ بَكْرٍؓ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: لَا نُوْرَثُ، مَا تَرَكْنَا صَدَقَةٌ۔ (مسلم)

ترجمہ: نبی اکرم ﷺ کی زوجہ مطہرہ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی صاحب زادی حضرت فاطمہؓ نے رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکرؓ سے رسول اللہ ﷺ کے اس ترکہ میں سے اپنا حصہ طلب کیا جو اللہ نے آپؐ کو دیا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے تو یہ ارشاد فرمایا ہے: ”ہمارا کوئی وارث نہیں ہوتا اور ہم جو چھوڑ جائیں وہ صدقہ ہے۔“

تشریح: صحیح مسلم کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت فاطمہؓ نے خیبر اور فدک اور مدینہ کی آمدنی میں اپنا حصہ مانگا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے معذرت کی کہ وہ ایسا نہیں کرسکتے کیوں کہ حضور ﷺ یہ

فرما گئے ہیں کہ ہمارا کوئی وارث نہیں ہوتا، ہم جو چھوڑ جائیں اس کی حیثیت صدقہ کی ہے۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے فرمایا: لَستُ تَارِكًا شَيْئًا كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَعْمَلُ بِهٖ اِلَّا عَمِلْتُ بِهٖ اِنِّیْ اَخْشٰی اِنْ تَرَكْتُ شَيْئًا مِنْ اَمْرِهٖ اَنْ اَزِيْغَ (مسلم) ''میں کوئی ایسا کام ترک نہیں کرسکتا جس کو رسول اللہ ﷺ کرتے رہے ہوں۔ مجھے خوف ہے کہ اگر میں نے آپ ﷺ کے کسی کام کو ترک کیا تو گم راہ ہو جاؤں گا۔''

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ جمہور کے نزدیک تمام ہی انبیاءؑ کا یہی حال ہے کہ ان کا کوئی وارث نہیں ہوتا۔

تواضع و انکسار

﴿۱﴾ عَنْ اَنَسٍؓ قَالَ: جَآءَ رَجُلٌ اِلَى النَّبِیِّ ﷺ فَقَالَ يَا خَيْرَ الْبَرِيَّةِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ذَاكَ اِبْرَاهِيْمُ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ ''اے مخلوق میں سب سے بہتر'' آپؐ نے فرمایا: ''وہ تو ابراہیمؑ تھے۔''

تشریح: کوئی آپ ﷺ کو خیر البریّہ کے لقب سے خطاب کرے، اس کو آپ ﷺ نے پسند نہیں فرمایا۔ اس لیے کہ یہ انکسار و تواضع کے خلاف تھا۔ آپ ﷺ کا یہ فرمانا کہ خیر البریّہ کہے جانے کے اصل مستحق حضرت ابراہیمؑ ہیں، از راہ تواضع تھا۔ پھر آپؐ کے پیش نظر حضرت ابراہیمؑ کی یہ حیثیت بھی تھی کہ وہ خلیل اللہ اور آپ ﷺ کے جدِ اعلیٰ تھے۔ یوں احادیث سے ثابت ہے کہ آں حضرت ﷺ تمام انبیاءؑ کے سردار ہیں۔ لیکن ایک شریف النفس انسان خواہ تعظیم و تکریم کا سب سے بڑھ کر مستحق وہی کیوں نہ ہو، بسا اوقات وہ اپنے مقابلہ میں دوسرے ہی کو ترجیح دیتا ہے۔

﴿۲﴾ وَ عَنْ عُمَرَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: لَا تُطْرُوْنِیْ كَمَا اَطْرَتِ النَّصَارٰی ابْنَ مَرْيَمَ فَاِنَّمَا اَنَا عَبْدُهٗ فَقُوْلُوْا ''عَبْدُ اللّٰهِ وَ رَسُوْلُهٗ۔'' (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم میری مدح و تعریف میں

حد سے تجاوز نہ کرو جس طرح نصاریٰ عیسیٰ بن مریم کی تعریف میں حد سے تجاوز کر گئے ہیں۔ میں تو بس خدا کا بندہ ہوں لہٰذا تم مجھے خدا کا بندہ اور اس کا رسول کہو۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ نصاریٰ حضرت مسیحؑ کی تعریف و توصیف میں اس قدر حد سے تجاوز کر گئے کہ انھوں نے سیدنا مسیحؑ کو خدا اور خدا کا بیٹا بنا کر دم لیا۔ تمھیں اس روش سے ہمیشہ دور رہنا چاہیے۔ انسان کے لیے سب سے اعلیٰ مقام اگر کوئی ہوسکتا ہے تو وہ عبودیت اور بندگی کا مقام ہے۔ عبودیت کی صفت نبی ﷺ میں کمال درجہ کو پہنچی ہوئی تھی۔ یہی آپ ﷺ کی عظمت کا اصل راز ہے۔ آپ ﷺ کی تعریف اور نعت میں کسی ایسے پیرایۂ بیان کو اختیار کرنے سے جو آپ ﷺ کے مقامِ عبودیت کے منافی ہو، احتراز ضروری ہے۔

"مجھے اللہ کا بندہ اور اس کا رسول کہو۔" بندگی کی صفت کو رسالت کے ساتھ جوڑنے کا خاص مقصد یہ ہے کہ احساس تازہ رہے کہ پیغمبر بھی خدا کا بندہ ہی ہوتا ہے اگرچہ وہ بندۂ کامل ہوتا ہے۔ اس طرح آپ ﷺ نے شرک کی جڑ ہمیشہ کے لیے کاٹ دی۔

﴿۳﴾ وَ عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍؓ قَالَ: كَانَتِ الْاَمَةُ مِنْ اِمَآءِ اَهْلِ مَدِيْنَةَ لَتَأْخُذُ بِيَدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَتَنْطَلِقُ بِهٖ حَيْثُ شَآءَتْ۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت انس بن مالکؓ کہتے ہیں کہ "مدینہ والوں کی لونڈیوں میں سے ایک لونڈی تھی۔ وہ رسول اللہ ﷺ کا ہاتھ پکڑتی اور جہاں چاہتی آپؐ کو لے جاتی۔"

تشریح: یعنی جب وہ آپ ﷺ سے کچھ کہنا سننا چاہتی یا اسے آپ ﷺ سے اپنی کسی پریشانی کا ذکر کرنا ہوتا تو وہ بے تکلف جہاں چاہتی آپ ﷺ کو لے جا کر باتیں کر لیتی۔ اس سے اس بات کا بہ خوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ آں حضرت ﷺ کے اندر کس درجہ تواضع اور بے نفسی پائی جاتی تھی۔ کسی لونڈی کے ساتھ جانے اور اس کی باتوں کو سننے میں آپ ﷺ کو ہرگز کسی کسرِ شان کا احساس نہیں ہوتا تھا۔

پھر اس سے اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ اپنی امت کے ایک ایک فرد کے لیے خواہ وہ کسی بھی حیثیت کا کیوں نہ ہو آپؐ کس قدر دردمند واقع ہوئے تھے اور لوگوں سے آپ ﷺ کس درجہ قلبی لگاؤ رکھتے تھے۔

〈۴〉 وَ عَنِ ابْنِ شِهَابٍؓ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: مَا يَنْبَغِي لِعَبْدٍ اَنْ يَّقُوْلَ: اِنِّي خَيْرٌ مِّنْ يُّوْنُسَ بْنِ مَتّٰى۔ (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت ابن شہابؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''کسی بندۂ خدا کے لیے یہ مناسب نہیں کہ وہ یہ کہے کہ میں (یعنی محمد ﷺ) یونس بن متّٰی سے بہتر ہوں۔''

تشریح: اسے آپ ﷺ نے تواضع کے خلاف سمجھا کہ کوئی آپ ﷺ کو حضرت یونسؑ سے بہتر قرار دے۔ یہ بات دوسرے انبیاء علیہم السلام کی تعظیم وتکریم کے منافی بھی ہے۔ پھر یہ اندیشہ بھی تھا کہ کہیں لوگ آپ ﷺ کو فضیلت دیتے ہوئے دوسرے نبیوں کی تحقیر نہ کرنے لگیں۔

آپؐ کیسے تھے؟

گھر والوں کے ساتھ

〈۱〉 عَنْ عَآئِشَةَؓ قَالَتْ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِاَهْلِهٖ وَ اَنَا خَيْرُكُمْ لِاَهْلِىْ۔ (ترمذی، دارمی)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تم میں بہترین شخص وہ ہے جو تم میں اپنے اہل وعیال کے حق میں سب سے بہتر ہو۔ اور میں اپنے اہل وعیال کے حق میں تم سب سے بہتر ہوں۔''

تشریح: آدمی کا معاملہ سب سے پہلے اپنے گھر والوں کے ساتھ پیش آتا ہے۔ اس لیے اس کے اچھے یا برے ہونے کا اظہار بھی سب سے پہلے گھر ہی پر ہوتا ہے۔ اس لیے اس حدیث میں کسی آدمی کے اچھے اور بہتر ہونے کی پہچان یہ قرار دی گئی ہے کہ تم دیکھو کہ اس کا برتاؤ اور سلوک اپنے اہل خانہ، عزیز واقارب اور اپنے ماتحتوں کے ساتھ کیسا ہے۔ اگر وہ اپنے اہل وعیال کے حق میں ایک بہترین شخص ثابت ہو رہا ہے تو سمجھ لو کہ وہ یقیناً ایک بہترین شخص ہے۔

نبی چوں کہ اپنی امت کے لیے اسوہ ہوتا ہے اس لیے زندگی کے ہر معاملہ میں اسے لوگوں کے مقابلہ میں بہتر اور فائق تر ہونا بھی چاہیے۔

〈۲〉 وَ عَنِ الْاَسْوَدِ بْنِ يَزِيْدَؓ قَالَ: سَاَلْتُ عَآئِشَةَؓ: مَا كَانَ النَّبِىُّ ﷺ يَصْنَعُ فِىْ بَيْتِهٖ؟ قَالَتْ: كَانَ يَكُوْنُ فِىْ مِهْنَةِ اَهْلِهٖ فَاِذَا حَضَرَتِ الصَّلٰوةُ قَامَ اِلَى الصَّلٰوةِ۔

(بخاری)

ترجمہ: حضرت اسود بن یزیدؓ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہؓ سے پوچھا کہ نبی ﷺ اپنے گھر میں ہوتے تھے تو کیا کرتے تھے؟ انھوں نے فرمایا: ''آپؐ اپنے گھر والوں کے کام میں لگے رہتے تھے اور جب نماز کا وقت آجاتا تو نماز کے لیے تشریف لے جاتے۔''

تشریح: یعنی گھر میں گھر والوں کی خدمت میں لگے رہتے لیکن نماز کا وقت آتے ہی مسجد تشریف لے جاتے۔ آپ ﷺ زندگی میں خدا اور اس کے بندوں دونوں ہی کے حقوق کا پورا خیال رکھتے تھے۔ اس سلسلہ میں آپ ﷺ کے یہاں جو توازن پایا جاتا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔

﴿۳﴾ وَ عَنْ عَآئِشَةَ رضی اللہ عنہا قَالَتْ: كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَقْسِمُ فَيَعْدِلُ وَ يَقُوْلُ: اَللّٰهُمَّ هٰذَا قَسْمِیْ فِيْمَآ اَمْلِكُ فَلَا تَلُمْنِیْ فِيْمَا تَمْلِكُ وَلَآ اَمْلِكُ يَعْنِی الْقَلْبَ۔

(ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ بیان فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اپنی بیویوں کے درمیان باری اور دیگر حقوق میں پورے عدل وانصاف سے کام لیتے اور دعا کرتے: ’’خدایا، میری یہ منصفانہ تقسیم تو وہ ہے جو میرے بس میں ہے۔ مگر جس چیز پر تجھ ہی کو اختیار حاصل ہے جو میرے اختیار سے باہر کی چیز ہے یعنی دل (اس لیے اگر کسی بیوی سے مجھے خصوصی تعلق خاطر ہے) تو اس پر تیری طرف سے میں قابلِ ملامت نہ ٹھہروں۔‘‘

تشریح: یہ حدیث بتاتی ہے کہ اگر کسی کے یہاں ایک سے زیادہ بیویاں ہوں تو اس کے لیے ضروری ہے کہ نان نفقہ، لباس اور دوسرے تمام ہی معاملات میں عدل وانصاف سے کام لے۔ کسی بھی معاملہ میں کسی بیوی کی حق تلفی نہ ہو۔ البتہ جہاں تک قلبی میلان کا تعلق ہے تو ممکن ہے اسے اپنی کسی خاص بیوی سے دوسری بیویوں کے مقابلہ میں زیادہ محبت ہو۔ اس پر خدا کے ہاں اس کی گرفت نہ ہوگی کیوں کہ کسی کا دل اس کے اپنے اختیار میں نہیں ہوتا۔ البتہ خدا کے یہاں کسی قسم کے مواخذہ سے بچنے کے لیے یہ لازمی ہے کہ آدمی حسن سلوک اور حقوق کے ادا کرنے میں اپنی تمام بیویوں کے درمیان ہمیشہ عدل وانصاف کو ملحوظ رکھتا ہو۔

﴿۴﴾ وَ عَنْ اَنَسٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: مَا رَأَيْتُ اَحَدًا كَانَ اَرْحَمُ بِالْعِيَالِ مِنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ كَانَ اِبْرَاهِيْمُ ابْنُهٗ مُسْتَرْضِعًا فِیْ عَوَالِ الْمَدِيْنَةِ يَنْطَلِقُ وَ نَحْنُ مَعَهٗ فَيَدْخُلُ الْبَيْتَ وَ اِنَّهٗ لَيُدَّخَنُ وَ كَانَ ظِئْرُهٗ قَيْنًا فَيَاْخُذُهٗ فَيُقَبِّلُهٗ ثُمَّ يَرْجِعُ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت انسؓ بیان فرماتے ہیں کہ میں نے رسولِ خدا ﷺ سے زیادہ کسی کو بھی اپنے اہل وعیال پر مہربان نہیں دیکھا۔ آپؐ کے صاحب زادے ابراہیم (جو ماریہ قبطیہؓ کے بطن سے

تھے) مدینہ کے بالائی حصے کی جانب (ایک دایہ کے یہاں) دودھ پینے کی غرض سے رکھے گئے تھے۔ آپؐ وہاں انھیں دیکھنے کے لیے تشریف لے جایا کرتے تھے۔ ہم بھی آپؐ کے ساتھ ہوتے تھے۔ آپؐ گھر میں تشریف لے جاتے جہاں دھواں گھٹا ہوتا، اس لیے کہ ان کی دایہ کے یہاں لوہار کا کام ہوتا تھا۔ پھر صاحب زادے کو گود میں لیتے، انھیں پیار کرتے اور بوسے لیتے پھر واپس ہوتے۔"

تشریح: عرب کے دستور کے مطابق صاحب زادے ابراہیم کو دودھ پینے کے لیے ایک دایہ (انّا) کے سپرد کیا گیا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیٹے کو دیکھنے برابر ابوسیف کے یہاں (جو حضرت ابراہیم کی انا کے شوہر تھے۔) جایا کرتے تھے۔ ابوسیف لوہار کا کام کرتے تھے۔ اس لیے ان کے گھر میں دھواں پھیلا رہتا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم دھوئیں بھرے گھر میں داخل ہونے سے اجتناب نہ فرماتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں داخل ہوتے اور ابراہیم کو دیکھتے اور پیار کرتے پھر واپس ہوتے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے بیٹے ابراہیم سے کتنی محبت تھی، اس کا اندازہ اس سے کر سکتے ہیں کہ جب شیر خوارگی ہی کی عمر میں حضرت ابراہیم کا انتقال ہوا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اِنَّ اِبْرَاهِیْمَ ابْنِیْ وَ اِنَّهٗ مَاتَ فِی الثَّدْیِ (مسلم) "ابراہیم میرا بیٹا اور وہ چھاتی کے بیچ (یعنی شیر خوارگی کی حالت میں) مرا ہے۔"

﴿۵﴾ وَ عَنْ عَآئِشَةَ ؓ قَالَتْ: مَا غِرْتُ عَلٰی اَحَدٍ مِّنْ نِّسَآءِ النَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وسلم مَا غِرْتُ عَلٰی خَدِیْجَةَ ؓ وَمَا رَأَیْتُهَا قَطُّ وَ لٰکِنْ کَانَ یُکْثِرُ ذِکْرَهَا وَ رُبَّمَا ذَبَحَ الشَّاةَ ثُمَّ یُقَطِّعُهَآ اَعْضَآءً ثُمَّ یَبْعَثُهَا فِیْ صَدَآئِقِ خَدِیْجَةَ ؓ فَرُبَّمَا قُلْتُ لَهٗ: کَاَنْ لَّمْ یَکُنْ فِی الدُّنْیَا امْرَاَةٌ اِلَّا خَدِیْجَةُ ؓ فَیَقُوْلُ: اِنَّهَا کَانَتْ وَ کَانَتْ وَ کَانَ لِیْ مِنْهَا وَلَدٌ۔

(بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ مجھے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں میں سے کسی پر بھی اتنا رشک نہ آتا جتنا خدیجہؓ پر آتا۔ میں نے خدیجہؓ کو دیکھا نہیں تھا لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کا ذکر اکثر فرماتے رہتے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ آپؐ بکری ذبح کرتے پھر اس کے ٹکڑے کرتے اور خدیجہؓ کی سہیلیوں کے یہاں بھیجتے۔ میں بسا اوقات آپؐ سے کہتی کہ گویا دنیا میں ایک خدیجہؓ کے سوا کوئی عورت تھی ہی نہیں۔ آپؐ فرماتے: یقیناً وہ ایسی اور ایسی (یعنی بہت اچھی) عورت تھیں۔ اور ان سے مجھے اولاد ہوئی۔"

تشریح: یہ حدیث بتاتی ہے کہ آپ ﷺ اپنی جانثار بیوی کو اس کی وفات کے بعد بھی بھول نہ سکے۔ بل کہ برابر یاد کرتے رہتے تھے۔ اور مرحومہ کی سہیلیوں کے یہاں گوشت کا تحفہ بھی بھیجتے رہتے۔ یہ دنیا سے جانے والی بیوی کا ایک حق تھا جو آپ ﷺ ادا فرماتے اور اس طرح اپنی رفیقۂ حیات کی یاد کو تازہ رکھنے کا سامان بھی کرتے تھے۔

〈۲〉 وَ عَنْهَاؓ قَالَتْ: رَاَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَسْتُرُنِىْ بِرِدَآئِهٖ وَ اَنَا اَنْظُرُ اِلَى الْحَبَشَةِ يَلْعَبُوْنَ فِى الْمَسْجِدِ حَتّٰى اَكُوْنَ اَنَا الَّتِىْ اَسْاَمُهٗ فَاقْدُرُوْا قَدْرَ الْجَارِيَةِ الْحَدِيْثَةِ السِّنِّ الْحَرِيْصَةِ عَلَى اللَّهْوِ۔ (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ”میری نظر میں یہ منظر ہے کہ نبی ﷺ مجھے اپنی چادر کی آڑ میں لے لیا کرتے تھے اور میں حبشی لوگوں کو مسجد میں فنِ سپہ گری (اور گدکے) کا کھیل کھیلتے دیکھتی تھی۔ جب تک کہ میں خود اس سے اکتا نہ جاتی آپؐ مجھے کھیل دکھاتے رہتے۔ لہٰذا لوگو، کم سن لڑکی کے جذبات کا خیال رکھو۔ اسے کھیل اور تفریح کا شوق ہوا کرتا ہے۔“

تشریح: حبشی غلام مسجد کے صحن میں نیزوں اور دوسرے اسلحوں کے چلانے کی مشق اور فنِ سپہ گری کا مظاہرہ کرتے۔ حضرت عائشہؓ کو آپ ﷺ یہ کھیل دکھاتے رہتے یہاں تک کہ جب حضرت عائشہؓ کا جی بھر جاتا تو وہ چلی جاتیں۔ حضرت عائشہؓ نوجوان تھیں۔ نبی ﷺ بہ خوبی سمجھتے تھے کہ اس عمر میں عورتوں کے جذبات کیا ہوتے ہیں۔ جائز حدود میں رہتے ہوئے عورتوں اور بالخصوص کم سن عورتوں کے جذبات کی رعایت ضروری ہے۔ اس کا اندازہ حضور ﷺ کے اس طرزِ عمل سے کیا جا سکتا ہے جس کا ذکر اس حدیث میں کیا گیا ہے۔

اپنے لوگوں اور رفقاء کے ساتھ

〈۱〉 عَنْ اَنَسٍؓ يُحَدِّثُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ اَنَّهٗ كَانَ يَعُوْدُ الْمَرِيْضَ وَ يَتْبَعُ الْجَنَازَةَ وَ يُجِيْبُ دَعْوَةَ الْمَمْلُوْكِ وَ يَرْكَبُ الْحِمَارَ۔ (البیہقی فی شعب الایمان)

ترجمہ: حضرت انسؓ نبی ﷺ کے متعلق بیان کرتے ہیں کہ آپؐ بیمار کی عیادت فرماتے، جنازہ کے ساتھ جاتے، مملوک و غلام کی دعوت قبول کر لیتے۔ اور گدھے پر سوار ہو لیتے۔“

تشریح: اس حدیث میں نبی ﷺ کی کچھ خاص خوبیاں بیان کی گئی ہیں۔ (۱) بیمار کی مزاج

پرسی کے لیے خود بہ نفس نفیس تشریف لے جاتے۔ عام لوگوں کی طرح آپ ﷺ بھی جنازہ کے ساتھ چلتے اور قبرستان پہنچتے۔

(۲) لوگوں کے درمیان فرق و امتیاز روا نہ رکھتے۔ غرور و تکبر کا آپ ﷺ کے یہاں مطلق گزر نہ تھا۔ آپ ﷺ ہر ایک سے محبت رکھتے تھے اور ہر ایک کے لیے آپ ﷺ کے دل میں جگہ تھی۔ ایک غلام اور مملوک بھی آپ ﷺ کو دعوت دیتا تو آپ ﷺ اس کی دعوت کو بھی شرف قبولیت بخشتے۔

(۳) گدھے پر سوار ہونے سے بھی آپ ﷺ گریز نہ فرماتے۔ تکلفات اور بے جا کرّوفر سے دور رہتے۔ دنیا پرست حکم رانوں جیسی کوئی خو بو آپ ﷺ کے اندر نہیں پائی جاتی تھی۔

〈۲〉 وَ عَنْ خَارِجَةَ بْنِ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ قَالَ: دَخَلَ نَفَرٌ عَلٰى زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍؓ فَقَالُوْا لَهٗ: حَدِّثْنَا اَحَادِيْثَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: كُنْتُ جَارَهٗ فَكَانَ اِذَا نَزَلَ عَلَيْهِ الْوَحْيُ بَعَثَ اِلَيَّ فَكَتَبْتُهٗ لَهٗ فَكَانَ اِذَا ذَكَرْنَا الدُّنْيَا ذَكَرَهَا مَعَنَا وَ اِذَا ذَكَرْنَا الْاٰخِرَةَ ذَكَرَهَا مَعَنَا وَ اِذَا ذَكَرْنَا الطَّعَامَ ذَكَرَهٗ مَعَنَا فَكُلُّ هٰذَا اُحَدِّثُكُمْ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ۔ (ترمذی)

ترجمہ: حضرت خارجہ بن زید بن ثابتؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ لوگوں کی ایک جماعت (میرے والد) زید بن ثابتؓ کے پاس آئی اور ان سے کہا کہ آپ ہم سے رسول اللہ ﷺ کی کچھ احادیث بیان کیجیے۔ انھوں نے فرمایا: ''میں آں حضرتؐ کے بالکل پڑوس میں رہتا تھا۔ جب آپؐ پر وحی نازل ہوتی تو مجھے بلا بھیجتے۔ میں خدمت میں پہنچ کر آپؐ کے حکم سے وحی لکھتا۔ آپؐ کی عادت شریفہ یہ تھی کہ جب ہم دنیا کا ذکر کرتے تو آپؐ بھی ہمارے ساتھ دنیا کا ذکر فرماتے اور جب ہم آخرت کا ذکر کرتے تو آپؐ بھی ہمارے ساتھ آخرت کا تذکرہ فرماتے اور ہم کھانے پینے کا ذکر کرتے تو آپؐ بھی ہمارے ساتھ اس کا ذکر فرماتے۔ یہ ہر ایک بات میں تم لوگوں کو رسول اللہ ﷺ کی بتا رہا ہوں۔''

تشریح: حضرت زید بن ثابتؓ کے اس قول کا کہ میں آپ ﷺ کا پڑوسی تھا کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ کے حالات، معمولات اور اخلاق و عادات کا علم دوسرے لوگوں کے مقابلہ میں انھیں زیادہ ہے۔

یہ حدیث بتاتی ہے کہ لوگوں کے ساتھ آپ ﷺ کے معاشرتی تعلقات و روابط بے حد خوش گوار اور بے تکلفانہ قسم کے تھے۔ آپ ﷺ لوگوں کی گفتگوؤں میں شریک ہوتے تھے خواہ ان کا تعلق دین سے ہو یا وہ امور دنیا سے متعلق ہوں۔ امور مباح میں آپ ﷺ اپنے صحابہؓ کے ساتھ بات چیت میں ساتھ دینے سے گریز نہیں کرتے تھے۔ گرچہ آپ ﷺ کی مجلس اصلاً دینی اور علمی ہی ہوتی تھی۔ اور ضروری اور کام کی باتوں کے علاوہ لایعنی باتوں سے آپ ﷺ اپنی زبان کو ہمیشہ محفوظ رکھتے تھے۔

یہ حدیث اس بات کا بین ثبوت ہے کہ آں حضرت ﷺ کی زندگی ہر قسم کی بناوٹ اور مصنوعیت (Artificiality) سے یکسر پاک تھی۔ آپ ﷺ اپنی معاشرتی زندگی میں بشری اور فطری تقاضوں کو بھی یکسر نظر انداز نہیں کرتے تھے۔ جن باتوں پر لوگ تعجب کرتے تھے آپ ﷺ بھی تعجب کرتے اور جن باتوں پر لوگ خوشی کا اظہار کرتے آپ ﷺ بھی خوش ہوتے۔ بشریت کی سطح سے اپنے آپ کو کبھی بھی آپ ﷺ نے بلند قرار نہیں دیا اور نہ کبھی کوئی ایسا انداز اختیار فرمایا جس کا مقصد یہ رہا ہو کہ لوگ زیادہ سے زیادہ آپ ﷺ سے مرعوب ہوں اور زیادہ سے زیادہ آپ ﷺ کی تعظیم و تکریم کریں۔ جو بھی آپ ﷺ کے قریب آتا آپ ﷺ کو مہربان وشفیق پاتا۔

راوی کے اس قول سے مستند اور صحیح روات کی ضرورت و اہمیت ظاہر ہوتی ہے حضرت زیدؓ یہ یقین دلا رہے ہیں کہ یہ عادت مبارکہ نبی ﷺ کی تھی۔ تمھیں اس میں کسی قسم کا شبہ دامن گیر نہ ہونا چاہیے۔

﴿۳﴾ وَ عَنْ جَابِرٍؓ قَالَ: كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَتَخَلَّفُ فِي الْمَسِيْرِ فَيُزْجِي الضَّعِيْفَ وَ يُرْدِفُ وَ يَدْعُوْ لَهُمْ۔ (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت جابرؓ بیان کرتے ہیں کہ ”رسول اللہ ﷺ سفر میں قافلے کے پیچھے چلتے، کم زوروں کو اپنی سواری پر بٹھا لیتے اور ان کے حق میں دعا فرماتے۔“

تشریح: یہ تھی آپ ﷺ کی شفقت ومحبت کہ کسی کی خیر خواہی فرماتے تو پوری خیر خواہی فرماتے، ضعیفوں اور کم زوروں کو نہ صرف یہ کہ اپنی سواری پر اپنے ساتھ بٹھا لیتے بل کہ ان کے حق میں دعا بھی فرماتے کہ ان کو دنیا وآخرت دونوں میں فلاح حاصل ہو۔

﴿۴﴾ وَ عَنْ عَوْفِ بْنِ مَالِكِ الْاَشْجَعِيِّؓ قَالَ: أَتَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فِي غَزْوَةِ

تَبُوکَ وَ هُوَ فِی قُبَّةٍ مِّنْ اَدَمٍ فَسَلَّمْتُ فَرَدَّ عَلَیَّ وَ قَالَ: اُدْخُلْ فَقُلْتُ اَکُلِّیْ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، قَالَ: کُلُّکَ، فَدَخَلْتُ۔ (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت عوف بن مالک اشجعیؓ کہتے ہیں کہ غزوۂ تبوک کے موقع پر میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپؐ اس وقت چمڑے کے ایک چھوٹے سے خیمہ میں تشریف فرما تھے۔ میں نے (باہر سے) سلام کیا، آپؐ نے میرے سلام کا جواب دیا اور فرمایا: ''اندر آجاؤ'' اس پر میں نے عرض کیا کہ کیا میں پورا اندر آجاؤں؟ آپؐ نے فرمایا: ''پورے ہی داخل ہو جاؤ'' پھر میں اندر داخل ہو گیا۔

تشریح: اس حدیث کے ایک راوی عثمان بن ابی العاتکہ کا بیان ہے کہ جس خیمہ میں نبی ﷺ تشریف رکھتے تھے وہ ایک چھوٹا سا خیمہ تھا۔ اسی لیے حضرت عوفؓ نے کہا کہ کیا میں خیمہ میں پورے طور پر آجاؤں۔ یعنی خیمہ چھوٹا ہے، میں اس میں پورا آبھی سکتا ہوں یا نہیں۔

اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آں حضرت ﷺ اپنے صحابہؓ کے ساتھ بے تکلف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہؓ بھی کبھی کبھی آپ ﷺ سے مزاح کر لیتے تھے۔

﴿۵﴾ وَ عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِکٍؓ قَالَ: مَرَّ اَبُوْ بَکْرٍ وَالْعَبَّاسُ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمَا بِمَجْلِسٍ مِّنْ مَّجَالِسِ الْاَنْصَارِ وَ هُمْ یَبْکُوْنَ۔ فَقَالَ مَا یُبْکِیْکُمْ؟ قَالُوْا: ذَکَرْنَا مَجْلِسَ النَّبِیِّ ﷺ مِنَّا، فَدَخَلَ عَلَی النَّبِیِّ ﷺ فَاَخْبَرَهٗ بِذٰلِکَ۔ قَالَ: فَخَرَجَ النَّبِیُّ ﷺ وَ قَدْ عَصَبَ عَلٰی رَاْسِهٖ حَاشِیَةَ بُرْدٍ، قَالَ: فَصَعِدَ الْمِنْبَرَ وَلَمْ یَصْعَدْهُ بَعْدَ ذٰلِکَ الْیَوْمِ، فَحَمِدَ اللّٰهَ وَ اَثْنٰی عَلَیْهِ ثُمَّ قَالَ: اُوْصِیْکُمْ بِالْاَنْصَارِ فَاِنَّهُمْ کَرِشِیْ وَ عَیْبَتِیْ وَ قَدْ قَضَوُا الَّذِیْ عَلَیْهِمْ وَ بَقِیَ الَّذِیْ لَهُمْ فَاقْبَلُوْا مِنْ مُّحْسِنِهِمْ وَ تَجَاوَزُوْا عَنْ مُّسِیْئِهِمْ۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت انس بن مالکؓ بیان کرتے ہیں کہ (آں حضرت ﷺ کے مرض وفات کے دوران ایک روز) حضرت ابوبکر و حضرت عباس رضی اللہ عنہما انصار کی ایک مجلس کے پاس سے گزرے۔ دیکھا کہ وہ رو رہے ہیں۔ پوچھا کہ آپ لوگ کیوں رو رہے ہیں؟ انھوں نے کہا کہ ہمیں اپنی نسبت نبی ﷺ کی مجلس یاد آگئی۔ (یہ سن کر) ان میں سے کوئی صاحب نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپؐ کو اس سے آگاہ کیا۔ راوی کا بیان ہے کہ نبی ﷺ باہر

تشریف لے آئے۔ اس وقت آپؐ چادر کا ایک گوشہ پٹی کے طور پر اپنے سر پر باندھے ہوئے تھے۔ پھر آپؐ منبر پر چڑھے اور اس کے بعد پھر کبھی آپؐ کو منبر پر چڑھنے کا موقع نہ مل سکا۔ آپؐ نے اللہ کی حمد اور اس کی ثنا بیان کی۔ پھر فرمایا: ''میں تمھیں انصار کے بارے میں وصیت کرتا ہوں (کہ ان کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آنا) کیوں کہ ان کی حیثیت میرے معدہ اور میری گٹھری کی ہے۔ ان پر جو حق تھا وہ اسے ادا کر چکے اور جو ان کا حق ہے وہ ادا ہونا باقی ہے۔ پس ان کے نیک لوگوں کا عذر قبول کرنا اور ان کے بروں سے درگزر کرنا۔''

تشریح: ''انصار کی حیثیت میرے معدہ اور گٹھری کی ہے'' کا مفہوم یہ ہے کہ انصار میرے معتمد علیہ ہیں۔ میں نے تمام امور میں ان پر اعتماد کیا ہے۔ اور انھوں نے میرے اعتماد کو کبھی مجروح نہیں کیا۔ وہ میرے رازدار ہیں۔ وہ کسی پہلو سے ہم سے دور نہیں ہیں۔

انصار نے راہِ حق میں جان و مال الغرض ہر چیز سے انھوں نے ہمارا ساتھ دیا۔ ان کے جذبۂ خیر خواہی میں کبھی بھی کسی دَور میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔

ان (انصارؓ) کے نمایندوں نے مکہ پہنچ کر لیلۃ العقبہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک پر اسلام کی بیعت کرتے ہوئے اپنی طرف سے جس مدد اور تعاون کا وعدہ کیا تھا تاریخ شاہد ہے کہ یہ وعدہ انھوں نے پورا کر کے دکھا دیا۔ انصار کے ذمّہ جو حق تھا اس کو تو انھوں نے کماحقہ ادا کر دیا۔ اب جو چیز باقی ہے وہ یہ ہے کہ انصار کے حقوق کا بھی پاس ولحاظ رکھا جائے۔ ان کے ساتھ نرمی برتی جائے۔ ان کے نیک لوگ اگر اپنی کسی کوتاہی یا لغزش پر کوئی عذر پیش کریں تو اسے قبول کیا جائے اور اگر ان کے کچھ افراد سے کوئی ایسی غلطی سرزد ہو جائے جس کے لیے وہ کوئی عذر پیش نہ کر سکتے ہوں تو ان سے درگزر کیا جائے۔ ان کے ساتھ کسی طرح کی سختی زیادتی اور بے انصافی روا نہیں۔ انصار نے جو قربانیاں پیش کی ہیں۔ یقیناً خدا انھیں آخرت میں ان قربانیوں کی جزا اور انعام عطا فرمائے گا۔ آخرت میں ان کو اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت و رفاقت بھی حاصل ہوگی۔

کسی غریب کے ساتھ

(۱) عَنْ اَنَسٍؓ اَنَّ رَجُلاً مِّنْ اَهْلِ الْبَادِيَةِ كَانَ اسْمُهٗ زَاهِرَ بْنَ حَرَامٍ وَ كَانَ يُهْدِئُ لِلنَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم مِنَ الْبَادِيَةِ اَدِيْتُنَا وَ نَحْنُ حَاضِرُوْهُ وَ كَانَ النَّبِيُّ صلی اللہ علیہ وسلم يُحِبُّهٗ وَ كَانَ دَمِيْمًا فَاَتَى النَّبِيُّ صلی اللہ علیہ وسلم فَيُجَهِّزُهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم اِذَآ اَرَادَ اَنْ

يَّخْرُجَ فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ اِنَّ زَاهِرًا بَ يَوْمًا وَ هُوَ يَبِيْعُ مَتَاعَهُ فَاحْتَضَنَهُ مِنْ خَلْفِهِ وَ هُوَ لَا يُبْصِرُهُ فَقَالَ: اَرْسِلْنِيْ مَنْ هٰذَا؟ فَالْتَفَتَ فَعَرَفَ النَّبِيَّ ﷺ فَجَعَلَ لَا يَأْلُوْ مَآ اَلْزَقَ ظَهْرَهُ بِصَدْرِ النَّبِيِّ ﷺ حِيْنَ عَرَفَهُ، وَ جَعَلَ النَّبِيُّ ﷺ يَقُوْلُ: مَنْ يَّشْتَرِي الْعَبْدَ؟ فَقَالَ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، اِذًا وَاللّٰهِ تَجِدُنِيْ كَاسِدًا، فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: لٰكِنْ عِنْدَ اللّٰهِ لَسْتَ بِكَاسِدٍ۔ (شرح السنہ)

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ گاؤں کا رہنے والا ایک شخص تھا جس کا نام زاہر بن حرامؓ تھا۔ وہ گاؤں سے نبی ﷺ کے لیے بہ طور ہدیہ کچھ (سبزی وغیرہ) لایا کرتا تھا۔ جب وہ جانے کا ارادہ کرتا تو نبی ﷺ اس کے لیے شہر کا کچھ سامان کر دیا کرتے۔ نبی ﷺ نے فرمایا: ''زاہر ہمارا گاؤں ہے اور ہم اس کا شہر ہیں۔'' نبی ﷺ اس سے محبت رکھتے تھے حالاں کہ وہ ایک بدصورت شخص تھا۔ ایک روز نبی ﷺ (بازار) تشریف لے گئے تو زاہرؓ اپنا سودا بیچ رہا تھا۔ آپؐ نے پیچھے سے اسے گود میں لے لیا۔ وہ آپؐ کو دیکھ نہیں رہا تھا۔ اس نے کہا: مجھے چھوڑ دو، یہ کون شخص ہے؟ جب مڑ کر دیکھا تو نبی ﷺ کو پہچان لیا۔ پھر وہ پوری کوشش کرنے لگا کہ اپنی پیٹھ کو نبی ﷺ کے سینۂ مبارک سے چمٹائے رہے۔ ادھر نبی ﷺ آواز لگانے لگے کہ ''کون اس غلام کو خریدتا ہے؟'' زاہرؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ، بہ خدا آپؐ مجھے ناکارہ پائیں گے۔ اس پر نبی ﷺ نے فرمایا: ''لیکن خدا کے نزدیک تم ناکارہ نہیں ہو۔''

تشریح: ''زاہر ہمارا گاؤں ہے اور ہم اس کا شہر ہیں'' مطلب یہ ہے کہ وہ ہمیں دیہات کی چیزیں دیتے ہیں اور ہم ان کے لیے شہر کی چیزیں فراہم کرتے ہیں۔

''کون اس غلام کو خریدتا ہے۔'' یہ بات آپ ﷺ نے مزاحاً فرمائی۔ لیکن یہ کوئی جھوٹ بھی نہ تھا کیوں کہ زاہرؓ بہ ہر حال خدا کے غلام تھے۔

آپؐ کے اس ارشاد کا کہ تم ناکارہ نہیں ہو کا مطلب ہوتا ہے کہ خدا کی نگاہ میں تمھاری بڑی قدر و قیمت ہے۔ خدا کی نگاہ میں جس کی قدر و منزلت ہو اسے ناکارہ کیسے کہا جا سکتا ہے۔

بچوں کے ساتھ

〈۱〉 عَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ ؓ قَالَ: صَلَّيْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ صَلٰوةَ الْاُوْلٰى ثُمَّ خَرَجَ اِلٰى اَهْلِهِ وَ خَرَجْتُ مَعَهُ فَاسْتَقْبَلَهُ وِلْدَانٌ فَجَعَلَ يَسْمَحُ خَدَّىْ اَحَدِهِمْ

وَاحِدًا وَاحِدًا وَ اَمَّا اَنَا فَمَسَحَ خَدِّیْ فَوَجَدْتُ لِیَدِہٖ بَرْدًا اَوْ رِیْحًا کَاَنَّمَا اَخْرَجَھَا مِنْ جُوْنَۃِ عَطَّارٍ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت جابر بن سمرہؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ظہر کی نماز ادا کی۔ پھر آپؐ اپنے گھر والوں کے پاس جانے کے لیے (مسجد سے) باہر نکلے۔ میں بھی آپؐ کے ساتھ باہر آیا۔ آں حضرتؐ کے سامنے کچھ بچے آ گئے۔ آپؐ نے ان میں سے ہر ایک کے رخساروں پر ہاتھ پھیرا۔ اور پھر میرے رخساروں پر بھی آپؐ نے ہاتھ پھیرا۔ اس وقت میں نے آپؐ کے دستِ مبارک کو ایسا ٹھنڈا اور خوش بودار پایا گویا آپؐ نے اپنے ہاتھ کو ابھی عطر کے ڈبّہ سے نکالا ہو۔

تشریح: اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بچوں سے کس قدر پیار کرتے تھے۔ اور بچے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حد درجہ محبوب رکھتے تھے۔

﴿۲﴾ عَنْ بُرَیْدَۃَؓ قَالَ: کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم یَخْطُبُنَا اِذْ جَآءَ الْحَسَنُ وَالْحُسَیْنُ وَ عَلَیْھِمَا قَمِیْصَانِ اَحْمَرَانِ یَمْشِیَانِ وَ یَعْثُرَانِ فَنَزَلَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم مِنَ الْمِنْبَرِ فَحَمَلَھُمَا وَ وَضَعَھُمَا بَیْنَ یَدَیْہِ ثُمَّ قَالَ: صَدَقَ اللّٰہُ اِنَّمَآ اَمْوَالُکُمْ وَ اَوْلَادُکُمْ فِتْنَۃٌ۔ نَظَرْتُ اِلٰی ھٰذَیْنِ الصَّبِیَّیْنِ یَمْشِیَانِ وَ یَعْثُرَانِ فَلَمْ اَصْبِرْ حَتّٰی قَطَعْتُ حَدِیْثِیْ وَ رَفَعْتُھُمَا۔ (ترمذی، ابوداؤد، نسائی)

ترجمہ: حضرت بریدہؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے سامنے خطبہ دے رہے تھے کہ اچانک حسنؓ اور حسینؓ آ گئے۔ دونوں سرخ کرتے پہنے ہوئے تھے وہ اس طرح چلے آ رہے تھے کہ (کم سنی کی وجہ سے) گر گر پڑتے تھے۔ یہ دیکھ کر رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم منبر سے نیچے اترے اور ان دونوں کو گود میں اٹھا لیا اور پھر اپنے روبرو انھیں بٹھا کر فرمایا: ''اللہ نے سچ کہا ہے کہ تمھارے مال اور تمھاری اولاد تو محض ایک آزمائش ہیں۔'' میں نے ان بچوں کو دیکھا کہ یہ گرتے پڑتے چلے آ رہے ہیں تو مجھ سے رہا نہ گیا تو میں نے اپنی بات قطع کر کے انھیں اٹھا لیا۔''

تشریح: بچوں اور بالخصوص اولاد پر شفقت کرنی ایک پسندیدہ عمل ہے۔ اس لیے خطبہ کو چند لمحات کے لیے روک کر اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے معصوم بچوں کو اٹھا لیا اور انھیں اپنے سامنے بٹھا لیا تو یہ کوئی غیر مستحسن بات نہ تھی۔

"میں نے بچوں کو گرتے پڑتے آتے دیکھا تو مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے اپنی بات کو قطع کر کے انھیں اٹھالیا۔" یہ بات آپ ﷺ نے کسر نفسی اور انکسار کی وجہ سے فرمائی۔ اس کے علاوہ اس میں حاضرین کے لیے اس بات کی تنبیہ بھی تھی کہ وہ اسے کوئی مستقل معمول نہ بنائیں۔ آپ ﷺ نے اس موقع پر قرآن کے جس فقرہ کی تلاوت فرمائی وہ سورۃ التغابن کی آیت ۱۵ کا ایک حصہ ہے۔

(۳) وَ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَؓ قَالَ: خَرَجْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فِیْ طَآئِفَةٍ مِّنَ النَّهَارِ حَتّٰی اَتٰی خِبَآءَ فَاطِمَةَؓ فَقَالَ: اَثَمَّ لُكَعُ اَثَمَّ لُكَعُ یَعْنِیْ حَسَنًا فَلَمْ یَلْبَثْ اَنْ جَآءَ یَسْعٰی حَتّٰی اعْتَنَقَ كُلُّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا صَاحِبَهٗ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اُحِبُّهٗ فَاَحِبَّهٗ وَ اَحِبَّ مَنْ یُّحِبُّهٗ. (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ میں دن کے ایک حصہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ باہر نکلا۔ جب آپؐ حضرت فاطمہؓ کے گھر پہنچے تو فرمانے لگے: "کیا یہاں منّا ہے؟ کیا یہاں منّا ہے؟" آپؐ کی مراد حسنؓ سے تھی (جن کو دیکھنے آپؐ وہاں پہنچے تھے۔) تھوڑی ہی دیر گزری ہوگی کہ حسنؓ دوڑتے ہوئے آگئے۔ دونوں ہی ایک دوسرے کے گلے سے لپٹ گئے۔ پھر آپؐ نے فرمایا: "اے اللہ، میں اس سے محبت رکھتا ہوں، تو بھی اس سے محبت رکھ اور اس شخص سے بھی محبت رکھ جو اس سے محبت رکھتا ہو۔"

تشریح: یہ حدیث بتاتی ہے کہ نبی ﷺ اپنے بچوں سے کس قدر محبت فرماتے تھے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بچوں کو گلے لگانا، انھیں گود میں لے لینا اور انھیں پیار کرنا اور خاص طور سے بچوں سے محبت کرنی دین میں پسندیدہ اور مستحسن عمل ہے۔ بچوں سے لطف و محبت سے پیش نہ آنا بدبختی کی علامت ہے۔ ایک مرتبہ جب ایک بدوی کے منھ سے نکلا کہ ہم تو بچوں کے بوسے نہیں لیا کرتے تو اس پر نبی ﷺ نے فرمایا: اَوَ اَمْلِکُ لَکَ اَنْ نَزَعَ اللّٰهُ مِنْ قَلْبِکَ الرَّحْمَةُ (بخاری، مسلم) "اللہ نے جب تیرے دل سے رحمت نکال لی تو میں کیا کرسکتا ہوں۔" ایک روایت میں آپ ﷺ کا یہ ارشاد نقل ہوا ہے: لَا تُنْزَعُ الرَّحْمَةُ اِلَّا مِنْ شَقِیٍّ (ترمذی) بدبخت ہی کے دل سے رحمت نکال لی جاتی ہے۔"

اس حدیث سے ان زاہدانِ خشک کے اس نظریہ کی تردید ہوتی ہے کہ اللہ والوں کو بیوی اور بچوں سے کوئی قلبی تعلق نہیں ہوتا۔ بل کہ حتی الامکان وہ ان سے دور ہی رہنا پسند کرتے ہیں۔ یہ درحقیقت زاہدانہ نہیں راہبانہ فکروعمل ہے جو اسلامی تعلیمات اور حضور ﷺ کے اسوہ کے سراسر مخالف ہے۔

ایک قابل ذکر بات اس حدیث سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ آپ ﷺ جس کسی سے محبت کرتے تو اس کی دنیوی واخروی زندگی کی بھلائی کے بھی آرزومند ہوجاتے تھے۔ اور آپ ﷺ کے اس جذبہ خاص کا اظہار مختلف انداز میں ہوتا تھا۔ چناں چہ اس حدیث میں ہم دیکھتے ہیں کہ آپ ﷺ نے اگر اپنے نواسے سے محبت کا اظہار فرمایا تو ان کے لیے آپ ﷺ کی زبان سے یہ دعاء بھی نکلی کہ خدایا، تو اسے محبوب رکھ۔'' دنیا وآخرت میں اس سے بڑھ کر کام یابی کی بات اور کیا ہوسکتی ہے۔

﴿۴﴾ وَ عَنْ اَنَسٍؓ قَالَ: اِنْ کَانَ النَّبِیُّ ﷺ لَیُخَالِطُنَا حَتّٰی یَقُوْلُ لِاَخٍ لِّیْ صَغِیْرٍ یَآ اَبَا عُمَیْرٍ مَا فَعَلَ النُّغَیْرُ؟ وَ کَانَ لَہٗ نُغَیْرٌ یَلْعَبُ بِہٖ فَمَاتَ۔ (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ ہم لوگوں سے نہایت گھل مل جایا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ میرے چھوٹے بھائی سے (مزاحاً) فرماتے: ''ابوعمیر! نغیر کیا ہوا؟'' اس کے (میرے بھائی کے) پاس ایک نغیر تھا جس سے وہ کھیلا کرتا تھا اور جو مر گیا۔

تشریح: ابوعمیر حضرت انسؓ کے اخیافی یعنی ماں شریک چھوٹے بھائی تھے۔ ان کے والد کا نام ابوطلحہ زید بن سہیلؓ انصاری تھا۔

نغیر دراصل نُغَرٌ کی تصغیر ہے۔ نغر ایک چھوٹے پرندے کا نام ہے جس کی چونچ سرخ ہوتی ہے۔ اسے غالباً ہمارے یہاں لال کہتے ہیں۔ حضرت انسؓ کے بھائی کبشہؓ اس پرندے کو لیے آں حضرت ﷺ کے پاس آئے تھے اور اس طرح چڑیا کے ساتھ وہ کھیلا کرتے تھے جیسا کہ بچوں کی عادت ہوا کرتی ہے۔ اچانک وہ پرندہ مر گیا۔ اس کے مرنے کے بعد جب کبھی وہ حضور ﷺ کے پاس حاضر ہوتے تو آپ ﷺ ازراہ مذاق انھیں چھیڑتے اور فرماتے: ابوعمیر! تمھارے نغیر کا کیا ہوا؟ لفظ کی مناسبت سے انھیں بہ جائے نام کے کنیت سے مخاطب فرماتے۔

〈۵〉 وَ عَنِ ابْنِ عُمَرؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: اِنَّ الْحَسَنَ وَالْحُسَيْنَ هُمَا رَيْحَانَيَّ مِنَ الدُّنْيَا۔ (بخاری، ترمذی)

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ''یقیناً حسنؓ اور حسینؓ میری دنیا کے دو پھول ہیں۔''

تشریح: لغت میں لفظ ''ریحان'' کے راحت، رحمت اور آسائش وغیرہ کئی معنی آئے ہیں۔ خوش بودار گھاس اور پھول کو بھی ریحان کہتے ہیں۔ بچوں کو ریحان اس لیے کہتے ہیں کہ ان سے دل کو راحت اور آنکھوں کو ٹھنڈک حاصل ہوتی ہے۔ پھول کی طرح بچوں کو بھی لوگ پیار سے سونگھتے اور چومتے ہیں۔

حضور ﷺ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ خدا دنیا میں لوگوں کو پھول جیسے بچوں سے نوازتا ہے جن سے انھیں راحت ملتی ہے۔ میری دنیا کے دو پھول یہ حسنؓ اور حسینؓ ہیں۔ اپنے ان نواسوں کو آپ ﷺ کس نگاہ سے دیکھتے تھے، اس کا بہ خوبی اندازہ اس حدیث سے کیا جاسکتا ہے۔

〈۶〉 وَ عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍؓ اَنَّهٗ مَرَّ عَلٰى صِبْيَانٍ فَسَلَّمَ عَلَيْهِمْ وَ قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَفْعَلُهٗ۔ (بخاری)

ترجمہ: حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے۔ وہ (حضرت انسؓ) کچھ بچوں کے پاس سے گزرے تو ان کو سلام کیا اور فرمایا کہ نبی ﷺ ایسا کرتے تھے (یعنی بچوں کو آپؐ سلام کرتے تھے)۔

معاملات میں

〈۱〉 عَنِ السَّآئِبِ قَالَ: اَتَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ فَجَعَلُوْا يُثْنُوْنَ عَلَيَّ وَ يَذْكُرُوْنِيْ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَنَا اَعْلَمُكُمْ يَعْنِيْ بِهٖ، قُلْتُ صَدَقْتَ بِاَبِيْ وَ اُمِّيْ، كُنْتَ شَرِيْكِيْ فَنِعْمَ الشَّرِيْكُ وَ كُنْتَ لَا تُدَارِيْ وَلَا تُمَارِيْ۔ (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت سائبؓ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، لوگ میرا ذکر کررہے تھے اور میری تعریف کررہے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میں اسے تم سب سے زیادہ جانتا ہوں۔'' میں نے عرض کیا کہ میرے ماں باپ کی قسم، آپؐ نے سچ

فرمایا۔ آپؐ میرے شریک تھے۔ پھر کیا ہی اچھے شریک تھے۔ نہ کبھی دھوکہ بازی سے کام لیتے تھے اور نہ جھگڑتے تھے۔‘‘

تشریح: حضرت سائبؓ زمانۂ جاہلیت میں آں حضرت ﷺ کے ساتھ شرکت میں کاروبار کرتے تھے۔ اسی لیے آپؐ نے فرمایا کہ میں سائب کو تم سب سے زیادہ جانتا ہوں۔

آپؐ کے بارے میں یہ ایک صحابیِ رسول ﷺ کی گواہی اور ان کا بیان ہے کہ میں نے آپؐ کو بہتر شریک پایا۔ عام طور پر جب دو آدمی کسی کاروبار میں شریک ہوتے ہیں تو ان کے درمیان بالعموم کوئی نہ کوئی شکایت پیدا ہو جاتی ہے اور نوبت لڑائی جھگڑے تک پہنچ جاتی ہے۔ لیکن نبی ﷺ اس طرح کے جھگڑوں سے ہمیشہ کنارہ کش رہتے تھے۔ یہ آپؐ کی اخلاقی بلندی کا ایک نمایاں ثبوت ہے۔

﴿۲﴾ وَ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَؓ قَالَ: اِسْتَقْرَضَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ سِنًّا فَاَعْطَاهُ سِنًّا فَوْقَهٗ وَ قَالَ: خِیَارُکُمْ مَحَاسِنُکُمْ قَضَآءً۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک اونٹ قرض لیا پھر اس سے بڑھ کر بہتر اونٹ اسے دیا اور فرمایا: ’’تم میں بہتر وہ لوگ ہیں جو بہتر طریقے سے قرض ادا کرتے ہیں۔‘‘

تشریح: آپ ﷺ کے اندر کم ظرف اور بخیل زر پرستوں کی خو بو بالکل ہی نہ تھی۔ معاملات میں آپ ﷺ فیاضی اور ایثار پسندی ہی کی روش اختیار فرماتے تھے۔ صحیح مسلم میں حضرت جابرؓ سے یہ روایت مروی ہے، وہ کہتے ہیں کہ ایک موقع پر آپ ﷺ نے مجھ سے پانچ اوقیہ میں ایک اونٹ خریدا۔ میں نے یہ شرط رکھی کہ مدینہ منورہ تک میں اس پر سواری کروں گا۔ آپ ﷺ نے میری یہ شرط منظور فرمالی۔ میں مدینہ پہنچنے کے بعد اونٹ لے کر آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپؐ نے ایک اوقیہ مزید عنایت فرمایا، اور یہ بھی فرمایا: یَا جَابِرُ، أَتَوَفَّیْتُ الثَّمَنَ؟ (اے جابرؓ، تم نے قیمت پالی؟) میں نے کہا، ہاں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ’’لَکَ الثَّمَنُ وَلَکَ الْجَمَلُ، لَکَ الثَّمَنُ وَلَکَ الْجَمَلُ‘‘ قیمت بھی لو اور اونٹ بھی لو۔ قیمت بھی لو اور اونٹ بھی لو۔‘‘ یہ تھا آپ ﷺ کی فیاضی اور ایثار پسندی کا حال۔

جانوروں کے ساتھ

﴿۱﴾ عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ عَبْدِ اللّٰہِ عَنْ اَبِیْہِ قَالَ: کُنَّا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم فِیْ سَفَرٍ، فَانْطَلَقَ لِحَاجَتِہٖ فَرَأَیْنَا حُمَّرَۃً مَّعَھَا فَرْخَانِ، فَاَخَذْنَا فَرْخَیْھَا فَجَآءَ تِ الْحُمَّرَۃُ فَجَعَلَتْ تُفَرِّشُ، فَجَآءَ النَّبِیُّ صلی اللہ علیہ وسلم فَقَالَ: مَنْ فَجَّعَ ھٰذِہٖ بِوَلَدِھَا؟ رُدُّوْا وَلَدَھَا اِلَیْھَا۔ وَرَأٰی قَرْیَۃَ نَمْلٍ قَدْ حَرَّقْنَاھَا قَالَ: مَنْ حَرَّقَ ھٰذِہٖ؟ فَقُلْنَا: نَحْنُ۔ قَالَ: اِنَّہٗ لَا یَنْبَغِیْ اَنْ یُّعَذِّبَ بِالنَّارِ اِلَّا رَبُّ النَّارِ۔ (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت عبدالرحمٰن بن عبداللہؓ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے کہا کہ ایک مرتبہ ہم لوگ سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم راہ تھے۔ ایک موقعہ پر جب آپؐ قضائے حاجت کے لیے تشریف لے گئے تو ہم نے ایک حمرہ کو دیکھا جس کے ساتھ دو بچے بھی تھے۔ ہم نے اس کے دونوں بچوں کو پکڑ لیا۔ پھر حمرہ آئی اور اپنے پروں کو زمین پر بچھانے اور زمین سے لگنے لگی۔ اتنے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے اور فرمایا: ’’کس نے اس کے بچوں کو پکڑ کر اسے مضطرب کر رکھا ہے؟ اس کے بچوں کو اسے واپس کر دو۔‘‘ پھر آپؐ نے چیونٹیوں کے رہنے کی جگہ دیکھی جس کو ہم نے جلا ڈالا تھا۔ فرمایا: ’’کس نے ان چیونٹیوں کو جلایا ہے؟‘‘ ہم نے عرض کیا کہ ہم نے جلایا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ’’خدا کے سوا جو آگ کا بھی مالک ہے، کسی کے شایان نہیں کہ وہ آگ کا عذاب دے۔‘‘

تشریح: حمرہ ایک چھوٹے پرند کا نام ہے جس کا رنگ سرخ ہوتا ہے۔ دونوں بچوں کے چھن جانے پر حمرہ حد درجہ بے چین اور مضطرب ہو گئی۔ گویا وہ اپنے بچوں کی گرفتاری پر سراپا احتجاج بن گئی ہے۔ آپؐ نے بچوں کو چھوڑ دینے کا حکم دیا۔

’’خدا کے سوا کسی کے شایان نہیں کہ وہ آگ کا عذاب دے۔‘‘ آپؐ کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ یعنی کسی بھی شخص کے لیے یہ روا نہیں ہے کہ وہ کسی کو آگ میں جلائے۔ ایسا سخت عذاب دینے کا حق صرف خدا کو پہنچتا ہے جس نے آگ پیدا کی ہے اور یقیناً وہ آخرت میں یہ عذاب ان مجرموں کو دے گا جو شدید ترین جرم کے مرتکب ہوں گے اور جرم کی شدت ہی اس بات کی متقاضی ہوگی کہ انھیں یہ سخت ترین عذاب دیا جائے۔

﴿۲﴾ وَ عَنْ عَامِرٍ الرَّامِؓ قَالَ: بَيْنَا نَحْنُ عِنْدَهٗ يَعْنِيْ عِنْدَ النَّبِيِّ ﷺ اِذْ اَقْبَلَ رَجُلٌ عَلَيْهِ كِسَآءٌ وَ فِيْ يَدِهٖ شَيْءٌ قَدِ الْتَفَّ عَلَيْهِ. فَقَالَ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، مَرَرْتُ بِغَيْضَةِ شَجَرٍ فَسَمِعْتُ فِيْهَا اَصْوَاتَ فِرَاخِ طَآئِرٍ فَاَخَذْتُهُنَّ فَوَضَعْتُهُنَّ فِيْ كِسَآئِيْ. فَجَآءَتْ اُمُّهُنَّ فَاسْتَدَارَتْ عَلٰى رَأْسِيْ فَكَشَفْتُ لَهَا عَنْهُنَّ فَوَقَعَتْ عَلَيْهِنَّ فَلَفَفْتُهُنَّ بِكِسَآئِيْ فَهُنَّ اُولَآءِ مَعِيْ، قَالَ: ضَعْهُنَّ فَوَضَعْتُهُنَّ وَ اَبَتْ اُمُّهُنَّ اِلَّا لُزُوْمَهُنَّ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَتَعْجَبُوْنَ لِرُحْمِ اُمِّ الْاَفْرَاخِ فِرَاخَهَا؟ فَوَ الَّذِيْ بَعَثَنِيْ بِالْحَقِّ، اَللّٰهُ اَرْحَمُ بِعِبَادِهٖ مِنْ اُمِّ الْاَفْرَاخِ بِفِرَاخِهَا اِرْجِعْ بِهِنَّ حَتّٰى تَضَعَهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَخَذْتُهُنَّ وَ اُمُّهُنَّ مَعَهُنَّ فَرَاجَعَ بِهِنَّ۔ (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت عامرؓ تیر انداز کہتے ہیں کہ ایک دفعہ جب کہ ہم آپؐ کے پاس یعنی نبی ﷺ کے پاس حاضر تھے کہ ایک شخص آیا جو چادر اوڑھے ہوئے تھا۔ اور اس کے ہاتھ میں کوئی چیز تھی جسے چھپا رکھا تھا، اس نے کہا یا رسول اللہؐ، میں درختوں کے ایک جھنڈ کے قریب سے گزرا تو مجھے وہاں پرندوں کے بچوں کی آوازیں سنائی دیں۔ میں نے ان کو پکڑ لیا اور ان کو اپنی چادر میں رکھ لیا۔ اتنے میں ان کی ماں آ گئی اور میرے سر پر چکر لگانے لگی۔ میں نے اس کو دکھانے کی غرض سے (چادر ہٹا دی اور) ان بچوں کو کھول دیا۔ وہ ان پر آ پڑی۔ میں نے ان سب کو اپنی چادر میں لپیٹ لیا۔ اب وہ میرے پاس ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: ''ان کو یہاں رکھو۔'' میں نے انھیں وہاں رکھ دیا (اور چادر ہٹا دی) مگر ان کی ماں ان سے لپٹی ہی رہی۔ یہ دیکھ کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کیا تمھیں پرندوں کے ان بچوں کے ساتھ ان کی ماں کی مامتا اور رحم کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے؟ قسم ہے اس ذات کی جس نے مجھے حق کے ساتھ بھیجا ہے، اللہ اپنے بندوں پر اس سے کہیں زیادہ مہربان ہے جتنا پرندہ کے بچوں کی ماں اپنے بچوں پر مہربان ہے۔ تم ان بچوں کو لے جاؤ اور جہاں سے تم نے ان کو پکڑا ہے وہیں رکھ دو اور ان کی ماں کو ان کے ساتھ چھوڑ آؤ۔'' چناں چہ وہ شخص ان سب کو واپس لے گیا۔

تشریح: معلوم ہوا کہ آں حضرت ﷺ کی رحمت صرف انسانوں ہی تک محدود نہ تھی بل کہ پرندوں اور جانوروں تک کے ساتھ آپ ﷺ کا سلوک انتہائی دردمندی اور ترحم کا تھا۔

آپؐ کی ایک آرزو

﴿۱﴾ عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَا يُبَلِّغُنِيْ اَحَدٌ مِّنْ اَصْحَابِيْ عَنْ اَحَدٍ شَيْئًا فَاِنِّيْ اُحِبُّ اَنْ اَخْرُجَ اِلَيْكُمْ وَ اَنَا سَلِيْمُ الصَّدْرِ۔ (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”میرے صحابہؓ میں سے کوئی شخص کسی کے بارے میں مجھ تک کوئی (ایسی) بات نہ پہنچائے (جس سے اس کی برائی ظاہر ہوتی ہو) اس لیے کہ میں یہ پسند کرتا ہوں کہ جب میں گھر سے نکل کر تمھارے پاس آؤں تو میرا سینہ صاف ہو۔“

تشریح: یعنی کسی کے بارے میں میرے دل میں کوئی کدورت یا نفرت نہ ہو اور نہ کوئی میری نظر سے گرے اور نہ میں کسی سے ناراض و ناخوش ہوں۔

علمائے حدیث نے لکھا ہے کہ اس حدیث میں آں حضرت ﷺ نے اپنی اس آرزو کا اظہار فرمایا ہے کہ آپ ﷺ دنیا سے اس حال میں رخصت ہوں کہ آپ ﷺ اپنے صحابہؓ سے راضی اور خوش ہوں۔ کتنی پاک خواہش تھی آپ ﷺ کی!! پاک دل میں پاک خواہش اور بہترین قسم کے جذبات کے سوا اور ہو بھی کیا سکتا تھا۔!

اَللّٰھُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ عَلٰی عَبْدِکَ وَ رَسُوْلِکَ

صَلٰوۃً دَآئِمًا اَبَدًا اَبَدًاؕ